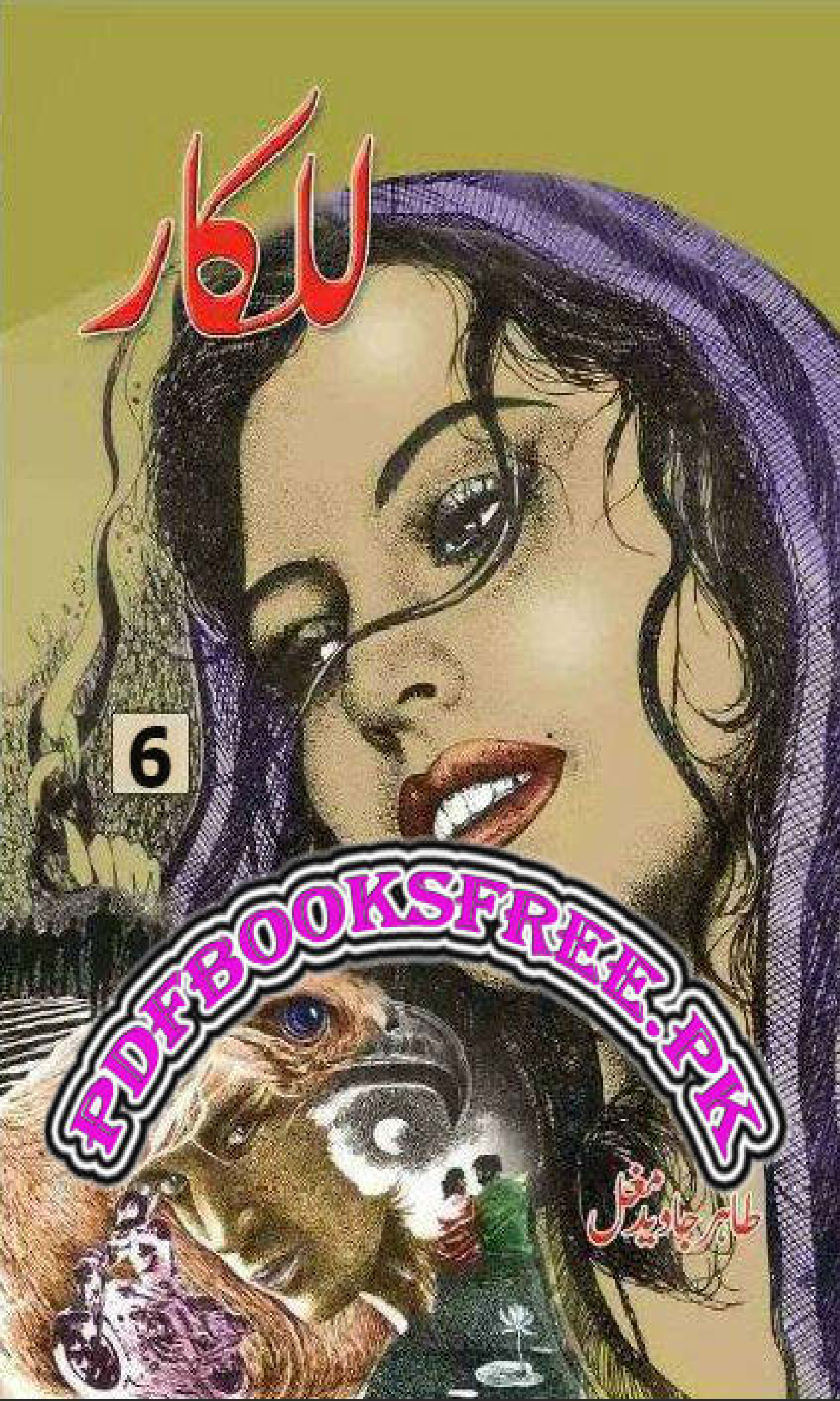


للکار
6
PDFBOOKSFREE.PK
مصنف
طاہر جاوید مغل

ہم اسی ترتیب کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ہم مختلف ..لوں پر سفر کرتے ہوئے شاہ جمال کے علاقے کی طرف نکل آئے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی آ تانہ نما جگہ ہوگی لیکن یہ تو ایک اچھی خاصی رہائشی کوٹھی تھی۔ ہم لان میں داخل ہوئے اور ..نوں موٹر سائیکلیں بند کردیں۔ عمران کی جیکٹ میں بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ یہاں ہمیں کسی طر ن کے حالات بھی پیش آ سکتے تھے۔ ہمیں ایک ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ یہاں الماریوں میں بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

زیادہ تر مذہبی علوم کے بارے میں تھیں۔ کچھ تاریخی نوعیت کی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ .. سا .ب آرام فرما رہے تھے۔ انہیں جگا دیا گیا ہے۔ وہ ابھی دو چار منٹ میں تشریف لے آ تے ہیں۔ اور پھر پیر صاحب جلوہ افروز ہوئے۔ پیروں، فقیروں اور عاملوں وغیرہ کے ..ا لے سے میرے ذہن میں جو بھی تصورات تھے، وہ ان سے مختلف نکلے۔ ان کا رنگ سرخ و .ا .. تھا۔ انہوں نے ایک لمبا سفید چغا پہن رکھا تھا۔ داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے .. م .. پچاس کے قریب تھی۔

ا .. وں نے نرم الفاظ میں ہم سے بات چیت کی اور حال احوال پوچھا۔ عمران سے .. ا .. .. بولے۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی بیٹا۔ مجھے کافی عرصے سے تمہارا انتظار .. ا .. اوی روڈ والا مکان خالی پڑا تھا۔ کسی کو بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ .. .. وہاں سے بھی کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہ جمیل تمہارے ہی محلے میں رہتا .. ا .. ہوئی لگا رکھی تھی کہ جب بھی تمہارے بارے میں کچھ پتا چلے یہ مجھے

.. اں .. .. ا .. تھانوی کی شخصیت سے قدرے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے کہا

"مجھے بتائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

تھانوی صاحب کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ "میں تم سے معافی چاہتا ہوں بیٹے لیکن میں وقت سے پہلے تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"......اور وقت کب آئے گا؟" عمران نے پوچھا۔

"بہت جلدی۔ شاید دو چار دنوں میں۔" تھانوی صاحب نے کھڑکی سے باہر آسمان کو تکتے ہوئے کہا جو شام کے جھٹپٹے میں اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔

"آپ نے تجسس میں ڈال دیا ہے۔" عمران نے کہا۔

انہوں نے عمران کے شانے کو چھوا اور بولے۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ ایک مریض ہے جس کے علاج کے لئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں ان شاء اللہ تمہارا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔ بس ایک آدھ گھنٹے کی بات ہوگی۔"

"کیا اس مریض سے میرا کوئی تعلق ہے؟"

"ہاں، پرانا تعلق بھی ہے...... لیکن بیٹے، تم خود کو پریشان نہ کرو بس چند دن میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔ اور یہ کوئی مجبوری کی بات بھی نہیں ہے۔ اگر تم چاہو گے تو مدد کرنا ورنہ منع کر دینا۔ مجھے ذرا سی بھی شکایت نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "حضرت! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ مدد کس طرح کی ہوگی؟"

"میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ وقت سے پہلے بتانا مناسب نہیں۔ اگر کوئی عذر نہ ہو تو آپ مجھے اپنا رابطہ نمبر دے دیں۔ جیسے ہی موقع آیا، میں آپ کو بتا دوں گا۔ باقی مجھے پتا چلا ہے کہ جمیل اور اس کے ساتھی نے آپ کا پیچھا کیا تھا۔ اس کی وجہ سے آپ دونوں کو جو پریشانی ہوئی، اس کے لئے میں شرمندہ ہوں۔ انہیں یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں جی۔" عمران نے کہا۔ "اگر ہمارے دل میں کچھ تردد تھا بھی تو آپ کی بات چیت سے دور ہو گیا ہے۔"

ہم تقریباً آدھ گھنٹا پیر صاحب کے ساتھ رہے۔ وہ بہت مختلف نظر آئے۔ لیکن ایک بات تھی، وہ بہت سی چیزیں پردۂ اخفا میں رکھ رہے تھے۔ عمران نے انہیں تھوڑا بہت کریدا لیکن زیادہ اصرار نہیں کیا۔ انہوں نے ہمیں پُرتکلف چائے پلائی۔ کھانے کے لئے بھی اصرار کیا لیکن ہم چلے آئے۔ ویسے بھی ان کے مریدوں اور مریضوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

ہماری واپسی موٹر سائیکل پر ہی ہوئی...... پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ عمران کی

انی روداد والا کوئی معاملہ ہے۔ اس وقت جب وہ عمران کے بجائے عمو تھا...... گاؤں کے با... پیر جی نے اپنے اکلوتے بچے پر سے ایک آفت ٹالنے کے لئے عمو کو قربانی کا بکرا بنایا ... اس کی روتی بلکتی بیوہ ماں سے جدا کیا گیا اور پھر ایک بدقماش عامل کے حوالے کر دیا ... اس موڑ پر سے عمو کی زندگی کے راستے بدلتے چلے گئے اور وہ وہاں سے کہاں پہنچ گیا!

"کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟" میں نے موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے بیٹھے عمران کے کان میں پوچھا۔

"میرا اندازہ تو یہی ہے کہ امریکا کو عراق سے نکلنا ہی پڑے گا۔"

"میں پیر صاحب کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے سٹپٹا کر کہا۔

"پیر صاحب تو گوشہ نشین سے بندے ہیں یار! ان کا امریکا کی خارجہ پالیسی سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"بھاڑ میں جاؤ۔" میں نے کہا۔

یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی گولی چلی۔ یہ رائفل کی گولی تھی اور سڑک کے کنارے کھڑی ایک ایف ایکس کار کے اندر سے ہم پر چلائی گئی تھی۔ یہ گولی موٹر سائیکل کے فریم میں لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ دوسری گولی ہمارے ہیلمٹس کو چھوتی ہوئی گزری۔ عمران نے بریک لگائے۔ موٹر سائیکل لہراتی اور سلپ کرتی ہوئی ایک بس اسٹاپ کے شیڈ کے پیچھے چلی گئی۔ ارد گرد ٹریفک موجود تھا، کچھ لوگوں کو تو اس فائرنگ کا پتا ہی نہیں چلا مگر جن کو چلا، ان میں ہلچل محسوس ہوئی...... میں نے صاف دیکھا، ایف ایکس میں صرف ایک بندہ موجود تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ موٹر سائیکل زد سے نکل گئی ہے تو اس نے پوری رفتار سے گاڑی بھگا دی۔ عمران نے گری ہوئی موٹر سائیکل کو اٹھایا۔ ہم پھرتی سے اس پر بیٹھے اور تیز رفتاری سے کریم کلر ایف ایکس کے پیچھے لپکے۔

......اگلے دو منٹ میں ہم نے ایک بھری پُری سڑک پر ایف ایکس کا تیز رفتار تعاقب کیا۔ ہمیں تسلی تھی کہ گاڑی میں صرف ایک بندہ ہے۔ وہ چلتی گاڑی سے ہم پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک ایف ایکس نے ایک رکشا کو ٹکر ماری اور پھر ایک الیکٹرک پول سے جا ٹکرائی۔ اس کے بونٹ سے سیاہ دھواں نکلنے لگا۔ جب تک ہم گاڑی تک پہنچے، گاڑی سوار باہر نکل کر دوڑ لگا چکا تھا۔ وہ اکہرے بدن کا شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر ڈبی دار کوٹ پہن رکھا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ چھوٹی نال کی رائفل اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم خواتین و حضرات سے

ٹکراتے، خوانچوں کو الٹتے، سائیکل سواروں کو گراتے اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے......

بازار کے پیچھے ایک قدرے سنسان گلی میں ہم نے اسے جا لیا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس شخص کے کوٹ کا کالر پیچھے سے پکڑا اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیا۔ حیرت تھی کہ اب تک اس نے رائفل استعمال نہیں کی تھی۔ اس بات کا پتا بعد میں چلا کہ اس کی رائفل میں بس دو ہی گولیاں تھیں جو وہ ہم پر چلا چکا تھا۔

میں نے دو تین زوردار ہاتھ اس کے چہرے پر رسید کئے۔ وہ اپنا ہاتھ قمیص کے نیچے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے تاڑ لیا کہ قمیص کے نیچے کوئی ہتھیار وغیرہ موجود ہے۔ اس نے اس کی کلائی جکڑ کر اتنی زور سے مروڑی کہ وہ چلا اٹھا۔ عمران نے اس کی قمیص کے نیچے ہاتھ چلایا اور چمڑے کی بیلٹ میں لگا ہوا ایک تیز دھار چاقو نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

کئی لوگ تیزی سے ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کیا ہے؟ کون ہے؟ کیسے ہے؟ ایسے بہت سے سوال فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

عمران نے مبہم سا جواب دیا۔ ''یہ پولیس کا معاملہ ہے۔ آپ اس میں دخل نہ دیں۔ اس نے گولی چلائی ہے۔ قاتلانہ حملہ کیا ہے۔''

عمران کے بارعب انداز نے لوگوں کو شک میں ڈال دیا کہ ہم شاید پولیس کے سادہ پوش یا کسی خفیہ ایجنسی کے لوگ ہیں۔

عمران کے اشارے پر میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی اسکول وین کو روکا۔ عمران نے وین ڈرائیور سے کہا۔ ''اس بندے کو تھانے لے جانا ہے۔'' اور ڈرائیور کے جواب دینے سے پہلے ہی حملہ آور کی گردن پر دو ہتڑ مار کر اسے وین میں پھینک دیا۔ اس کے منہ سے اب باقاعدہ خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی بائیں کلائی کو دائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ رائفل اور چاقو دونوں چیزیں اس سے چھینی جا چکی تھیں۔

اس نے اضطراری طور پر وین سے نکلنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک اور زوردار گھونسے نے اسے نڈھال کر رکھ دیا۔ ''چپکا بیٹھا رہ۔ نہیں تو اس سڑک کو ہی تھانے کا ڈرائنگ روم بنا دوں گا۔ ...... ہڈیوں کا چورا کر دوں گا۔'' عمران پھنکارا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تابی! تم موٹر سائیکل پر پیچھے پیچھے آؤ۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

عمران نے بھنگوڑے حملہ آور کے چیک دار کوٹ کا خون آلود کالر پکڑا اور اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے واپس دوڑ لگائی۔ کھمبے سے ٹکرا جانے والی ایف ایکس گاڑی میں

سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ کئی افراد اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ ہماری چرخہ موٹر سائیکل بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سیدھی کی تو لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ ایک ٹریفک سارجنٹ بھی نپے تلے قدموں سے آگے بڑھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ایکسیڈنٹ کے بعد میں بغیر کچھ کہے سنے موٹر سائیکل لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن پھر سارجنٹ کا چہرہ دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی۔ یہ وہی نواز احمد نامی نوجوان تھا جس سے راوی روڈ پر چند گھنٹے پہلے بھی دوستانہ ملاقات ہو چکی تھی۔ میرے سر پر ابھی تک ہیلمٹ موجود تھا لیکن چرخہ موٹر سائیکل کو نواز نے فوراً پہچان لیا۔

اسی دوران میں وہ اسکول وین بھی موقع پر پہنچ گئی جس میں عمران نے زخمی آور کو بٹھا رکھا تھا۔ سارجنٹ نواز نے عمران کو پہچان کر کہا۔ ''یہ کیا ہوا ہے عمران بھائی؟''

''لمبا لفڑا ہو گیا ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اس نے پیچھے اچھرہ موڑ کے قریب گولی چلائی ہے ہم پر...... بلکہ دو گولیاں...... تھانے لے جا رہے ہیں اسے۔''

سارجنٹ نواز نے ہمارے اردگرد لوگوں کی بھیڑ ہٹا کر ہمارے لئے راستہ بنایا اور ہم آگے پیچھے مزنگ چونگی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ عجلت میں ہوا۔ یہ خطرہ موجود تھا کہ ابھی کوئی پولیس موبائل یہاں پہنچ جائے گی اور نیا بکھیڑا شروع ہو جائے گا۔ مجھے ہرگز نہیں لگتا تھا کہ عمران اس زخمی شخص کو تھانے لے کر جائے گا۔ اسکول وین درمیانی رفتار سے چل رہی تھی، میں اس کے پیچھے پیچھے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ اونٹ کی طرح اس موٹر سائیکل کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں تھی۔ میں نے عمران کے سامنے دو تین بار اس موٹر سائیکل کو شاہجہانی جوتھ کا نام دیا تھا لیکن اب، جب میں اس پر سواری کر رہا تھا، یہ نام بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں لگا۔ اس پر سواری کرتے ہوئے سیدھی سڑک پر توازن برقرار رکھنا مشکل تھا۔ پتا نہیں عمران اسے موت کے کنوئیں میں کیسے چلا لیتا تھا۔ موٹر سائیکل پر کنٹرول رکھنے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن تیزی سے سوچ بھی رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا، بالکل آناً فاناً اور ڈرامائی تھا۔ ہم تو پیر شوکت احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لئے آئے تھے اور تھانوی صاحب ہمیں کافی مناسب شخص لگے تھے۔ مگر ان کی چار دیواری سے رخصت ہونے کے فوراً بعد ہی ہم پر دو ''قاتل فائر'' کئے گئے تھے۔

قریباً دو کلومیٹر آگے جا کر عمران نے اسکول وین جین مندر کے قریب ایک بغلی سڑک پر ڈالی۔ عمران کے اشارے پر میں بھی موٹر سائیکل سے اتر کر وین میں چلا گیا۔ عمران نے حملہ آور کے سر کے بال بیدردی سے مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ حملہ آور کے چوڑے تھوبڑے پر دو

تین تازہ نیل بھی نظر آ رہے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے راستے میں بھی عمران سے زور آزمائی کی کوشش کی ہے۔ بہر حال، اب وہ مزید مار کھانے کے بعد بالکل شانت نظر آتا تھا۔

عمران نے مجھ سے پوچھا۔ ''کہاں لے جانا ہے اسے؟ میرے خیال میں گھر تو لے جا نہیں سکتے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گھر میں فرح اور عاطف تھے اور فرح تو پچھلے چند دن سے مسلسل دہائی دے رہی تھی کہ ہم کسی خطرناک کام میں ہاتھ نہ ڈالیں۔ اگر ہم اس زخمی مچھندر کو رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں لے جاتے تو فرح اور عاطف کو بہت شاک لگتا۔

''تمہارے روای روڈ والے گھر میں جا سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں پورے محلے کو پتا چل جائے گا۔''

''تو پھر؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''جیلانی بھی لاہور میں نہیں ہے...... ہاں، ایک کام ہو سکتا ہے۔'' اس کے چہرے پر تھوڑی سی چمک آئی۔

''کیا ہو سکتا ہے؟''

''چلو بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا پھر وین والے سے کہا کہ وہ گاڑی چلائے۔ وین والا اب کچھ ہراساں بھی نظر آ رہا تھا۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ ہم اس شخص کو تھانے لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے عمران سے معذرت کی ہو کہ وہ یہ ''خدمت'' انجام نہیں دے سکتا لیکن وہ عمران ہی کیا جو ایسی کسی معذرت کو خاطر میں لائے۔

میں وین سے اترا اور ایک بار پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے عمران اور حملہ آور کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اسکول وین ایک رہائشی کالونی میں رکی۔ یہاں زیادہ تر گھر پانچ اور چھ سات مرلے کے تھے۔ ایک دو منزلہ گھر کے سامنے جا کر عمران نے وین رکوا دی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وین کے رکتے ہی گھر کا مین گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ایک دبلا پتلا نوجوان لڑکا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اس گھر کے مکینوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ دبلے پتلے نوجوان نے وین کو گیراج میں جانے کے لئے راستہ دیا اور پھر مین گیٹ بند کر دیا۔ عمران نے سو سو کے چھ سات نوٹ وین ڈرائیور کو دیئے اور حملہ آور کو گردن سے دبوچے نیچے اتر آیا۔ اب عمران کے ہاتھ میں پستول بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل گیراج میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ موٹر سائیکل کے رکتے ہی جیسے

ایک طوفان تھم گیا تھا۔

وین کا ڈرائیور اپنی وین سمیت یوں بھاگا جیسے تھوڑی دیر بھی یہاں رکا تو یہ مکان اپنی وزنی چھتوں سمیت اس کے اوپر آن گرے گا۔ یقیناً عمران نے راستے میں اس کی کافی برین واشنگ کی تھی اور اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں کسی طرح کی مخبری کرتا۔

ہم نے اندر جا کر حملہ آور کو ایک اسٹور نما تاریک کمرے میں بند کر دیا اور یہی وقت تھا جب ایک طرف سے عمران کی سرکس کی ساتھی شاہین تیزی سے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی نمی تھی۔ شاید وہ آگے بڑھ کر عمران کے گلے ہی لگ جاتی مگر نوجوان لڑکے کی وجہ سے نہیں لگی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ شاہین کا چھوٹا بھائی ظفر تھا۔

''مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا کہ تم اس طرح اچانک آ گئے ہو۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

''اور اکیلا نہیں ہوں۔ کسی کو ساتھ بھی لایا ہوں۔'' عمران نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے ہیلمٹ اتارا۔ ''اوہ گاڈ! تابش بھائی آپ؟'' وہ پکاری اور بھاگ کر میرے گلے لگ گئی۔

عمران نے برا سا منہ بنایا۔ ظفر اندر جا چکا تھا۔ عمران، شاہین کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولا۔ ''اگر گلے لگنے کے لئے چار سال باہر رہنا ضروری ہے تو میں ڈھائی تین سال اور گزار آتا ہوں۔''

شاہین کے ملیح چہرے پر شفق کا رنگ بکھر گیا۔ وہ کبھی حیرت سے عمران کو اور کبھی مجھے [illegible] رہی تھی۔ پچھلے ساڑھے تین چار سال میں، میں جسمانی طور پر کافی تبدیل ہوا تھا۔ یہ تبدیلیاں شاہین کو حیران کر رہی تھیں۔ ''آپ بہت بدل گئے ہو تابش بھائی۔ میں نے پہلے تو آپ کو پہچانا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو پہلے ایک لڑکا تھا، وہ مرد بن کر واپس آیا ہے۔ آپ کہاں تھے اب تک؟ پتا ہے ہم نے کتنا یاد کیا ہے آپ کو؟ پتا ہے کتنا پریشان ہوئے ہیں؟ میں [illegible] دعائیں کی تھیں۔ آپ کے لئے۔''

''[illegible] بھئی، میں تو چلتا ہوں۔ یہاں میرا کیا کام ہے؟'' عمران جلے بھنے انداز میں [illegible]

''تمہارے لئے بھی کی تھیں۔'' شاہین جلدی سے بولی۔ ''تمہارے لئے بھی سب [illegible] ہیں۔ میں تقریباً روزانہ جان انکل کو فون کرتی تھی۔ تمہیں کیا پتا......'' اس کی

آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"لو بھئی رونڈو پروگرام شروع ہونے لگا ہے۔ اچھا یار! نہیں جاتا، بالکل نہیں جاتا۔ اگلے پندرہ بیس سال تک یہیں رہوں گا بلکہ یہیں اس گیراج میں کھڑا رہوں گا۔ ہلوں گا بھی نہیں۔" عمران نے کہا اور شاہین کے آنسوؤں کو مدھم مسکراہٹ کے بریک لگ گئے۔

اسی دوران میں ظفر واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "عمران بھائی! آپ کب آئے؟ آپ نے تو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ فون پر آپ کی آواز ہے۔"

عمران بولا۔ "اس طرح نہیں کہتے کہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ مجھے تو وشواس ہی ناہیں ہووت تھا کہ میں فون پر آپ کی آواج سنت ہوں...... جب حیرانی والے فقرے میں یقین کے بجائے وشواس کا شبد استعمال کیا جائے تو فقرے میں بڑی شکتی آ جاوت ہے۔"

وہ دونوں مسکرانے لگے۔ شاہین بولی۔ "چلو، اس سے کم از کم اتنا پتا تو چلا کہ تم انڈیا سے ہی آ رہے ہو لیکن......" پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کا دھیان یقیناً اس بندے کی طرف چلا گیا تھا جسے ہم پکڑ کر یہاں لائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس بھی ہوا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ "یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں، اندر آ جائیں۔"

ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاہین اور ظفر کے سوا اس چھوٹے سے گھر میں کوئی نہیں۔ اب اسٹور روم کے مقفل دروازے پر دستک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یقیناً زخمی شخص بے چین ہو رہا تھا...... عمران نے شاہین سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس بندے سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا۔ اس دوران میں تم کچھ پکا وکا سکتی ہو۔ زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ دو تین ڈشیں کافی رہیں گی۔ میٹھے کے طور پر آئس کریم منگوا لینا۔ پھل ول تو ہوتا ہی ہے تمہارے فریج میں۔"

شاہین بولی۔ "ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہ زیادہ بڑا گھر نہیں ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری پوچھ گچھ کے دوران میں محلے والوں کو شک ہو جائے۔ ایک بار پہلے بھی تمہاری مہربانی کی وجہ سے مجھے ایک اچھے مالک مکان سے محروم ہونا پڑا تھا۔"

"گھبراؤ مت۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ بس تم کچن میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لو۔ زور کس پر ہوا؟ کچن پر۔"

شاہین نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں گھر کے عقبی حصے کی طرف چلے گئے میں اور عمران اسٹور روم کی طرف بڑھے۔ عمران نے اپنا پستول ایک بار پھر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسٹور روم کے اندر اب ہمارے "حوالاتی" نے چلانا شروع کر دیا

تھا۔ "دروازہ کھولو۔ میں مر رہا ہوں۔ دروازہ کھولو۔" اس کی آواز میں کرب کی شدت صاف محسوس ہوتی تھی۔ بہر حال، اس کی آواز گھر کے برآمدے تک بمشکل ہی پہنچ رہی تھی۔

ہم اسٹور روم میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی کلائی دوسرے ہاتھ سے تھامے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ اس کا رنگ زرد نظر آ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کلائی میں کوئی فریکچر وغیرہ ہو چکا ہے۔ عمران نے جاتے ہی اس کے سر پر چپت رسید کی۔ "اوئے! تم تو کہتے ہو، میں مر رہا ہوں۔ کیا اس طرح کھڑے کھڑے کوئی مرتا ہے؟ مرنے کے لئے لیٹنا پڑتا ہے۔ کھینچ کھینچ کر سانس لینی ہوتی ہے۔ آنکھیں اوپر اٹھانا پڑتی ہیں۔ اس طرح سے۔" عمران نے باقاعدہ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھا کر دکھائیں۔

"میری کلائی ٹوٹ گئی ہے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔" وہ کراہا۔

"اپنی کلائی کی تمہیں بڑی فکر ہے۔ اگر ہمارے سر میں گولی لگتی تو ہمیں درد نہیں ہونا تھا؟ سر میں گولی لگے تو چلا چلا کر گلا بیٹھ جاتا ہے اور یہ گلا اس کا نہیں بیٹھتا جسے گولی لگی ہو بلکہ اس کے گھر والوں کا بیٹھتا ہے...... ذرا دکھاؤ اپنی کلائی۔" عمران نے کہا۔

اس نے اپنی کلائی عمران کی طرف بڑھائی۔ اس نے ذرا دبا کر دیکھا۔ زخمی ایک بار پھر کراہ اٹھا۔ عمران مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ یہاں اسے الٹا لٹکانے کے لئے چھت پر کوئی کنڈا وغیرہ بھی نہیں ہے۔ یہ اپنی اس کلائی کی وجہ سے ہی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔"

اس شخص کا رنگ کچھ مزید زرد ہو گیا۔ وہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا۔ اس کی شکل وصورت گواہ تھی کہ وہ متعدد بار جیل جا چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شکرے کی سی سفاک چمک تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی قتل جیسی وارداتیں کر چکا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود کو بری طرح گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ عمران نے مجھے بتایا کہ اسکول وین میں اس نے خود کو چھڑانے اور چلتی گاڑی سے کودنے کی ایک زوردار کوشش کی تھی مگر عمران کے سامنے اس کا بس نہیں چلا۔ عمران نے وین میں ہی بُری طرح اس کی دھنائی کر دی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ میں اس شخص نے ہمیں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اس کا نام ...ید عرف چھیدا ہے۔ وہ ہسٹری شیٹر ہے اور پیسے لے کر کام کرتا ہے۔ اس کام کے لئے اسے بہاولپور کے کسی بندے نے ایک واقف کار کے ذریعے ایک لاکھ کی رقم بھجوائی تھی۔ باقی ...۰۰ لاکھ روپیا اسے کام ہونے کے بعد ملنا تھا۔ کام ہمیں قتل کرنا ہرگز نہیں تھا...... بلکہ ڈرانا یا زخمی ...نا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

اس خبیث کی شکل ہی بتا رہی تھی کہ وہ بک رہا ہے۔ اس کی باتوں میں سچ اتنا ہی ہے، جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیوں اس بندے کی شکل مجھے کچھ شناسا سی لگ رہی تھی۔ پھر ایک اور چیز سامنے آئی اور اس نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا۔

اسکول وین میں عمران کے ساتھ زوردار کھینچا تانی کے دوران میں چھیدے کے کوٹ کی ایک آستین کہنی تک ادھڑ گئی تھی۔ یہ آستین ذرا سی اوپر ہوئی تو مجھے چھیدے کے بازو پر کٹ کا ایک لمبا نشان نظر آیا۔ یہ تیز دھار آلے کا ایک قوس نما پرانا زخم تھا، ٹانکے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ماضی میں یہاں سے گولی وغیرہ نکالنے کے لئے کوئی آپریشن کیا گیا ہو۔ بہرحال، یہ سب کچھ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی۔ چار سال پہلے کے مناظر میری نگاہوں کے سامنے شعلوں کی طرح پھیل گئے۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہ بندہ ان سفاک غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے ماں جی کو درد کے سمندر میں غرق کر کے مجھ سے فرح اور عاطف کا پتا پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ فلیش بیک میں وہ سین...... وہ خونی سین آنکھوں کے سامنے چلنے لگے۔

ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے کندھوں کو بے رحمی سے جھنجوڑا جا رہا تھا۔ وہ چلا رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔ پھر ان کے ایک کندھے میں بریٹا پسٹل کی گولی اتار دی گئی تھی۔ جن افراد نے ماں جی کو دبوچا ہوا تھا، ان میں یہ زخمی بازو والا بندہ بھی شامل تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے زخم کا یہ نیم گول نشان ایک انمٹ ثبوت بن کر چمکنے لگا۔

میں نے ایک بار پھر دھیان سے چھیدے کی صورت دیکھی۔ اس کی صورت نے میرے اخذ کئے ہوئے نتیجے کو تقویت دی۔ میرے اندر تہلکہ سا مچ گیا۔ ایک سرخ چادر سی تھی جو میری نگاہوں کے سامنے تن گئی۔ میں دیوانگی کے عالم میں چھیدے پر جا پڑا۔

''حرامزادے...... کتے...... قاتل!'' میرے منہ سے بے ساختہ پتا نہیں کیا کچھ نکل رہا تھا۔

اگلے ایک منٹ میں، میں نے چھیدے کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ اچھل اچھل کر دیواروں سے ٹکرایا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ کر لٹک گیا۔ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کلائی سمیت خوفناک انداز میں جھولنے لگا۔ یہ وہی کلائی تھی جس میں کچھ دیر پہلے عمران کے مروڑنے کی وجہ سے فریکچر ہوا تھا۔ عمران خود بھی ہکا بکا تھا۔ وہ چھیدے کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''بس کر تابی...... یہ مر جائے گا...... چھوڑ دے۔''

لیکن میرے سر پر خون سوار تھا۔ پچھلے چار سال سے جو آگ سینے میں دہک رہی تھی، وہ شعلوں میں بدل گئی تھی اور اس کی ساری تپش رشید عرف چھیدے کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔

میں نے چھیدے والا چاقو پکڑا تو عمران میرے سامنے دیوار بن گیا۔ ''کیا کرتے ہو تابی اس کو مار دیں گے تو سراجے تک کیسے پہنچیں گے؟ کیا دیوانہ پن ہے؟ پیچھے ہٹو......'' اس نے مجھے دھکیلا۔

''نہیں عمران...... میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔'' میں دہاڑا۔ اپنی آواز خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

عمران نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا اور دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ''کیا کرتے ہو تابی! شاہین کیا سوچے گی؟ آواز باہر تک جا رہی ہے۔ ذرا تحمل کرو۔''

چھیدا کسی پھٹے پرانے خون آلود کپڑے کی طرح اسٹور روم کے فرش پر پڑا تھا۔ اس کی شکل میرے دماغ میں شعلے بھڑکا رہی تھی۔ میں نے اس کے منحوس سراپا کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو سرسراہٹ جگانے لگے۔ عمران مجھے اپنے کلاوے میں لے کر اسٹور سے باہر نکل آیا اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

شاہین اور ظفر ساتھ والے کمرے میں کھڑے تھے اور ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً اسٹور روم میں جو تہلکہ مچا تھا، اس کی آوازیں پورے گھر میں گونجی تھیں۔ کھلا ہوا چاقو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ شاہین اور ظفر کا ہراس دیکھتے ہوئے میں نے یہ چاقو جیکٹ میں رکھ لیا۔

عمران نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کتے کو پہچان لیا ہے۔ یہ ان غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے شیرے وغیرہ کے ساتھ مل کر ماں جی کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔

''تم نے شروع میں تو نہیں پہچانا تھا؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے تھوڑا بہت شک تو پہلے سے ہو رہا تھا مگر اب اس کا زخمی بازو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے۔ یہ سراج اور شیرے کا ساتھی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سراج اور شیرا بھی ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ مجھے تو ایک اور خطرہ محسوس ہو رہا ہے......'' میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

عمران سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شاہین سے کہا کہ وہ میرے لئے پانی لائے۔ وہ چلی گئی تو میں نے عمران سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ہمارا پیچھا کیا گیا ہو اور چھیدے کے ساتھی یہاں آس پاس موجود ہوں۔''

''نہیں، اس بارے میں فکر نہ کرو۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''میں وین والے کو کافی

گھما پھرا کر لایا ہوں۔ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا۔''

''عمران! یہ بندہ سراج کا پتا ٹھکانا بتا سکتا ہے اور ہمیں جلدی کرنی چاہئے، یہ نہ ہو کہ وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔''

''تم غم نہ کرو۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولے گا اور سب کچھ فر فر بتائے گا۔''

عمران دو چار منٹ مزید میرے پاس بیٹھا اور پھر چھیدے سے پوچھ گچھ کے لئے اسٹور روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے شاہین کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ گھر کے سارے دروازے بند رکھے اور کیسٹ پلیئر پر اونچی آواز میں کوئی میوزک وغیرہ لگا دے۔

عمران اسٹور روم میں گیا اور پندرہ بیس سیکنڈ بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔

''کیا ہوا؟'' شاہین نے پوچھا۔

''مر گیا۔'' عمران نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''اس نے گلے پر بلیڈ پھیرا ہے۔ بازو کی نسیں بھی کاٹی ہیں۔ سارا فرش خون خون ہو رہا ہے۔''

''اوہ گاڈ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہم تیزی سے اسٹور روم میں آئے۔ عمران نے شاہین کو آنے سے منع کر دیا تھا..... اسٹور روم کا منظر واقعی دہلا دینے والا تھا۔ چھیدا ٹھنڈے فرش پر چت پڑا تھا۔ اس کی گردن اور ٹوٹی ہوئی کلائی میں سے بڑی تیزی کے ساتھ خون کا اخراج ہوا تھا اور اب اس کی آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔ عمران نے اسے ایک بار پھر ہلا جلا کر دیکھا۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

''ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔'' میں نے کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا خودکشی کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ واقعی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے تمہاری والدہ پر بہیمانہ تشدد کیا اور یقیناً یہ ہمیں سراج اور شیرے کا اتا پتا بھی بتا سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ ہم اس کی کھال اتار کر بھی اس کی زبان کھلوا لیں گے۔ اس نے مرنا آسان سمجھا۔''

ہم نے اسے گھسیٹ کر خشک فرش پر کیا اور اس کے اوپر ایک چادر ڈال دی۔ ''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے پریشان لہجے میں عمران سے پوچھا۔

''لاش غائب کرنا پڑے گی اور کیا؟''

''لیکن کیسے؟''

''سوچ لیتے ہیں، زیادہ پریشان صورت نہ بناؤ۔'' عمران نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

دروازے کو مقفل کر کے ہم باہر آ گئے۔ شاہین اور ظفر کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ عمران نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی۔ اس کے رویے سے شاہین اور ظفر کو بھی کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ بولا۔ ''اس بندے کی موت پر زیادہ سوگوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک قاتل کی موت ہے۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے، اس کی لاش سے نمٹنے کے لئے..... لہٰذا ہم پہلا کام پہلے کریں گے۔ بھوک میں دماغ بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ اس لئے پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔''

میرے کانوں میں چھیدے کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے شروع میں خود کو کرائے کا [illegible] اظہر کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس نے کسی کے کہنے پر ہمیں صرف ڈرانے دھمکانے کے لئے فائر کئے تھے۔ لیکن اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ نہایت خطرناک شخص اور سراج کے [illegible] ہی کارندوں میں سے تھا۔ یقیناً آج اس نے ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے [illegible] ہی ہمارے راستے میں گھات لگائی تھی..... لیکن اب وہ خود موت کے اندھیرے میں اتر [illegible] تھا۔ عمران کو پورا یقین تھا کہ چھیدا، پیر تھانوی صاحب کی کوٹھی سے ہمارے پیچھے نہیں لگا [illegible]۔ عمران کے خیال کے مطابق ہمیں راستے میں کہیں دیکھا گیا تھا اور ہمارا پیچھا شروع کیا [illegible] تھا۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست نکلا۔ یہ بھی پتا چلا کہ ہمارے پچھانے جانے میں عمران کی [illegible] سائیکل نے بھی کردار ادا کیا تھا۔ گھر کے اسٹور روم میں ایک خون آلود لاش پڑی ہو [illegible] اطمینان سے کھانا کیسے کھایا جا سکتا ہے۔ عمران کے اصرار کے باوجود ہم نے کھانے کا [illegible] کینسل کیا۔ میں نے علیحدگی میں جا کر عمران کو سمجھایا کہ ہمیں لاش سمیت جلد از جلد [illegible] سے نکل جانا چاہئے۔

''[illegible]ت خوب۔ کتنی دلیری والی بات کی ہے تم نے۔ اور شاہین کو یہاں خطرے میں چھوڑ [illegible]''

[illegible]''

[illegible] تو [illegible] رہے ہو کہ ممکن ہے یہ گھر سراج اور اس کے ہرکاروں کی نظر میں آ چکا [illegible] نے کہا۔

''[illegible] نے [illegible] اس خیال کو بالکل رد کر دیا تھا۔''

''لیکن اندیشہ تو بہرحال اندیشہ ہی ہوتا ہے۔ پھر ہم اس اسکول وین والے کی طرف سے بھی پوری طرح غافل نہیں ہو سکتے۔اس کی نیت میں کوئی فتور آ گیا تو پھر؟''

''تو کیا چاہتے ہوتم؟'' میں نے پوچھا۔''شاہین اور ظفر کو یہاں سے لے جانا ہے؟''

''میرے خیال میں اب یہی مناسب رہے گا۔'' عمران بولا۔

اگلے پانچ منٹ میں عمران نے شاہین اور ظفر کے لئے یہ نادر شاہی حکم جاری کر دیا کہ وہ ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑیں گے اور ان کے ساتھ جائیں گے۔

''لیکن کتنی دیر کے لئے؟'' شاہین نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس کے نہایت چمکیلے بلوری رخسار قدرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

''بس دو چار دن کے لئے۔'' عمران نے کہا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران جھوٹ بول رہا ہے۔ شاید وہ شاہین اور ظفر کو مستقل طور پر یہاں سے لے جا رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں لے لیں اور گھر کو تالا لگا دیں۔موجودہ صورتِ حال میں شاہین کا حوصلہ قابلِ ذکر تھا۔

ایک طرح سے ہم دونوں شاہین اور ظفر کے لئے بلائے ناگہانی ثابت ہوئے تھے۔ وہ اچھے بھلے سکون سے بیٹھے تھے۔ اب نہ صرف ان کے گھر میں ایک خونچکاں لاش پڑی تھی بلکہ انہیں فوراً گھر بھی چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ شاہین کے چہرے پر زیادہ تردد نہیں تھا۔ وہ عمران کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اسے جیسے عمران پر بھروسا تھا کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کا بھروسا اور اعتماد آسانی سے پروان نہیں چڑھتا لیکن جب ایک بار پروان چڑھ جائے تو بڑا پائیدار ہوتا ہے۔

عمران نے جیلانی کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور واپس آ چکا ہے۔ وہ پچیس تیس منٹ میں ایک ٹویوٹا کار لے کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ گاڑی کو گھر کے گیراج میں کھڑا کیا گیا۔ چھیدے کی لاش ایک بڑے پولیتھین میں لپیٹ کر ڈکی میں رکھی گئی۔ گھر کو تالے لگانے کے بعد جیلانی اور ظفر...... ظفر کی موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے جبکہ میں، شاہین اور عمران ٹویوٹا کار پر روانہ ہوئے۔ عمران کا شیطانی چرخہ وہیں کھڑا رہنے دیا گیا۔ جیلانی موٹر سائیکل پر ہم سے قریباً دو فرلانگ آگے تھا۔ اس نے اپنا موبائل مستقل آن کر رکھا تھا۔ دوسری طرف عمران کا موبائل بھی آن تھا۔ راستے میں کوئی بھی خطرناک پولیس ناکا دکھائی دیتے کی صورت میں جیلانی نے ہمیں اطلاع دینا تھی اور ہمیں اس کی ہدایت کے مطابق راستہ تبدیل کرنا تھا۔

یہ شام سات بجے کا وقت تھا۔ پھر بھی لاش کو ڈکی میں رکھ کر شہر کی بھری پری سڑکوں سے گزرنا ایک پُرخطر کام تھا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ شاید چھیدے مرحوم کے ساتھیوں میں سے کوئی ہمارا پیچھا کرے۔ بہرحال، یہ اندیشہ تو غلط ہی ثابت ہوا۔ تناؤ کی کیفیت کو ختم کرنے کے لئے، عمران نے حسبِ عادت ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔ اس گفتگو کا آغاز شاہین کے ایک سوال ہی سے ہوا۔ شاہین نے رشید عرف چھیدے کے بارے میں عمران سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اور کیسے ہمارے پیچھے لگا......؟

عمران نے کہا۔''اگر میں جھوٹ بولوں گا تو میرے دل پر بوجھ پڑے گا۔ اگر سچ بولوں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

''نہیں ہوتی ناراض بتاؤ تم۔''

وہ معصوم صورت بنا کر بولا۔''تم تو جانتی ہی ہو کہ ریما جی ایک عرصے سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ اب نرگس جی کے بعد یک نہ شد دو شد والی بات ہو گئی ہے۔''

''نرگس کون؟'' شاہین نے برا سا منہ بنایا۔

''وہی یار، اسٹیج دھماکوں...... میرا مطلب ہے ڈراموں والی۔ میں نے تو صرف اس لئے اسے تھوڑی سی لفٹ کرائی تھی کہ شاید اس طرح ریما جی سے پیچھا چھوٹ جائے۔ ریما کا دل کھٹا ہو جائے اور شاید اس طرح میرا بھی ہو جائے۔ لیکن وہ کیا مولانا سرسید احمد خاں کا پنجابی شعر ہے، الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ ریما کا دل تو پھر بھی کھٹا نہیں ہوا، الٹا نرگس کا دل بھی میٹھا ہو گیا۔ ایک دوست نے مجھے بتایا تھا کہ ریما نے شوٹنگ کے دوران میں کئی لوگوں کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا۔ وہ جہاں بھی گیا میرے پاس آیا...... اک یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی۔ تو اب معاملہ یوں ہے کہ ریما اور نرگس میں میرے حوالے سے ٹھنی ہوئی ہے...... بات کافی آگے نکل چکی ہے......''

''ہاں، مجھے بھی لگتا ہے کہ کافی آگے نکل چکی ہے۔ تمہیں اب کہیں داخل کرانا پڑے گا۔'' شاہین نے رواں لہجے میں کہا۔

عمران نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔''تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے، یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب نرگس کی سوچ یہ ہو گئی ہے کہ اگر میں اس کا نہیں بن سکتا تو کسی کا بھی نہ بنوں۔ یہ رشید عرف چھیدا یقیناً اسی کا بندہ تھا۔''

عمران کی گفتگو کو بریک لگ گئے۔ موبائل پر جیلانی نے اطلاع دی کہ آگے ایک ناکا

ہے لہٰذا ہم سیدھا چوبرجی آنے کے بجائے سمن آباد کے اندر سے ہو کر نکل جائیں۔

ہم نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم رائے ونڈ روڈ کی اس شاندار کوٹھی میں موجود تھے جہاں فرح اور عاطف ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ فرح نے آج لان میں بار بی کیو کا انتظام کیا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ ہم رات گئے تک باہر بیٹھیں گے اور گپ شپ کریں گے۔ لیکن یہاں ڈکی میں لاش موجود تھی اور ہم کسی طرح کی تفریح کے موڈ میں نہیں تھے۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے گہرے اندھیرے میں بدل چکے تھے۔ کوٹھی کے باغیچے کے پاس فرح اور عاطف بار بی کیو کی طویل انگیٹھی میں کوئلے وغیرہ رکھ رہے تھے۔ ایک ملازم کرسیاں وغیرہ ترتیب دے رہا تھا۔ میڈم صفورا ان انتظامات کی نگرانی کر رہی تھی۔ صفیہ بالو کو گود میں لئے ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ ان لوگوں کا موڈ کچھ اور تھا جبکہ ہمارا کچھ اور۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ”ان کو سنبھالو۔ یہ پروگرام ایک دو روز بعد کا رکھ لیا جائے۔“

”لیکن یہ لوگ کیسے مانیں گے؟ یہ تو کل سے انتظامات میں لگے ہوئے ہیں۔ جان محمد صاحب کو بھی بلایا ہے انہوں نے۔“

اس نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ ”ایسا کرو...... ان سے کہو کہ شاہین کی نانی فوت ہو گئی ہے۔ وہ بہت پیار کرتی تھی اس سے۔ سوگ کی حالت میں یہاں آئی ہے۔“

”لیکن جب وہ پوچھیں گے تو؟“

”ان سے کہو، کوئی نہ پوچھے۔ اس بارے میں کوئی ذکر ہی نہ کرے۔ وہ سخت ڈیپریشن میں ہے اس وقت۔“

”لیکن......“

”یار! جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔“ عمران نے جلدی سے کہا۔

ہم نے پورے گروپ کے سامنے شاہین کی نانی کو فوت کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ سخت ڈیپریشن میں ہے، کوئی اس سے اس بارے میں بات نہ کرے۔

بادلِ ناخواستہ کھلی فضا میں ”روسٹ ڈنر“ کا پروگرام کینسل ہو گیا اور اس پروگرام کو اِن ڈور عام ڈنر میں بدل دیا گیا۔ کوٹھی کا لان اور عقبی لان خالی ہو گئے۔ ہمارے لئے ممکن ہو گیا کہ ہم چھیدے کی لاش سے نجات حاصل کر سکیں۔ عمران اور جیلانی ٹویوٹا کار کو دھکا لگا کر عقبی باغیچے کی طرف لے گئے۔ یہاں کھاد تیار کرنے کے لئے پہلے ہی ایک گڑھا سا بنایا گیا تھا۔ اس گڑھے کو مزید گہرا کیا گیا اور پھر چھیدے کی لاش کو اچھی طرح پولی تھین کی شیٹ میں لپیٹ کر دبا دیا گیا۔

میں رات دیر تک جاگتا رہا اور صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ ہمیں یہاں لاہور پہنچے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور سیٹھ سراج کی طرف سے ہم پر پہلا وار ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بھی شک ہوتا تھا کہ شاید سراج اور شیرا وغیرہ پاکستان میں ہی ہیں۔ میں باقی سب کچھ بھول بھال کر جلد از جلد شیرے اور سراج کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے لئے اب اور صبر ممکن نہیں رہا۔ اگلے روز میں نے عمران سے اس بارے میں تفصیلی بات کی۔ وہ تو ہر وقت ایکشن اور خطرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہی رہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، جو تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔ ہم باہر نکلتے ہیں۔ سراج اور اس کے گماشتوں کو تلاش کرتے ہیں۔ ہم ان کو ڈھونڈ لیں گے یا وہ ہمیں ڈھونڈ لیں گے۔“

اگلے روز ہم نے وہی کیا جو ہمارے ذہن میں تھا۔ ہم دونوں جیلانی کی موٹر سائیکل پر نکلے اور شہر میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ ہم دونوں ہیلمٹ کے بغیر تھے۔ میری جیب میں ٹی ٹی پسٹل تھا اور وہی یادگار رام پوری خنجر تھا جس سے میں نے جارج گورا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ خنجر نما چاقو الٰہ آباد کے پارک ویو ہوٹل میں ہمارے سامان کے اندر موجود تھا۔ جب ڈی ایس پی سجاد نے ہمیں گرفتار کیا اور ہمارے ساتھی ہوٹل سے فرار ہوئے تو وہ دیگر سامان کے ساتھ یہ خنجر بھی ساتھ لے گئے۔ بعدازاں میڈم صفورا اسے کسٹم کی نظر سے بچا کر یہاں لانے میں کامیاب رہی۔ میری طرح عمران بھی مسلح تھا۔ اس کی جیکٹ میں بارہ گولی والا ماؤزر موجود تھا۔

ہم شام تک شہر کے مختلف علاقوں میں چکراتے رہے۔ خاص طور سے ان جگہوں کے آس پاس بھی گھومے جہاں سیٹھ سراج کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا...... یا اس کے ہرکاروں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ شام تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم اس جگہ بھی گئے جہاں کل ہم پر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس فائرنگ کے حوالے سے بھی کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ بس ایک دُکان والے نے بتایا کہ یہاں کل دو تین گولیاں چلی تھیں...... اور دو موٹر سائیکل سوار بڑی تیزی سے [illegible]ول کی طرف گئے تھے۔ اس نے ہمیں بس اسٹاپ کی دیوار پر ایک گولی کا نشان بھی دکھایا۔

بعدازاں ہم ایکسیڈنٹ والی جگہ پر پہنچے۔ کھمبے سے ٹکرانے والی ایف ایکس کو وہاں سے ہٹایا جا چکا تھا۔ یقیناً اب وہ کسی قریبی تھانے میں کھڑی اپنی مزید بربادی کا انتظار کر رہی تھی۔ [illegible] یہاں سو فیصد امکان اس بات کا تھا کہ ایف ایکس کی نمبر پلیٹ جعلی ہو گی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم بڑی احتیاط سے اپنے تعاقب کا دھیان رکھتے ہوئے رائے ونڈ روڈ پر

واپس آ گئے۔

شاہین غصے سے بھری بیٹھی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی یہ بات عمران کی سمجھ میں آ گئی کہ نانی کی وفات والا جھوٹ کھل چکا ہے۔ بہرحال، کسی نے اس بارے میں بات نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہین نے عمران کی بات کا بھرم رکھا ہے اور نانی کی وفات والی بات کو جھٹلایا نہیں۔ کھانے کے بعد جب تنہائی ملی تو شاہین سیدھی ہمارے کمرے میں آئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ عمران پر برس پڑی۔ ''تم نے یہ غلط بات کیوں کی؟ تم ہمیشہ ''ہرٹ'' کرتے ہو۔''

عمران نے مسمی صورت بنائی۔ ''بس مجبوری تھی یار! فوری طور پر کوئی بہانہ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اس لئے نانی ماں کو مذاق بنا دیا۔'' شاہین نے بات اُچکی۔

وہ بولا۔ ''شاہین! دیکھو، ہر بات میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ اسی بہانے تم نے بلکہ ہم سب نے تمہاری نانی ماں کو یاد کر لیا۔ ورنہ آج کل بزرگوں کو کون یاد کرتا ہے...... تم سچ بتاؤ، کبھی تمہیں نانی یاد آئی ہے؟ میری وجہ سے ہی آئی ہے نا......؟''

''تم بہت برے ہو عمران...... آتے ساتھ ہی دل دکھانا شروع کر دیا ہے۔'' اس نے آنچل سے آنسو پونچھے۔

''اچھا چلو معاف کر دو یار! جب تم کہو گی تمہاری نانی ماں سے ملنے چلیں گے۔ کہاں رہتی ہیں وہ؟''

''جہاں کوئی نہیں جا سکتا۔ وہ فوت ہو چکی ہیں۔ ایک سال پہلے۔''

''زبردست...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پھر تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔'' وہ چہکا۔

''مم...... میرا مطلب ہے، اگر وہ فوت ہو چکی ہیں تو پھر تو ہم نے کوئی جھوٹ ہی نہیں بولا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے لیٹ خبر دی ہے اور لیٹ خبر آج کل کون سا چینل نہیں دیتا...... بلکہ ہمارا ''فساد پلس'' تو اس میں نمبرون ہے۔ وشواس کرو، صرف چار دن پہلے ہم نے اندرا گاندھی کے قتل کی خبر نشر کی ہے اور سب کو ہکا بکا کر دیا ہے۔ بڑے بڑے چینلوں نے دانتوں میں انگلیاں دبائی ہیں۔''

''یعنی چینلوں کے دانت ہوتے ہیں۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے، چینل دانتوں کے بغیر ہی ہر قسم کا گوشت ہڈی سمیت چبا جاتے ہیں...

''لگتا ہے کہ تمہیں کوئی خاص تکلیف پہنچی ہے کسی چینل سے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ہمارا چینل کسی دوڑ میں شامل ہی نہیں ہے۔ یہاں تو جلد سے جلد خبر دینے کی دوڑ ہے جبکہ ہم لیٹ سے لیٹ خبر دینے کے چیمپئن بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا اپنا راستہ ہے، اپنا ٹارگٹ ہے۔ دیکھنا عنقریب ہمارے چینل سے اس طرح کی بریکنگ نیوز نشر ہوں گی...... ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ اتحادی فوجوں نے جرمنی کے دارالحکومت برلن پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا ہے۔ ہٹلر جو اپنے زمین دوز بنکر میں تھا، لاپتا ہے۔ ہمارے خصوصی نامہ نگار نے اپنے خاص ذرائع سے اطلاع دی ہے کہ ہٹلر زندہ یا پھر مر گیا ہے۔ ہمارے نامہ نگار نے دو دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس آخری معرکے میں ہٹلر مر جائے گا یا پھر زندہ رہے گا......''

شاہین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز ہماری آوارہ خرامی پھر شروع ہوئی۔ میں اور عمران لاہور کی سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتے رہے۔ اندرونِ شہر گئے، خاص اڈوں پر جا کر بھی اپنی صورت دکھائی۔ شہر میں عمران کو جگہ جگہ اپنے شناسا ملے۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ مشکل میں پھنسے ہوئے لوگوں کا مددگار، ضرورت مندوں کا خیال رکھنے والا۔ چاہنے والے اسے یونہی تو ہیرو نہیں کہتے تھے۔ وہ نگاہوں کے راستے دل میں اترتا تھا، ہر محفل کی جان بن جاتا تھا۔ ایک قحبہ خانے میں ایک سابق پولیس انسپکٹر سے عمران کی تلخ کلامی ہوئی تو عمران کی حمایت میں بولنے والے کئی افراد سامنے آ گئے اور اس سابق انسپکٹر کی بولتی بند کر دی...... شام کے وقت ہم سیٹھ سراج کے اس پلازا میں بھی گئے جو وہ اب فروخت کر چکا تھا۔ پلازا میں بھی کسی مطلوبہ شخص سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہو سکی۔

اس روز بھی ہم ناکام واپس آئے۔ مجھ پر عجیب سی مایوسی طاری ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ تک پہنچنے کا موقع میں نے اپنے ہاتھوں گنوایا ہے۔ پھیدے کو پہچاننے کے بعد میں خود پر ضبط نہ رکھ سکا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے خودکشی کر لی۔ اب ہم ایک بار پھر مکمل اندھیرے میں تھے۔ اپنی کیفیت کے زیر اثر میں چھت پر چلا گیا۔ یہاں عاطف نے ہلکی پھلکی ورزش کے لئے چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا۔ ایک سینڈ بیگ بھی یہاں جھول رہا تھا۔ میں سینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں نہا گیا اور ہاتھوں کی پشت سے خون رِسنے لگا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو عمران اور عاطف کھڑے تھے۔ عمران نے تو مجھے پہلے بھی ایسے دیوانے پن سے مشق کرتے دیکھا تھا مگر عاطف کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ششدر دکھائی دیا۔ میری آنکھوں کی نمی بھی اسے حیران

کر رہی تھی۔

عمران نے اشارے سے عاطف کو واپس بھیج دیا اور دھیمے قدموں سے میرے پاس آیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''تمہارا دکھ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جگر...... لیکن ذرا انتظار...... بس تھوڑا سا صبر۔ ہم ماں جی کی روح کو اب زیادہ دیر تڑپنے نہیں دیں گے۔''

اس کے لفظوں نے میرے اندر ایک حوصلہ سا بھر دیا۔ وہ جب بھی بولتا تھا، اسی طرح زخموں پر مرہم رکھ دیتا تھا۔

اگلے روز چاچے نذیرے کی شادی تھی۔ میں اور عمران حسبِ وعدہ وہاں پہنچے۔ عمران کی موجودگی نے اس انوکھی شادی کی رونق دوبالا کر دی۔ عمران نے باقاعدہ گانا گایا اور ڈانس کرنے والے نوجوانوں کے ساتھ مل کر ڈانس بھی کیا۔ عمران کا دوست ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی خصوصی اہمیت دی جا رہی تھی۔ حاضرین میں فربہ اندام نوجوان جمیل بھی موجود تھا......

یہ وہی بندہ تھا جس نے چند روز پہلے ہمیں اپنے پیر شوکت احمد تھانوی سے ملایا تھا اور پیر تھانوی نے ہم سے کچھ الجھی سلجھی باتیں کی تھیں۔ میں نے جمیل سے اس کے پیر کا حال احوال دریافت کیا اور پوچھا کہ وہ ہم سے دوبارہ کب ملاقات کر رہے ہیں؟

جمیل اس کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکا۔ اس نے بس یہ کہا کہ پیر صاحب کے پاس آپ کے موبائل نمبرز موجود ہیں۔ انہیں جیسے ہی ضرورت پڑے گی، وہ آپ کو کال کریں گے۔

چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی انوکھی شادی کی کوریج کے لئے تین چار اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ دو ٹی وی کیمرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ چاچا نذیرا روایتی دیہاتی لباس تہبند اور کرتے میں تھا۔ سر پر رنگ دار پگڑی تھی۔ اس نے خود کو خوب چمکایا ہوا تھا۔

ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔ ''چاچا جی! اس شادی پر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟''

بہرے چاچے نے کہا۔ ''پیسا؟ شادی پر میرا پیسا تو نہیں لگ رہا۔ یہ میرے سجن بیلی ہیں جو لگا رہے ہیں۔''

نمائندے نے نذیرے کے کان کے پاس جا کر ذرا زور سے کہا۔ ''میں کہہ رہا ہوں کہ بچپن کی محبت کو پا کر آپ نے کیسا محسوس کیا ہے؟''

''جوس تو نہیں پیا ہے۔ پتر، جوس تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میں نے سویرے گری بادام والا دودھ پیا تھا۔ اب تم سب کے ساتھ میٹھا حلوہ کھایا ہے......'' سب ہنسنے لگے۔

عمران نے کہا۔ ''چاچے! تم بڑے خوش قسمت ہو، شوہر کو سنائی نہ دے تو وہ بڑا ہی چنگا رہتا ہے۔''

''پنگا؟ نہیں عمران پتر! میرا تو کسی سے پنگا نہیں رہتا اور کلثوم کے ساتھ تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

شام کے وقت چاچے نذیرے کی شادی سے فارغ ہو کر میں اور عمران ایک بار پھر لاہور کی سڑکوں کی پیمائش کرنے لگے۔ یہ ہفتے کا روز تھا ہر طرف ویک اینڈ کی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ہم اس ہوٹل کے پاس سے گزرے جہاں کبھی ثروت اور میں بیٹھا کرتے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ ہم ذرا چائے پینے کے لئے رک گئے۔ یہاں کی بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ یہی جگہ تھی جہاں سیٹھ سراج کے بیٹے واجی نے اپنے دوستوں کے ہمراہ مجھے اور ثروت کو زچ کیا تھا۔ ہم پر فقرے کسے تھے اور اپنی ہیوی موٹر بائیکس ہماری گاڑی کے پیچھے پارک کر کے ہمارا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد ہم کبھی اس جگہ نہیں آئے۔ آج قریباً چار سال بعد میں ان در و دیوار کو دیکھ رہا تھا اور...... سینے میں دھواں بھر رہا تھا۔

''چلو عمران چلیں۔'' چائے ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو ایک دبلے پتلے ویٹر مقبول نے مجھے جھک کر سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ پرانے چہروں میں سے بس یہی ایک چہرہ مجھے یہاں نظر آیا تھا۔ ''آپ بہت عرصے بعد یہاں آئے ہیں صاحب جی؟'' وہ بتیسی نکال کر بولا۔

''ہاں، میں یہاں نہیں تھا۔ باہر تھا ملک سے۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

وہ ذرا جھجکا پھر بولا۔ ''مجھے یاد ہے جی، آپ جب بھی آتے تھے...... وہاں اس کونے والی میز پر بیٹھتے تھے۔ اس وقت کافی دبلے پتلے تھے آپ...... اور...... اور آپ کے ساتھ وہ بی بی بھی ہوتی تھیں۔ آپ کی منگیتر تھیں نا شاید؟''

''ہاں۔'' میں نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔

''وہ کچھ مہینے پہلے بھی یہاں آئی تھیں۔ میں نے جس طرح آپ کو پہچانا، انہیں بھی فوراً پہچان لیا تھا۔''

ویٹر مقبول کے اس فقرے نے جیسے میرے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو زمین سے پیوست کر دیا۔ عمران بھی چونک گیا۔

''کک......کب کی بات ہے یہ؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''مجھے ٹھیک سے یاد تو نہیں، میرا خیال ہے، یہی اگست، ستمبر کے دن تھے۔ اور ایک بار نہیں، وہ تین چار بار آئی تھیں یہاں۔ اکیلی ہی ہوتی تھیں۔ پہلے سے کمزور لگتی تھیں اور کچھ گم صم بھی۔ وہ اسی کونے والی میز پر بیٹھتی تھیں۔'' ویٹر مقبول نے ایک بار پھر ہال کے شمالی گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے تعجب سے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ عمران کی اطلاع کے مطابق ثروت اور ناصر وغیرہ جرمنی میں تھے لیکن یہ ویٹر مقبول کچھ اور خبر دے رہا تھا۔ ویٹر مقبول کا یہ جملہ بھی میری دھڑکنوں کو زیر وزبر کر رہا تھا کہ ثروت یہاں آتی تھی اور فلاں میز پر بیٹھتی تھی۔

عمران نے ویٹر مقبول سے پوچھا۔ ''کیا ہم کہیں اور بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں جی...... میری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔ میں تو واپس جا رہا تھا۔ اگر آپ دو سیکنڈ پہلے کاؤنٹر کی طرف نہ آتے تو میں نے تو سیدھا نکل جانا تھا۔''

''کہاں بیٹھیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کہیں باہر چلتے ہیں جی...... یہاں آپ کے برابر بیٹھتے ہوئے شرم آئے گی۔''

بہتر یہی تھا کہ کہیں اور بیٹھا جائے۔ ہم ویٹر مقبول کے ساتھ باہر نکلے۔ اب آٹھ بجنے والے تھے۔ اَن گنت نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ سڑک پر روشنی کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ ہم نے سڑک پار کی اور کچھ فاصلے پر ایک پارک میں جا بیٹھے۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں نے مقبول سے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ...... میرا مطلب ہے کہ وہ ثروت ہی تھی؟''

''آپ کیسی بات کرتے ہیں جی...... میں آپ دونوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یوں تو ہمارے کیفے میں بہت سے جوڑے آتے ہیں لیکن آپ دونوں کی بات اور تھی۔ آپ کے میل ملاقات میں کوئی لوفر پن نہیں تھا۔ آپ دونوں کبھی کسی کیبن میں نہیں بیٹھے اور بی بی جی کی تو شکل دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کسی نیک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ آپ دونوں اکثر گرین ٹی پیتے تھے اور مجھے یاد ہے جس حساب سے بل بنتا تھا، اسی حساب سے مجھے ٹپ بھی دیتے تھے...... ایک دفعہ آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ دونوں منگیتر ہیں۔ بی بی جی کا چہرہ اس بات پر بالکل گلابی ہو گیا تھا۔''

میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بتا رہے ہو کہ چند مہینے پہلے وہ تین چار بار یہاں آئی...... تمہاری کوئی بات ہوئی ان سے؟''

''جی ہاں...... مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کے ساتھ ان کی منگنی وغیرہ آگے نہیں چل سکی۔ ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہی ہیں اور آج کل یہاں اکیلی کیوں آتی ہیں؟ انہوں نے بس گول مول سا جواب دیا۔ کہنے لگیں، میں پاکستان سے باہر تھی۔ یہاں کی چائے کی بہت یاد آتی تھی اس لئے آ جاتی ہوں...... سوچتی تمہارے سوا سب کچھ بدل چکا ہے۔ مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے ان سے یہ سب کچھ پوچھا۔''

''کیوں؟''

''اس کے بعد وہ آئی ہی نہیں۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے، وہ عارضی طور پر لاہور میں تھیں یا یہاں رہ رہی تھیں؟''

''میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ان کے پاس اپنی سواری نہیں تھی جی۔ وہ پیدل ہی آتی تھیں۔ ایک بار میں نے انہیں رکشا سے اترتے بھی دیکھا...... ہاں، ایک بات یاد آئی۔ ایک دن میں نے انہیں انشورنس کمپنی والے دفتر کی سیڑھیاں اترتے بھی دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نوکری کی تلاش میں وہاں گئی ہیں لیکن اس کے بعد میں نے انہیں دوبارہ نہیں دیکھا۔''

انشورنس کمپنی کے دفتر والے ذکر نے مجھے چونکا دیا۔ یہ دفتر پاس ہی چوراہے میں تھا...... ایک لحاظ سے یہ اس علاقے میں سب سے پرانا دفتر تھا۔ یہاں میرے کالج کی ایک ساتھی فائزہ کام کرتی تھی۔ فائزہ کسی حد تک ثروت کو بھی جانتی تھی۔ جب میں اور ثروت یہاں ویٹر مقبول والے کیفے میں ملنے آتے تھے تو کبھی کبھی یہاں فائزہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ثروت کو واقعی ملازمت کی تلاش ہو۔ وہ اس سلسلے میں فائزہ سے ملی ہو اور فائزہ اس کے بارے میں جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔

اگلے دن تک کا وقت میں نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ انشورنس کمپنی کے اس دفتر کے علاوہ میرے پاس فائزہ کا اور کوئی رابطہ نہیں تھا۔ علی الصباح میں اور عمران موٹر سائیکل پر سوار ہو کر انشورنس کمپنی کے دفتر پہنچ گئے۔ یہ جان کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ فائزہ ابھی تک اسی آفس میں کام کرتی ہے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بن چکی ہے...... جلد ہی میں اور عمران، اس کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھے۔ فائزہ نے مجھے پہچان لیا اور بڑے تپاک سے ملی۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہو گئی تھی اور لڑکی کے بجائے خاتون نظر آتی تھی۔

وہ میری آمد پر بے حد حیران ہوئی۔ ''تم اتنا عرصہ کہاں رہے تابش! مجھے تو لگتا تھا کہ تم سے اب کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میرے اندازے کے مطابق تم پاکستان میں تو ہرگز نہیں تھے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے فائزہ۔''

''میں نے تمہارے گھر بھی کئی بار فون کئے۔ پھر ایک بار خود وہاں گئی تھی لیکن پتا چلا کہ اس گھر میں اب کوئی اور رہتا ہے۔ فرح اور عاطف وغیرہ کا بھی کچھ کھوج نہیں ملا۔ بس ایک اڑتی اڑتی سی افسوس ناک خبر ملی کہ تمہاری والدہ کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہیں اور اس کے بعد سے تم بھی لاپتا ہو۔''

فائزہ نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے ہمارے لئے چائے منگوائی اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اسے والدہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں مختصراً بتایا اور فرح عاطف کی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔

''ثروت کہاں ہے آج کل؟'' فائزہ نے چائے کا دوسرا دور شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تم انجان بننے کی کوشش کر رہی ہو فائزہ! مجھے پتا چلا ہے کہ ثروت تمہارے پاس نوکری کے لئے آئی تھی اور تم نے اسے نوکری دلوا بھی دی تھی۔ وہ یہیں پر کام کرتی رہی ہے۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

فائزہ گہری نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ ''تمہیں یہ کس نے بتایا؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

وہ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''غلط نہیں کہہ رہے ہو تو درست بھی نہیں کہہ رہے ہو۔ شاید تم قیافے سے بات کر رہے ہو۔''

''چلو تم خود بتا دو۔ میں نے کتنا درست کہا ہے اور کتنا غلط۔''

''چلو، کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔'' فائزہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

ہم دفتر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سڑک پار کر کے اسی جانے پہچانے کیفے میں آ بیٹھے جو کبھی میری اور ثروت کی ملاقاتوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کیفے کی فضا میں پہنچتے ہی میرے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ آج ویٹر مقبول آن ڈیوٹی نہیں تھا۔ ہم نے کولڈ کافی کا

ارار دیا...... اور ایک بار پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ عمران نے اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا۔ بہرحال، فائزہ سمجھ چکی تھی کہ عمران کی حیثیت میرے نہایت قریبی دوست کی ہے اور وہ عمران کے سامنے ہر طرح کی بات کر سکتی ہے۔

میں بے چینی سے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے گھمبیر آواز میں بولی۔ ''تمہاری یہ بات درست ہے تابش کہ سات آٹھ مہینے پہلے ثروت یہاں نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں ملی۔ شاید اسے پتا ہی نہیں تھا کہ میں ابھی تک یہاں کام کر رہی ہوں۔ وہ ایک خانہ پُری والا انٹرویو دے کر مایوس واپس جا رہی تھی کہ میری نظر اس پر پڑ گئی۔ میں اسے پکڑ کر دفتر کے کیفے ٹیریا میں لے گئی۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ بس مجھ سے جلد از جلد پیچھا چھڑا کر چلی جانا چاہتی تھی۔

''میں اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کن حالات سے گزر رہی ہے اور میرا یہی تجسس اسے مجھ سے دور جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے صاف کہا کہ اگر میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے تو پھر میں اس سے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھوں۔ میں نے کہا کہ میں خود سے کچھ نہیں پوچھوں گی، اگر وہ اپنی مرضی سے کچھ بتانا چاہے تو اور بات ہے۔

''اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو ماہ پہلے جرمنی سے پاکستان آئی ہے۔ یہاں ایک پرانی سہیلی کے پاس ماڈل ٹاؤن میں ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ شادی شدہ سہیلی ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں لیکن اب وہ مزید اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ اسے نوکری کے ساتھ ساتھ ایک ٹھکانے کی تلاش بھی ہے۔

''میں نے کہا کہ ثروت یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہارا اور میرا ٹاکرا ہو گیا۔ میرا گھر تمہارے لئے بہترین ٹھکانا ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا بچہ کوئی نہیں ہے۔ ساس کے ساتھ رہتی ہوں۔ شوہر ملازمت کے سلسلے میں آج کل دبئی مقیم ہیں۔ ہمارا وقت بڑا اچھا گزرے گا۔ باقی رہی نوکری کی بات تو تم پڑھی لکھی ہو۔ اب جرمنی کی ڈگری بھی ہے تمہارے پاس۔ تھوڑی سی کوشش سے تمہیں کہیں بھی باوقار نوکری مل سکتی ہے۔ لیکن اگر تم میرے ساتھ انشورنس کمپنی کے دفتر میں کام کرو تو مجھے اچھا لگے گا۔ یوں میں نے ثروت کے لئے اپنے دفتر میں ہی بڑی اچھی جاب کا انتظام کر دیا۔ میں نے اپنے شوہر سے بھی اجازت لے لی اور وہ میرے ساتھ ہی میرے گھر میں رہنے لگی۔ وہ کوئی تین ماہ میرے ساتھ رہی اور ہم دونوں کا وقت اتنا اچھا گزرا کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی لیکن الجھن بس ایک ہی تھی۔ اس نے میری زبان کو تالا لگا

دیا تھا۔ میں اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ جو تھوڑا بہت مجھے معلوم ہوا، وہ بس یہی تھا کہ تمہارے ساتھ اس کی منگنی برقرار نہیں رہ سکی تھی اور وہ ڈھائی تین سال جرمن میں اپنے بھائی کے ساتھ رہنے کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے واپس آئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”فائزہ! تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس نے شادی کی ہے یا نہیں؟“

”میں سچ کہتی ہوں تابش! مجھے اس بارے میں بڑا تجسس تھا لیکن یہ سوال ان نازک ترین سوالوں میں سے تھا جنہیں وہ کسی صورت سننا پسند نہ کرتی۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اپنا وعدہ توڑا تو اسے ایک دم کھو دوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ صبح اٹھوں تو وہ میرے گھر میں موجود ہی نہ ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ ایک بہت بھاری بوجھ سینے پر لئے پھر رہی ہے۔ اس بوجھ اور دکھ سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے وہ گاہے بگاہے، ہنستی بھی تھی، باتیں بھی کرتی تھی، رات گئے تک دفتر کے کام میں بھی لگی رہتی تھی لیکن اس سب کے دوران میں بھی اس کا دھیان جیسے کہیں اٹکا رہتا تھا۔“

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا کبھی اس نے آپ سے تابش کے بارے میں کوئی سوال کیا؟“

”نہیں...... براہِ راست تو نہیں لیکن ایک بار اتنا ضرور پوچھا کہ کیا میری ملاقات کبھی بھی فرح اور عاطف سے نہیں ہوئی؟ میں نے بتایا کہ نہیں۔ ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میں نے اسے تجویز دی کہ لاہور میں اس کے دو چار رشتے دار موجود ہیں، وہ ان سے ملے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فرح اور عاطف کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔ اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار سے ملنا چاہتی ہے اور نہ ماضی سے کسی طرح کا رابطہ رکھنا چاہتی ہے۔“

ہم باتیں کر رہے تھے۔ کیفے کی کھڑکیوں سے باہر ایک ابر آلود دوپہر گرد و پیش کو نیم روشن کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”فائزہ! تم نے کہا ہے کہ وہ دو تین مہینے تمہارے ساتھ رہی...... پھر کہاں گئی؟“

فائزہ نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولی۔ ”ایک دن میں فیلڈ ورک کے لئے دفتر سے باہر تھی۔ شام کے وقت واپس آئی تو پتا چلا کہ ثروت جلدی چھٹی کر کے چلی گئی ہے۔ اس کے ساتھی آفیسر نے بتایا کہ لمبے قد کا ایک شخص وہاں آیا تھا۔ اس نے کوریڈور میں کھڑے ہو کر ثروت سے آٹھ دس منٹ تک بات کی۔ انداز ہوتا تھا کہ ان میں کوئی تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ شاید وہ شخص ثروت کو کسی بات پر دھمکا بھی رہا تھا۔ اس کے

ہاتھ میں ایک لیگل سائز لفافہ تھا جسے وہ بار بار ثروت کے سامنے کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ثروت چھٹی لے کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ جب میں گھر جاؤں گی تو وہ وہاں موجود ہو گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں بے چینی سے اس کی کال کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ وہ ساری رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ اگلے روز بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ شام کے وقت بس اس کا مختصر ٹیکسٹ میسج میرے موبائل پر آیا۔ وہ میسج ابھی بھی میرے پاس محفوظ ہے......“

فائزہ نے اپنے شولڈر بیگ میں سے موبائل فون نکالا اور تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک میسج دکھایا۔ اس ٹیکسٹ میسج میں قریباً پانچ مہینے پہلے کی ڈیٹ تھی۔ میسج کچھ یوں تھا۔

”فائزہ! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہیں بتائے بغیر چلی آئی ہوں۔ میری کچھ ذاتی مصروفیات ہیں جن کی وجہ سے میں آ نہیں سکتی۔ بہرحال، میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آفس بھی نہیں آؤں گی۔ میرا استعفا آفس میں مل جائے گا۔“

فائزہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ثروت کے اس نمبر پر رابطے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نمبر کے علاوہ میرے پاس اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ آخر میں تھک ہار کر بیٹھ گئی۔“

عمران نے فائزہ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”اس بندے کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے جو ثروت سے ملنے آیا تھا؟“

”میں نے کہا ہے نا کہ ثروت نے مجھے اپنے بارے میں بالکل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس اس کے رہنے کی پہلی شرط ہی یہ تھی کہ میں کچھ پوچھوں گی نہیں۔ جہاں تک اس بندے کا تعلق ہے...... ہو سکتا ہے...... وہ اس کا شوہر ہو لیکن اگر وہ شادی شدہ نہیں تھی تو پھر وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً میرا دھیان ثروت کی اس شادی شدہ سہیلی کی طرف بھی جاتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آنے کے بعد ٹھہری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس سہیلی کا شوہر یا دیور وغیرہ ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنی اس سہیلی کا گھر چھوڑنے پر ”بوجوہ“ مجبور ہوئی تھی۔“

عمران نے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ سہیلی کے شوہر یا گھر کے کسی اور مرد کا رویہ ثروت سے ٹھیک نہ ہو؟“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں عمران صاحب! ہماری سوسائٹی میں خوب صورت اکیلی لڑکی کے لئے زیادہ تر مرد تو شکاری ہی ہوتے ہیں۔ اچھے لوگوں کا ریشو کم ہے۔“

عمران نے سگریٹ کے روشن سرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس بندے کا پتا چلنا چاہئے جو آخری بار ثروت سے ملا تھا۔''

''یا پھر ثروت کی اس سہیلی سے کچھ پتا چل سکتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آ کر ٹھہری تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی کھوج کھرا نہیں۔'' میں نے کہا۔

عمران نے پوچھا۔ ''دفتر میں جاب حاصل کرتے وقت ثروت نے جو اکوائف لکھوائے، ان سے کوئی مدد نہیں ملتی؟'' فائزہ نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔

''اور وہ سامان جو وہ تمہارے پاس چھوڑ گئی تھی؟ ہوسکتا ہے اس سے کوئی کھوج ملے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تو وہ کئی بار دیکھا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو تم بھی دیکھ لو۔'' فائزہ نے کہا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی موسم کافی ابر آلود ہو گیا تھا۔ دوپہر میں ہی لگ رہا تھا کہ شام ہوگئی ہے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو...... کون؟ جی جی تھانوی صاحب۔ میں بول رہا ہوں...... ابھی؟...... لیکن......''

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا...... پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو میں حاضر ہو جاتا ہوں...... او کے۔''

فون بند کر کے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''پیر احمد تھانوی صاحب کی کال تھی۔ زور دے رہے ہیں کہ میں ابھی آ جاؤں۔ مریض کی حالت خراب ہے۔''

''تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

فائزہ بولی۔ ''میرے خیال میں آپ کو کوئی ضروری کام ہے، آپ چلیں۔ میں بھی دفتر کا تھوڑا سا کام نمٹا لوں۔ آج رات کا کھانا آپ میرے گھر کھائیں۔ تفصیل سے بات چیت بھی ہوگی۔ ابھی آپ کو بہت کچھ بتانا ہے اور آپ سے پوچھنا بھی ہے۔''

فائزہ نے اپنے گھر کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر مجھے دیا۔ فائزہ سے رخصت ہو کر ہم جیلانی کی موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور شاہ جمال کے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ راستے میں ہی زوردار بارش شروع ہو گئی۔ یہ اچھا خاصا طوفانِ باد و باراں تھا، ہم کہیں رکنے کے بجائے چلتے رہے۔ ساون میں تو سب ہی بارش میں نہانا چاہتے ہیں...... اس جاتی سردیوں کی بارش میں نہانے کے لئے ہمت کی ضرورت تھی اور یہ ہمت ہم دونوں میں موجود تھی۔ عمران کی جیکٹ مکمل واٹر پروف تھی۔ اس کی پاکٹ میں موجود ماؤزر

اور ایمونیشن کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ تھانوی صاحب نے چند دن پہلے ہمارے اندر جو تجسس جگایا تھا، وہ اب عروج پر پہنچ چکا تھا۔ پیر صاحب فرماتے تھے کہ ایک مریض کے علاج میں عمران ان کی خاطر خواہ مدد کر سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک مریض کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور نہ اس کے علاج کے بارے میں۔

ہم جس وقت شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے، بارش پورا زور پکڑ چکی تھی۔ ہمارے استقبال کے لئے فربہ اندام جمیل اور ایک باریش ادھیڑ عمر مرید پہلے سے برآمدے میں موجود تھے۔

جمیل نے کہا۔ ''اوہو عمران بھائی! آپ تو بھیگتے ہوئے آئے ہیں۔ آپ بتا دیتے، پیر صاحب آپ کے لئے گاڑی بھجوا دیتے۔''

عمران بولا۔ ''کسی ایک کو تو بھیگنا ہی پڑتا۔ ہم نہ بھیگتے تو گاڑی بھیگ جاتی بلکہ چیکڑ و چیکڑ ہو جاتی۔ پھر سروس کرانے پر کافی پیسے لگ جاتے۔ ہمارا کیا ہے، تھوڑے سے پانی سے نہا لیں گے اور پانی کی بچت بہت ضروری ہے۔ امریکا نے کہا ہے کہ اگلی ساری لڑائیاں پانی کی وجہ سے ہوں گی...... جیسے پچھلی ساری لڑائیاں امریکا کی وجہ سے ہوئی ہیں......''

عمران جب ایک بار زبان کو حرکت دے دیتا تھا تو پھر وہ جلدی رکتی نہیں تھی۔ لیکن یہاں بولنے کا زیادہ موقع نہیں تھا کیونکہ ہم جلدی ہی...... تھانوی صاحب کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ تھانوی صاحب نے اپنے کمرے میں ہمارا استقبال کیا، تپاک سے ملے۔ اس بات پر معذرت بھی کی کہ ہمیں بھیگتے ہوئے یہاں آنا پڑا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھے۔ کندھوں پر ایک سنہری شال تھی۔ انہوں نے ہمیں ساتھ لیا اور ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کا منظر تعجب خیز تھا۔ ایک پلنگ پر ایک نہایت کمزور شخص لیٹا نظر آیا۔ اس کی عمر یہی کوئی چھبیس ستائیس سال دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ٹھوڑی تک لحاف اوڑھ رکھا تھا۔ تاہم اس لحاف کے اوپر ایک سفید چادر بھی تھی۔ اس نے اپنا سر وغیرہ بھی ایک سفید کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لحاف کا ایک کنارہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ اس شخص کے سینے پر کوئی زخم سا ہے جس پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اس جواں سال شخص کی گدلی آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر عورت مدقوق شخص کے سرہانے بیٹھی تھی اور آنسو بہا رہی تھی۔ اندازہ ہوا کہ یہ مریض کی ماں ہے۔ ماں بیٹا نے جن نظروں سے عمران کو دیکھا، مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ وہ اسے پہلے سے جانتے ہیں۔ دوسری طرف عمران کے چہرے پر بھی شناسائی کے آثار نظر آئے۔

عمران کو دیکھ کر ادھیڑ عمر عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے انداز میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

احمد تھانوی صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کر کے مدقوق شخص سے کہا۔ ''نیاز محمد! اسے پہچان رہے ہونا تم؟ یہ عمران ہے...... جسے تم عمو کہتے ہو۔''

مدقوق شخص نے اپنے سوکھے سڑے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مزید ڈرا ہوا دکھائی دینے لگا۔ تھانوی صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔ ''بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لایا ہوں اسے۔ اگر اب بھی تمہارے دماغ کا فتور نہ نکلا تو یہ بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔''

میرے دماغ میں ہلچل ہوئی۔ عمران کی روداد میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ نیاز اسی چودھری زادے کا نام تھا جس پر سے آفت ٹالنے کے لئے برسوں پہلے عمران کا انتخاب کیا گیا تھا۔ چودھری سجاول اور اس کی بیوی نے اپنے لاڈلے بیٹے کو آسمانی بجلی والی نحوست سے بچانے کے لئے عمران کو قربانی کا بکرا بنایا اور اسے شہنشاہ کے مزار پر خدمت کے لئے بھیج دیا تھا۔

میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ وہی نیاز تھا۔ خوف اور بیماری نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا تھا...... یوں لگتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح اسے بھی ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور وہ یہیں اس پلنگ پر پڑا پڑا آخری ہچکیاں لینی شروع کر دے گا۔ باہر طوفانِ بادو باراں اپنے زور پر تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل دہاڑ رہے تھے۔

تھانوی صاحب نے عمران کو اشارہ کیا اور ہم پیر صاحب کے ساتھ باہر آ گئے۔ دوسرے کمرے میں آ کر پیر صاحب نے مجھے اور عمران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ بولے۔ ''عمران بیٹا! انسان جو کچھ بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ اس میں دیر ہوسکتی ہے، اس کی شکل بدل سکتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔ نیاز کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ وہم کا دنیا میں کوئی علاج نہیں...... اور یہ وہم نیاز اور اس کے گھر والوں کو جکڑ چکا ہے۔ یہ وہی وہم ہے جس کی وجہ سے تم پر مصیبتیں آئیں اور تمہیں اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔''

''آپ کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔'' عمران نے ہنکارا بھرا۔

تھانوی صاحب نے اپنی سفید براق داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں یہ بات کیسے ان لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی کچھ خاص لوگوں کا پیچھا کرتی ہے...... اور انہیں مارے بغیر نہیں چھوڑتی۔ کئی برس پہلے جب اس وہم نے ان لوگوں کو جکڑا تو انہوں نے اپنی دانست میں اپنی بلا تمہارے گلے ڈالنے کی کوشش کی...... اب ایک بندے کی

وجہ سے یہ وہم پھر ان لوگوں کی طرف واپس آ گیا ہے کہ آسمانی بجلی نیاز کو کھا جائے گی۔ اب یہ بندہ رات دن جان کنی کے عذاب میں پڑا ہوا ہے۔ تم نے ابھی اسے دیکھا ہی ہے، کیا حال ہو رہا ہے اس کا۔ راتوں کو اٹھ کر چلانے لگتا ہے۔ اونچی آواز میں روتا ہے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے نیچے چھپتا ہے۔ نیم دیوانوں کی سی حالت ہو چکی ہے۔''

عمران پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ''لیکن یہ لوگ تو ساری مصیبت میرے سر...... ڈال کر ''فارغ'' ہو چکے تھے۔''

''میں نے بتایا ہے نا کہ ایک بندے کی وجہ سے یہ وہم پھر ان کی طرف لوٹ آیا ہے...... یا یوں کہہ لو کہ اس بندے کی خودغرضی اور طمع نیاز کو موت کے منہ میں لے آئی ہے۔ تم اس بندے کو جانتے ہو اور پہچان بھی لو گے۔'' احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک دراز کھولی اور ایک کتاب میں رکھی ہوئی تصویر نکال کر عمران کو دکھائی۔ عمران کے چہرے پر نفرت کا رنگ لہرا گیا۔ حالانکہ یہ رنگ کم کم ہی اس کے چہرے پر آتا تھا۔ میں نے بھی تصویر پر نظر ڈالی۔ یہ گول چہرے والا ایک شخص تھا۔ بال لمبے تھے۔ اس نے سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ ایک رخسار اور کنپٹی پر گہرا زخم تھا جیسے کسی جانور کے پنجے کا کھرونچا ہو۔ اس کھرونچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کی یہ آنکھ بھی سلامت نہیں ہے۔ میرا ذہن فوراً صادق شاہ کی طرف چلا گیا۔ وہی شیطان صفت عامل جو عمران کے انتقام کا نشانہ بنا تھا۔ ''نوجوان مردوں کی شکاری ماجھاں'' کے بعد یہ دوسرا شخص تھا جسے عمران نے بڑی خوب صورتی سے اپنے انتقام کی تپش سے آگاہ کیا تھا۔ عمران نے مشتعل بنگلہ ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے میں چھوڑ دیا تھا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ شیر اور صادق شاہ کی اس طوفانی ملاقات میں پیر صادق شاہ کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔ دونوں ہنسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور ''خادم'' نے مخدوم کا ایک کندھا بھی چبا ڈالا تھا۔

تھانوی صاحب کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''نیاز اور اس کی ماں کے ذہن میں یہ بات اسی صادق شاہ نے ڈالی ہے کہ عمو چونکہ اب تک بجلی والی آفت سے بچا ہوا ہے، اس لئے اب یہ آفت عمو کے ساتھ ساتھ نیاز پر بھی آ گئی ہے۔ ان دونوں میں سے جو کوئی بھی پہلے آسمانی بجلی کے نشانے پر آئے گا، مارا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ چودھرائن اور اس کے اکلوتے بیٹے سے موٹی رقمیں بٹورنے کے لئے کیا تھا۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کافی کامیاب بھی رہا ہے۔ سنا ہے کہ نقد رقم کے ساتھ ساتھ وہ اب تک کافی اراضی بھی ماں بیٹے سے ہتھیا چکا ہے۔''

عمران نے اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھوا اور پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''مجھے پتا تھا، ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہے۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ وہم کا کوئی علاج نہیں اور وہمی شخص کو کسی نئے وہم میں مبتلا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔''

تھانوی صاحب نے کہا۔ ''دو تین ماہ پہلے یہ لوگ پیر صادق شاہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ کسی نے ان کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دی۔ چودھرائن کو نماز، روزے کی طرف راغب کیا۔ وظیفے بتائے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ نیاز محمد پچھلے قریباً ڈھائی مہینے سے میرے پاس ہی رہ رہا ہے۔ دو تین روز کے لئے گاؤں جاتا بھی ہے تو فوراً پلٹ آتا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ میرے پاس زیادہ محفوظ ہے۔ لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہاں بھی وہ مکمل سکون میں نہیں ہے۔ اس کی ذہنی صحت بہت بگڑ چکی ہے۔ میں مختلف طریقوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ اسے نارمل زندگی کی طرف لا سکوں۔ آج میں نے جو تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی ہے تو اسی سلسلے میں دی ہے۔''

''جی، میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' عمران نے کہا۔

''یہ سب کچھ تمہیں عجیب تو لگے گا عمران...... لیکن عجیب بیماریوں کے علاج بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں عمران کہ آج تم اس برسوں پرانے خیال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو جو تمہارے آبائی گاؤں کے لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے...... اور یہ بس تمہارے گاؤں کی بات نہیں ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ علاقے کے بہت سے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آسمانی بجلی تمہاری دشمن ہے اور تم اس سے چھپتے پھرتے ہو۔ نیاز اور اس کی چودھرائن ماں کا خیال بھی یہی ہے۔ آج تم نیاز اور اس کے سامنے اس خیال کو غلط ثابت کر دو۔''

''میں بالکل تیار ہوں جی...... مجھے خوشی ہو گی اگر میرے اس چھوٹے سے کام سے ان لوگوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔''

''میں جانتا ہوں عمران...... تم بڑے دل کے مالک ہو۔ اپنے دشمنوں سے بھی اچھا کر سکتے ہو۔'' احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سچ پوچھیں جی تو میں نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا رکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ جاہلیت اور دقیانوسیت نظر آئے گی، اس کے خلاف اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق کوشش کروں گا۔ اور اس کام میں میرا یہ بھائی اور دوست تابش بھی میرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہے۔''

تھانوی صاحب نے گہری نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے توقف

کرنے کے بعد بولے۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں ہمارے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ بہرحال، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔''

تھانوی صاحب ہمیں وہیں چھوڑ کر پھر نیازے اور اس کی ماں کے پاس چلے گئے......

بارش اسی تسلسل سے جاری تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد...... تھانوی صاحب واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ لبادہ تھا......

انہوں نے یہ لبادہ عمران کے بھیگے ہوئے کپڑوں کے اوپر سے ہی اسے پہنا دیا۔ پھر وہ عمران کو لے کر باہر صحن میں آ گئے۔ یہاں فائبر کی ایک کرسی پڑی تھی...... تھانوی صاحب کی ہدایت کے مطابق عمران جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران کو کمپنی فراہم کرنے کے لئے فربہ اندام جمیل بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دونوں باتیں کرنے لگے اور بارش میں بھیگنے لگے...... میں اور تھانوی صاحب اس کمرے میں آئے جہاں نیازا اور اس کی ماں ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ کمرے کی گرل دار کھڑکی میں سے صحن کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ بستر پر بیٹھے نیازے کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی ہیں۔ چودھرائن بھی سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ تھانوی صاحب کچھ دیر تک ان دونوں کے پاس کھڑے رہے پھر نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ''نیاز! مجھے پتا نہیں کہ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی تمہارے دماغ کا خناس دور ہو گا یا نہیں...... لیکن جو حقیقت ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ یہ اس چمکتی بجلی اور برستی بارش میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہے اور میں تمہیں دعوے سے کہتا ہوں۔ یہ بندہ کبھی بھی ان چیزوں سے چھپا نہیں بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے بھی یہ اسی طوفان میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔''

''لیکن......'' نیاز ہکلا کر رہ گیا۔

''تم چاہو تو جب تک یہ بارش برس رہی ہے...... عمران یہاں کھڑا رہے گا۔ اور صرف آج کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر تم آئندہ بھی چاہو تو یہ تمہیں اس تجربے سے گزر کر دکھا سکتا ہے۔ اپنے اندر کے بے جا خوف اور واہموں کو دور کرو نیاز...... جس طرح عمران عمو کے سر پر کوئی آفت نہیں، تمہارے سر پر بھی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک زہریلا وسوسہ ہے......''

بجلی چمکی۔ ساتھ ہی ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ در و دیوار لرز گئے۔ نیازا بے ساختہ چلا اٹھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے اپنے کلاوے میں لے لیا، اسے پچکارنے لگی۔ ''کچھ نہیں پتر...... کچھ نہیں ہوا۔ پیر جی ہمارے پاس ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں ہو سکتا۔''

"میرے ہونے نہ ہونے کی بات نہیں چودھرائن۔ اصل میں کچھ ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک دھواں ہے، دھند ہے، وسوسہ ہے۔ وہ دیکھو، حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ کالا چولا پہنے وہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور جب تک تم چاہو گے بیٹھا رہے گا۔"

نیازے نے ڈری ڈری نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ عمران اور جمیل باہر موجود تھے۔ نیازے کا سارا جسم کانپنے لگا...... چودھرائن نے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ خود بھی کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ عمران اب اندر آ چکا تھا۔ اس نے گیلے کپڑے اتار کر دوسرے پہن لئے تھے...... یہ تھانوی صاحب کے کسی مرید کی شلوار قمیص اور جرسی تھی۔ ایک ہال کمرے میں...... تھانوی صاحب کے کئی مریض اور معتقدین موجود تھے۔ وہ بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ سات بج چکے تھے۔ ہال میں موجود افراد میں سے بھی دو چار لوگوں نے عمران کے بارش میں بھیگنے کا منظر دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید اسے کسی روحانی عمل سے تعبیر کیا ہو۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھانوی صاحب نے چند دن پہلے عمران سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ آج نہیں بلکہ پھر کسی اور دن اسے زحمت دیں گے۔ یقیناً انہیں کسی ابر آلود دن کا انتظار تھا...... اور یہ انتظار آج ختم ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد فربہ اندام چودھرائن اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے تھے۔ لباس دیہاتی طرز کا لیکن قیمتی تھا۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ کمرے میں صرف میں، عمران اور جمیل موجود تھے۔ چودھرائن ہم دونوں کی پروا کئے بغیر زمین پر بیٹھ گئی اور عمران کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عمران نے جلدی سے چودھرائن کو اپنے پاؤں پر سے اٹھایا اور کوشش کر کے صوفے پر بٹھایا۔

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "عمو پتر...... خدا کے واسطے ہمیں ماف کر دو۔ ہم نے تمہیں بڑے دکھ دیئے ہیں۔ ہم کو انہی کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ میرا پتر جھلا ہو گیا ہے۔ وہ کسی کام جوگا نہیں رہا۔ دن رات کمرے میں بند رہتا ہے۔ کھڑکیاں دروازے بھی نہیں کھولتا۔ اس کا جینا حرام ہو گیا ہے پتر...... تُو ہمیں ماف کر دے۔ شاید اسی طرح اس کی مشکل آسان ہو۔"

عمران خاموش کھڑا تھا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ وہ فوراً چودھرائن کی اشک شوئی کرے گا اور نیازے کو معاف کرنے کی بات کرے گا۔ عمران کے چہرے سے اس کے دلی

جذبات کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے اندرونی کرب کے اثرات اس کے چہرے پر بھی تھے۔

چودھرائن نے اپنی گرم شال کے پلو سے اپنا تر بتر چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں مانتی ہوں عمو پتر! ہم نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں...... پہلے تمہاری ماں کو تم سے دور کیا پھر تمہاری منگ بھی تم سے چھڑا دی۔ یہ ظلم شاید پہلے ظلم سے بھی بڑا تھا...... اس دکھ نے تمہیں بالکل اجاڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے سارے قصور مانتی ہوں پتر! تیرے سسرال والے تیرے بارے میں سن گن لینے کے لئے ہمارے پاس ہی آئے تھے۔ ہماری حویلی میں آئے تھے۔ اللہ بخشے نیازے کے پیو نے انہیں ڈرا دیا۔ ان سے کہا کہ عمو پر سایہ ہے۔ عاملوں نے کہا ہے کہ بجلی اس کی ویری ہے۔ وہ چھپ چھپا کر رہتا ہے۔ ہماری ان باتوں نے تمہیں اجاڑ دیا پتر...... وہ کُڑی بھی مر گئی...... اس کی قبر بن گئی۔ اس سارے ظلم میں ہم حصے دار ہیں پتر...... ہم حصے دار ہیں۔ خدا کے واسطے ہمیں ماف کر دو۔ میرے نیازے کی جان بچا لو......" وہ ایک بار پھر عمران کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں تھام لئے۔ عمران نے اسے دوبارہ اٹھایا۔

وہ روتی رہی، بلکتی رہی۔ اپنے ایک ایک گناہ کا اعتراف کرتی رہی۔ اس نے یہ مانا کہ وہ اپنے اکلوتے بچے کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے عمران کو مشکلوں کی آگ میں پھینک دیا...... اور آج اس کا پھل یہ ملا ہے کہ اس کا بیٹا موت کے منہ میں ہے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا کہ اس کے بیٹے کو سینے کی کوئی بیماری ہے۔

اسی دوران میں تھانوی صاحب بھی اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر چودھرائن ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ دہائی دینے لگی۔ "پیر جی...... آپ سفارش کریں۔ آپ عمو سے کہیں ہمیں ماف کر دے۔"

پیر صاحب نے چودھرائن کو ڈانٹا اور اسے کہا کہ وہ ان کے پاؤں سے اٹھ جائے۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر...... تھانوی صاحب نے نرم لہجہ اختیار کیا اور اسے تسلی دی کہ عمران ان کے ساتھ وہ نہیں کرے گا جو انہوں نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ وہ انہیں معاف کر دے گا اور اس کی معافی ان شاء اللہ نیازے کو ٹھیک ہونے میں بھی بہت مدد دے گی۔

چودھرائن سسکیاں لیتی رہی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ میں سوچنے لگا، انسان جب طاقت اور اختیار کے نشے میں سرشار ہوتا ہے تو فرعون اور شداد جیسے

جابروں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے لیکن جب حالات کی چکی میں پستا ہے تو ذرے سے حقیر نظر آتا ہے۔

کچھ دیر بعد احمد تھانوی صاحب کے کہنے پر چودھرائن نے بتانا شروع کیا کہ پیر صادق شاہ نے کس طرح نیاز کو اور باقی گھر والوں کو اپنی باتوں میں جکڑا...... کیسے ان کے دلوں میں ایک جان لیوا خوف کی بنیاد رکھی اور پھر کس کس طرح اس خوف کو بڑھاوا دیا۔ یہاں تک کہ چودھرائن اپنے بیٹے اور اس کے بچوں کی خاطر صادق شاہ کے شکنجے میں جکڑتی چلی گئی۔ چودھرائن کے پاس زیورات کی شکل میں ڈھائی تین کلو سے کم سونا نہیں تھا۔ نیازے کے علاج کے سلسلے میں وہ اپنا قریباً آدھا زیور وقتاً فوقتاً صادق شاہ کو دے چکی تھی...... اس کے علاوہ کچھ اراضی بھی تھی......

عمران نے چودھرائن کی ساری گفتگو سنی۔ آخر میں اس نے پوچھا۔ ''چاچی! میری ماں کے بارے میں کوئی خیر خبر نہیں تمہارے پاس؟''

چودھرائن نے نفی میں سر ہلایا اور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ''پیر صاحب کی دعا سے اب میں پنج وقت کی نماز پڑھنے لگی ہوں۔ میں ہر نماز کے بعد رب سے دعا کرتی ہوں کہ ہمیں بھین شریفاں کا کوئی پتا چلے۔ ہم اس کے پاؤں میں گر کر معافی مانگیں۔ پتا نہیں یہ دعا کب قبول ہوگی۔''

عمران نے کہا۔ ''چاچی! تُو پچھلے چند مہینے سے جس طرح اپنے پُتّر کے لئے تڑپ رہی ہے، میری ماں پچھلے دس سال سے اسی طرح تڑپ رہی ہوگی۔ کیا کبھی تم نے سوچا ہے اس بارے میں کہ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

وہ ایک بار پھر دوپٹے میں منہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔

بارش تھم گئی تھی...... تھانوی صاحب کے عقیدت مند اب جانا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کوٹھی کے سامنے سڑک پر قطار میں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کچھ گاڑیاں اسٹارٹ ہو رہی تھیں۔ موٹر سائیکلوں وغیرہ پر آئے ہوئے لوگ بھی نکل رہے تھے۔ ایک چادر پوش لڑکی رکشے والے کو ہاتھ کے اشارے سے روک رہی تھی رکشا رک گیا۔ جب وہ اندر بیٹھنے کے لئے ذرا سا گھومی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا...... اور اپنی جگہ سے بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ چ[illegible] دیکھا بھالا تھا۔ یہ قد کاٹھ، یہ حلیہ...... یہ ثروت کی چھوٹی بہن نصرت تھی...... جو ثروت [illegible] ساتھ ہی جرمنی چلی گئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں وہ چند سیکنڈ کے

لئے مجھے پوری کی پوری دکھائی دی پھر رکشے میں اوجھل ہو گئی۔ میں تڑپ کر کھڑکی تک پہنچا۔ ایک بار لیش مرید میرا دھکا لگنے سے دور جا گرا تھا۔ میں کھڑکی سے منہ نکال کر دیوانہ وار چلایا...... رکو...... رک جاؤ۔''

تب تک رکشا سڑک کے موڑ پر اوجھل ہو چکا تھا۔ ''عمران آؤ۔'' میں بلند آواز سے بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے باہر گیراج میں آئے۔ عمران جان چکا تھا کہ میں نے کسی کو دیکھا ہے اور اب اس کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے لپک کر موٹر سائیکل سنبھالی۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ تین چار ککس سے پہلے اسٹارٹ نہیں ہو سکی۔ ہمارا انداز دیکھ کر اردگرد کے سارے لوگ ٹھٹکے ہوئے تھے۔ جونہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی، ہم طوفانی انداز میں احمد تھانوی صاحب کی کوٹھی سے نکلے۔

''کدھر؟'' عمران نے پوچھا۔

''رکشے کے پیچھے۔ ابھی دائیں طرف مڑا ہے۔ نیلے رنگ کا ہے۔''

''سارے رکشے نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ نمبر دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

عمران نے سڑک پر پھسلن کی پروا کئے بغیر خطرناک رفتار سے موٹر سائیکل کو دائیں طرف موڑا۔ رکشا قریباً سو میٹر سڑک کے موڑ پر اوجھل ہوتا دکھائی دیا۔ عمران ایکسلریٹر کو گھماتا چلا گیا۔ جب ہم موڑ پر پہنچے تو رکشا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ قریباً دو سو میٹر آگے جا کر ہم سٹپٹا گئے۔ یہ ایک چوراہا تھا۔ تین اطراف میں خم دار سڑکیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ عمران نے اندازے سے ایک سڑک پر موٹر سائیکل ڈال دی۔

ہم قریباً پانچ منٹ تک اِدھر اُدھر چکرائے مگر مطلوبہ رکشے کا کھوج نہیں ملا۔ آخر ہم رک گئے۔ اس دس منٹ کی بھاگ دوڑ کے دوران میں میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنی کنپٹیوں میں محسوس کیا تھا۔ ''کون تھا رکشے میں؟'' عمران نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''پورے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا عمران...... لیکن نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ رکشے میں ثروت کی چھوٹی بہن نصرت بیٹھ کر گئی ہے۔''

''یار! تمہیں وہم ہوا ہوگا۔ آج کل تمہارے ذہن میں رات دن یہی باتیں گردش کر رہی ہیں۔ ایسی کیفیت میں اس طرح کے ''نظری دھوکے'' ہوتے ہیں۔''

''لیکن یہ ایسی ناممکن بات تو نہیں ہے عمران! ہمارے پاس ثبوت ہے کہ چار پانچ مہینے

پہلے تک ثروت یہاں پاکستان میں موجود تھی اور عین ممکن ہے کہ اب بھی ہو۔ اگر ثروت یہاں ہوسکتی ہے تو نصرت بھی ہوسکتی ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ ناصر بھائی بھی ہوں......"

"تم نے کب دیکھا ثروت کی بہن کو؟"

"جب وہ رکشے میں بیٹھ رہی تھی۔ وہاں مرکری اسٹریٹ لائٹ ہے۔ مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں واپس تھانوی صاحب کے پاس چلنا چاہئے۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ بتا سکتے ہیں۔"

ہم واپس شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے...... تھانوی صاحب کے بیشتر عقیدت منداور مریض رخصت ہو چکے تھے۔ تھانوی صاحب کے دو مرید اور عمران کا محلے دار جمیل پریشان سے گیراج میں کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھا تو وہ لپک کر ہمارے پاس آئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم یوں آناً فاناً کس کے پیچھے گئے تھے۔

ہم نے ان لوگوں کو تو کچھ نہیں بتایا تاہم تھانوی صاحب کے سامنے ساری بات کھول دی۔ تھانوی صاحب نے سب کچھ توجہ سے سنا۔ آخر میں بولے۔ "میں نے آج تقریباً پچیس تیس مریضوں کو دیکھا ہے۔ ان میں آٹھ دس عورتیں بھی تھیں۔ اکثر بیبیاں اپنا نام بتا دیتی ہیں لیکن ان میں نصرت کا نام تو میرے سامنے نہیں آیا۔ لڑکی کا لباس کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "جہاں تک میں نے دیکھا ہے، اس نے گلابی رنگ کی کڑھائی دار شال لے رکھی تھی۔ سویٹر شاید سفید تھا۔"

تھانوی صاحب نے اپنے مرید خاص فرید کو آواز دی۔ "فرید! اندر آؤ۔"

درمیانی عمر کا ایک باریش شخص دست بستہ اندر داخل ہوا اور مؤدب کھڑا ہو گیا......

تھانوی صاحب نے پوچھا۔ "آج نصرت نام کی ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس نے گلابی شال اور سفید سویٹر پہن رکھا تھا شاید۔"

فرید نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی حضرت! گلابی شال والی ایک بی بی، عورتوں والے حصے میں بیٹھی ہوئی تو تھی لیکن میرا خیال ہے کہ آج اس کی باری نہیں آئی۔ جو آخری ٹوکن نمبر میں نے آپ کے پاس بھیجا، وہ تیس تھا۔ اس کے بعد بھی دس بارہ ٹوکن اور تھے لیکن پھر آپ کے مہمان آ گئے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

فرید الٹے پاؤں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھانوی صاحب نے کہا۔ "اگر آج اس کی باری نہیں آئی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کل آئے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے

کہ یہاں اس سے تم دونوں کی ملاقات ضرور ہوگی۔"

اگلے اٹھارہ گھنٹے میں نے اور کسی حد تک عمران نے بھی بے حد بے چینی میں گزارے۔ یہ احساس بے حد سنسنی خیز اور صبر آزما تھا کہ ثروت جرمنی میں نہیں بلکہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ وہ جس کے لئے میں پل پل تڑپا تھا جس کو میں کبھی بھی بھولا نہیں تھا۔ نہ اپنی خود فراموشی کے اندھیروں میں، نہ نل پانی کے ہنگاموں میں، نہ زرگاں کی قتل گاہوں میں...... جوں جوں صبح ہوئی تھی، جوں جوں دن ڈھلا تھا، جوں جوں رات نے آنچل پھیلایا تھا، میں نے اسے یاد کیا تھا۔ اس سے ملنے کی آرزو کی تھی...... اس رات میں بالو کو دیر تک گود میں اٹھائے کوٹھی کے پائیں باغ میں گھومتا رہا۔ اس کے نرم گال چومتا رہا۔ یہ بالو جیسے میرے لئے ماضی اور مستقبل کا سنگم تھا۔ بالو کے ایک طرف سلطانہ کی یادیں تھیں اور دوسری طرف ثروت کی۔

میڈم صفورا اپنی لال کوٹھیوں میں واپس جا چکی تھی۔ اقبال بھی جا چکا تھا۔ تاہم نوری اور صفیہ یہیں پر تھیں۔ شاہین کا بھائی ظفر اپنے ہاسٹل چلا گیا تھا۔ شاہین بھی جانا چاہتی تھی مگر عمران نے اسے جانے نہیں دیا۔ میری توقع کے عین مطابق عمران نے کرائے کا وہ گھر خالی کر دیا تھا جہاں شاہین اور ظفر احمد ہماری آمد سے پہلے رہ رہے تھے۔ جیلانی کے ذریعے شاہین اور ظفر کا سارا سامان بھی یہیں پر منگوا لیا گیا تھا۔ اب یہاں دن میں کئی بار عمران اور شاہین کی نوک جھونک دیکھنے کو ملتی تھی۔

اگلے روز میں اور عمران دوپہر ایک بجے ہی پیر احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ چودھرائن اور اس کے بیٹے نیازے سے بھی مختصر ملاقات ہوئی۔ چودھرائن ہم دونوں کے سامنے اور خاص طور سے عمران کے سامنے بچھ بچھ جا رہی تھی۔ کل والے واقعات کے بعد نیازے کی حالت کچھ بہتر لگتی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا دو تین تکیوں کے سہارے بیٹھا گندم کا دلیا کھا رہا تھا۔ اس نے عمران سے نظر نہیں ملائی...... ہم جب تک وہاں رہے، وہ کچھ بولا اور نہ ہی اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی چھاتی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کئی ایلو پیتھک دوائیں قریبی میز پر پڑی تھیں۔

دوسرے کمرے میں آ کر میں نے عمران سے پوچھا۔ "یار! اس نیازے کی بیماری ہے کیا؟ کل تم نے کینسر کی بات کی تھی۔ چھاتی کا کینسر وغیرہ تو پھیپھڑوں میں ہوتا ہے نا۔ اس نے چھاتی کے اوپر پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "یہ چھاتی کے اندر کا نہیں پستان کا کینسر ہے...... یہ بریسٹ کینسر عام

طور پر عورتوں میں ہوتا ہے لیکن شاذ و نادر کوئی ایسا کیس بھی ہوتا ہے جس میں مریض "مرد" ہوتا ہے۔ یہ نیاز ابھی اسی تکلیف کا شکار ہوا ہے۔ پیر صادق شاہ کے چکروں میں رہتا تو شاید اب تک عدم آباد کی تیاری شروع کر دیتا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ یہاں احمد تھانوی صاحب کے پاس آ گیا۔ انہوں نے روحانی علاج کے ساتھ ساتھ اس کا ڈاکٹری علاج بھی شروع کرایا۔ اب اس حوالے سے یہ کافی بہتر ہے۔"

احمد تھانوی صاحب ظہر اور مغرب کے درمیانی وقت میں اپنے عقیدت مندوں اور مریضوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ انہیں وظائف بتاتے...... نماز، روزے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے پاس حکمت کے حوالے سے کچھ مجرب نسخے بھی تھے جو وہ اپنے خاص مریضوں کو استعمال کراتے تھے۔ تاہم اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہوتا تھا کہ فلاں مریض کو مناسب ڈاکٹری علاج کی ضرورت ہے تو وہ فوراً اسے کسی ڈاکٹر کی طرف "ریفر" کر دیتے تھے۔

مریض اور عقیدت مند آنے شروع ہو گئے تھے۔ ہم بہت بے قراری سے منتظر رہے لیکن جس کو نہیں آنا تھا، وہ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ مغرب ہو گئی اور لوگ واپس جانا شروع ہو گئے۔ مایوسی کا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ جس کے بغیر جیسے تیسے چار برس گزار دیئے تھے، اب اس کے بغیر گھڑیاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

اگلے روز بھی یہی ہوا۔ میں اور عمران بارہ بجے ہی احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور ہم بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ پروگرام یہی تھا کہ اگر وہ آ گئی اور وہ نصرت ہی ہوئی تو ہم اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔ ہاں، احمد تھانوی صاحب رسمی انداز میں اس کا پتا ٹھکانا پوچھ لیں گے۔ جب وہ یہاں سے واپس جائے گی تو ہم اس کا پیچھا کریں گے۔ لیکن یہ سب تو تب ہوتا جب وہ آتی۔ اور اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

وہ رات بھی عالم بے قراری میں گزری۔ رات کے کھانے کے بعد میں اکیلا ہی باغیچے میں ٹہلتا رہا اور ثروت کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان گنت سوالات ذہن میں کلبلاتے تھے۔ کیا وہ ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہوگی؟ کیا اس نے شادی کر لی ہوگی؟ کیا اس کے دل میں اب بھی میری چاہت ہوگی؟ میں بالو کے بارے میں اسے کیا بتاؤں گا؟ سلطانہ کا ذکر کس طرح کروں گا؟

مجھے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو فرح تھی۔ اس نے بالو کو اٹھایا ہوا تھا۔ بالو مجھے دیکھ کر ہمکنے لگا۔ میں نے اسے پیار کیا اور اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

فرح میرے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگی۔ "بھائی جان! آپ پریشان ہیں۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ آپ بتاتے کیوں نہیں؟"

میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور فرح کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "تُو ہمیشہ کی طرح وہمی ہے۔ کسی نہ کسی مسئلے کی کھوج میں رہتی ہے۔"

"نہیں بھائی جان...... میرا دل کہتا ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ کل عاطف بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اسے ڈر ہے کہ شاید آپ نے سیٹھ سراج سے الجھنا شروع کر دیا ہے۔ کیا واقعی ایسی بات ہے؟"

"نہیں فرح! تم دور دراز کے اندیشوں کو دل میں جگہ دے رہے ہو۔ سیٹھ سراج کا تو ابھی کوئی کھوج کھرا ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہ وہ خبیث پاکستان میں ہے بھی یا نہیں۔"

"عاطف کہہ رہا تھا کہ عمران بھائی، شاہین باجی کو اس لئے یہاں لے کر آئے ہیں کہ انہیں سیٹھ سراج کی طرف سے کوئی خطرہ تھا۔ اب وہ بھی میری اور عاطف کی طرح اس چار دیواری میں رہنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فرحی! مجھے لگتا ہے تیرے اندر کسی اسی نوے سالہ بڑھیا کی روح گھس گئی ہے جو تجھے ہر وقت فکروں میں مبتلا رکھتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ "بھائی جان! میرا دل چاہتا ہے کہ ہم سب پھر سے پہلے کی طرح ہو جائیں۔ ہماری کسی سے دشمنی ہو اور نہ زیادہ دوستی ہو۔ کہیں کسی انجان جگہ پر ایک چھوٹا سا گھر ہو...... جہاں ہم سکون سے رہیں۔ عاطف اپنی پڑھائی مکمل کرے...... آپ کہیں سروس کریں اور...... اور......"

"...... تمہاری شادی ہو جائے۔" میں نے اس کی بات اچکی۔

"نہیں بھائی جان۔" وہ ٹھٹکی۔ "آپ شادی کریں۔ ہمارے گھر میں رونق آئے۔ ہماری اداسیاں دور ہوں۔"

وہ، رات کی رانی کے ایک پودے کے پاس کھڑی ہو گئی اور اس کے پھولوں پر نزاکت سے انگلیاں چلانے لگی۔ میں اس معصوم، بے خبر لڑکی کو کیسے بتاتا کہ وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ وہ جس خوشبودار زندگی کے سپنے دیکھ رہی ہے، وہ کچھ سانپ صفت لوگوں کی وجہ سے زہریلی ہو چکی ہے۔ اور یہ ایسا زہر ہے جس کا تریاق آسانی سے ملنے والا نہیں۔ وہ بے خبر کیا جانتی تھی کہ وہ اب بھی جس جگہ کھڑی پھولوں کو سہلا رہی ہے، وہاں چند دن پہلے ہم نے ایک لاش دبائی ہے۔ وہ چھیدے کے مدفن کے عین اوپر کھڑی تھی۔ میں

نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کا سر چوم کر کہا۔ ’’فرحی! وہی ہوگا جو تم اور عاطف چاہتے ہو...... لیکن اس کے لئے تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا......‘‘

اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میں نے شاہین کو دیکھا۔ اس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور وہ مرے مرے قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ فرح نے بھی اسے دیکھ لیا۔ میں نے کہا۔ ’’لگتا ہے کہ آج پھر عمران سے اس کی لڑائی ہوئی ہے۔‘‘

اتنے میں عمران بھی نظر آ گیا۔ وہ شاہین کے پیچھے گیا۔ وہی کھلنڈرا سا جانا پہچانا انداز تھا، اس کا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کالی سی چیز تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی چرمی تھیلا وغیرہ ہے۔ اس نے شاہین کو آواز دی۔ پھر اس کے قریب پہنچ کر یہ کالی سی شے اس کے سامنے پھینک دی۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہ ایک کالی بلی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے گزر کر درختوں میں اوجھل ہوگئی۔

ہم عمران اور شاہین کے پاس پہنچے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ’’دیکھو، یہ بالکل اچھا شگون نہیں ہے۔ کالی بلی تمہارے سامنے سے گزر گئی ہے۔ اب تو تمہیں بالکل بھی نہیں جانا چاہئے۔ اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہوگیا ہے تو صبح میں تمہیں خود چھوڑ کر آؤں گا۔‘‘

وہ تنک کر بولی۔ ’’اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے ابھی جانا ہے۔‘‘

’’لیکن بلی؟‘‘

میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ ’’بلی تم نے خود چھوڑی ہے عمران! اور جان بوجھ کر شاہین کے سامنے پھینکی ہے۔ کم از کم اس بھونڈی دلیل کے ذریعے تو تم شاہین کو نہیں روک سکتے۔‘‘

وہ بولا۔ ’’لیکن یار! یہ بھی تو دیکھو کہ بلی کسی اور طرف بھی بھاگ سکتی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے ہو کر نکلی ہے۔ اسی کو شگون کہتے ہیں۔‘‘

’’اسے بے ہودگی کہتے ہیں اور مجھ سے یہ بے ہودگیاں اور برداشت نہیں ہوتیں۔‘‘ شاہین نے کہا۔ وہ واقعی آزردہ تھی۔

’’اب کیا کیا ہے اس نے؟‘‘ میں نے شاہین سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی اور چھوٹی سی ناک سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

عمران بولا۔ ’’یار! بات بس اتنی سی ہے، میں نے کہہ دیا کہ شادی کے لئے لڑکیوں کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اب اسے شادی کر لینی چاہئے بلکہ میں نے اس کام کو مزید آسان بھی کر دیا ہے۔ ایک بڑا اچھا ’’لڑکندہ‘‘ ڈھونڈا ہے اس کے لئے۔‘‘

’’لڑکندہ کیا ہوتا ہے؟‘‘ فرح نے پوچھا۔

’’لڑکے اور بندے کی جمع ہے یہ۔ یعنی درمیانی عمر کا مرد۔ اچھا بھلا اسمارٹ ہے۔ ایک چینل میں اینکری بھی کرتا ہے۔ اوپر نیچے کی اچھی کمائی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے کہ بھلکڑ ہے۔ اتنا بھلکڑ کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ کئی دفعہ تو ٹاک شو کے دوران میں بریک لیتا ہے اور پھر واپس آنا ہی بھول جاتا ہے۔ قریب ہی اس کا گھر ہے...... گھر چلا جاتا ہے۔ پون گھنٹا اشتہار چلتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک اسے یاد آتا ہے کہ واپس بھی آنا تھا۔ تب تک ٹائم ختم ہو چکا ہوتا ہے...... اسکرین پر آ کر وہی گھسا پٹا فقرہ بولتا ہے۔ ناظرین! وقت کم تھا اور موضوع بہت وسیع تھا...... بہت ہی زیادہ وسیع تھا...... ہم نے اسے زیادہ چھیڑا ہی نہیں۔ اب آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ خدا حافظ۔ اب سوچو تابی! ایسا بھلکڑ شوہر کہیں مل سکتا ہے؟‘‘

’’تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بھلکڑ شوہر بیوی کے لئے بہت بڑی نعمت خداوندی ہوتا ہے۔ اللہ کے بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ جیب میں کتنے پیسے تھے۔ کتنے نکلے اور کتنے رہ گئے۔ جمعرات کو ہونے والی بے عزتی جمعے کو بھول جاتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ لڑکندہ بڑا آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ٹاک شو میں ایک تاریخی جملہ بول گیا۔ کہنے لگا...... آج کل ٹی وی ڈراموں میں اتنی عورتیں ہوتی ہیں کہ میں دیکھ دیکھ کر ’’سوچتی‘‘ ہوں کیا دنیا میں بس عورتیں ہی رہ گئی ہیں...... اندازہ لگاؤ۔ عورتوں کے بارے میں بات کرتے کرتے اپنی جنس بھی بھول گیا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’اگر اتنا بھلکڑ ہے تو کچھ اور بھی نہ بھول رہا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں بچے وچے نہ ہوں اس کے۔‘‘

’’یار! تم ہر بات کا منفی پہلو لیتے ہو۔ تم ضرور کسی بڑے چینل کو جوائن کرو گے۔‘‘

’’چلو، جو بھی ہے لیکن تم دانستہ کالی بلی شاہین کے سامنے سے گزار کر اسے روک نہیں سکتے۔ اس کے لئے تمہیں معافی مانگنی پڑے گی۔‘‘

’’معافی تو میں ہرگز نہیں مانگوں گا۔‘‘ وہ اکڑ کر بولا۔ ’’ہاں، کہو تو ہاتھ وغیرہ جوڑ دیتا ہوں۔‘‘ آخری الفاظ اس نے مسکین لہجے میں کہے۔

پھر واقعی اس نے بڑی دل جمعی کے ساتھ شاہین سے معافی تلافی کی۔ یہاں تک کہ وہ بے ساختہ مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔

فرح نے کہا۔ ’’بھائی جان! باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہیں کہ اب شاہین باجی کے

سامنے سے کبھی کالی بلی نہیں گزاریں گے۔''

اس نے جھٹ شاہین کے کانوں کو ہاتھ لگائے اور فقرہ دہرایا۔

شاہین اپنے کان چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''اور اپنی نظر بھی ٹیسٹ کرواؤ جناب عمران صاحب! یہ شگون جو تم بتا رہے ہو کالی بلی کے لئے بنا ہوا ہے۔ کالے بلے کے لئے نہیں۔ جو آپ نے میرے سامنے سے زبردستی گزارا، وہ کالا بلا تھا۔''

''ہائیں، بلا تھا؟ نہیں نہیں یار۔''

اسی دوران میں وہ ''کالی بلی'' پھر سے چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر نکل آئی۔ ہم نے دھیان سے دیکھا، وہ واقعی بلا تھا۔ عمران نے کانوں کو ہاتھ لگا کر میری طرف دیکھا۔ ''دیکھو جگر! تم میری پرستاروں ریما اور نرگس کو یونہی بدنام کرتے ہو۔ آج کل تو ہر لڑکی طوفان ہے۔ اتنی تیز نظریں ہیں ان لڑکیوں کی کہ ایک سیکنڈ میں زنانہ، مردانہ صفتوں کا پوسٹ مارٹم کر لیتی ہیں۔''

شاہین شولڈر بیگ پکڑ کر اس پر جھپٹی۔ وہ چھلاوے کی طرح برآمدے کی طرف نکل گیا۔

...... اگلے روز ہم پھر بارہ بجے کے قریب پیر احمد تھانوی صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج عمران نے ایک مہران کار کا بندوبست بھی کیا تھا۔ ''کار پر جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یار! کار پر تم جاؤ گے۔ میں موٹر سائیکل پر رہوں گا۔''

''وہ کیوں؟''

''ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہئے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر وہ لڑکی آ جاتی ہے تو ہم دونوں اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر کوئی ایک اسے مس بھی کر دے تو دوسرا تو پیچھے لگا رہے۔''

''لیکن ہو سکتا ہے کہ احمد تھانوی صاحب ہی اس سے سارا پتا ٹھکانا پوچھ لیں۔''

''دیکھو، جس فقرے میں ''ہو سکتا ہے'' آئے، اس پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔''

اس دن ہم علیحدہ علیحدہ سواری پر احمد تانوی صاحب کے گھر پہنچے اور اس روز ہم کامیاب بھی رہے۔ تین بجے کے قریب ایک رکشا کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے رکا اور اس میں سے اسی دن والی چادر پوش لڑکی اتری۔ اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے پلو میں چھپا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نصرت ہی تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ پہلے سے ذرا بھر چکا تھا۔ بہرحال، میں اسے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دوڑ کر نصرت کے پاس پہنچوں۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑوں اور پوچھوں کہ بتاؤ

ثروت کہاں ہے؟

لیکن میں جانتا تھا، مجھے صبر کرنا ہے۔ نصرت سے براہِ راست بات کرنے سے پہلے ہم جتنا بھی جان سکتے، وہ ہمارے لئے بہتر تھا۔

پانچ بجے کے لگ بھگ نصرت کی ملاقات احمد تھانوی صاحب کے ساتھ ہوئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ واپس چل دی۔ حسبِ سابق اس نے ایک رکشے کا انتخاب کیا تھا۔ رکشا روانہ ہوا تو ہم دونوں مناسب فاصلے سے اس کے تعاقب میں تھے۔ عمران موٹر سائیکل پر آگے تھا، میں کار میں تھوڑا سا پیچھے تھا۔

رکشا مختلف سڑکوں سے گزر کر گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں آیا اور پھر ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رک گیا۔ نصرت اتری اور کرایہ ادا کر کے اندر چلی گئی۔ ہم تھوڑا آگے جا کر سروس روڈ پر کھڑے ہو گئے۔

عمران موٹر سائیکل چھوڑ کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ ''نیم پلیٹ پڑھی ہے تم نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں کسی جمشید ناگی کے نام کی تھی۔''

''یہ ناگی صاحب کون ہو سکتے ہیں؟''

''اللہ جانے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مالک مکان کا نام ہو۔'' میرے ذہن میں مختلف سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ یہ ناگی صاحب کون ہیں؟ کیا یہاں ثروت سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ کیا بھائی ناصر سے یہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟

ہمیں وہاں کھڑے قریباً پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک سوزوکی سوئفٹ کوٹھی میں سے نکلی۔ سوزوکی کار کو جو ادھیڑ عمر شخص چلا رہا تھا، وہ شکل وصورت سے ڈرائیور ہی لگتا تھا۔ پچھلی نشست پر ایک اکیلی خاتون بیٹھی تھی۔ ہمیں فقط اس کے ہلکے براؤن لباس کی جھلک دکھائی دی۔ جب گاڑی ٹرن لے کر ہماری طرف آئی اور ہمارے پاس سے گزری تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پچھلی نشست پر خاتون نہیں، ایک جواں سال لڑکی بیٹھی تھی...... اور وہ کوئی اور نہیں ثروت تھی۔ وہ سو فیصد ثروت تھی۔ میری نظریں اس کے بارے میں دھوکا کھا ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں نے اپنا چہرہ اخبار کی اوٹ میں کر رکھا تھا، ویسے بھی ثروت نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

جونہی سفید سوزوکی کار آگے نکلی، میں نے اخبار نیچے رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور پیچھے روانہ ہو گیا۔ ''اوئے میری موٹر سائیکل۔'' عمران پکارا۔

"بھاڑ میں جائے موٹر سائیکل۔" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

"کون تھی؟"

"ثروت۔" میں نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف اور مہران کو سوفٹ کار کے پیچھے ڈال دیا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ قریباً دس منٹ میں ہم گلبرگ کی لبرٹی مارکیٹ میں آ گئے۔ گاڑی ایک شاپنگ مال کے عین سامنے پارک ہوئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر عقبی دروازہ کھولا اور ثروت باہر نکل کر شاپنگ مال میں داخل ہو گئی...... وہ ہمیشہ کی طرح بالکل سادہ لباس میں تھی۔ چہرہ بھی میک اَپ سے خالی تھا لیکن اس کی اندرونی خوب صورتی اور کشش اس کے چہرے پر روشنی بن کر بکھری ہوئی تھی۔ یہ میرے جانے پہچانے خدوخال تھے۔ یہ میری جانی پہچانی چال ڈھال تھی۔

"بھئی واہ! ان کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔" عمران نے بے تکلفی سے کہا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہیں بیٹھتا ہوں۔ تم جاؤ محترمہ کے پیچھے۔" عمران نے کہا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکلا اور ثروت کے پیچھے چل دیا۔ پچھلے تین چار برسوں نے مجھے بہت بدلا تھا۔ میں اب کوئی کمزور شخص نہیں رہا تھا۔ خاص طور سے عمران کے ساتھ اور پھر زرگاں میں ہونے والی مار دھاڑ نے میری پوری کیمسٹری ہی تبدیل کر دی تھی۔ پھر بھی آج یوں ثروت کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اور اب اس کے پیچھے آتے ہوئے مجھے اپنے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔

ثروت فرسٹ فلور پر پہنچی اور گارمنٹس وغیرہ دیکھنے لگی۔ اس دوران میں اس نے ایک چھوٹی سی موبائل کال بھی سنی۔ میں اس سے اپنا فاصلہ کم کرتا گیا اور بالکل قریب پہنچ گیا۔ ایک کاؤنٹر سے واپس مڑتے ہوئے اس نے رخ پھیرا تو میں اس کے سامنے تھا۔ چند لمحے کے لئے تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خالی پن کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ لیکن پھر دنیا جہان کی حیرت اور سنسنی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ چند لمحے کے لئے یوں لگا جیسے وہ ایک دم اجنبیوں کی طرح گھومے گی اور دوسری طرف نکل جائے گی۔ لیکن میں اتنا پاس تھا اور وہ اس قدر وضاحت سے مجھے دیکھ چکی تھی کہ نظریں چرا لینا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ چار پانچ سیکنڈ کے اندر اس کے خوبرو چہرے پر کئی رنگ آئے...... آخری رنگ آنسوؤں کا تھا۔ یہ آنسو اس کی جھیل آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

"ہیلو ثروت!" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ میری آواز میں صدیوں کا کرب سمٹ آیا تھا۔

"ہیلو۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور سر جھکا لیا۔ دو چمکیلے قطرے اس کے سیاہ شولڈر بیگ پر گرے۔

"کیسی ہو ثروت؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے عجیب آواز میں کہا۔

"اپنی نظروں پر بھروسا نہیں ہو رہا...... کیا میں واقعی تمہیں دیکھ رہا ہوں؟" وہ کچھ نہیں بولی۔ بس جھکی پلکوں اور لرزاں جسم کے ساتھ کھڑی رہی۔

"ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے اسکرین پر ایک نظر ڈال کر کال منقطع کر دی۔

"ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے متوحش نظروں سے اردگرد دیکھا اور بولی۔ "نہیں، میرے ساتھ کوئی ہے۔"

"تو پھر کب؟"

"یہ سب مشکل ہے۔" اس کی آواز میں کرب سمٹ آیا۔

"کیا...... تم...... بات بھی نہیں کرو گی؟" میری آواز ٹوٹنے لگی۔

وہ چند سیکنڈ تک جیسے فیصلے کی سولی پر لٹکتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ "آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔ میں آپ کو کال کر کے بتاؤں گی۔"

میں نے اسے نمبر دیا جو اس نے لرزاں انگلیوں سے اپنے موبائل میں ایڈ کر لیا......

"کیا تم اپنا نمبر نہیں دو گی؟"

"نہیں، میں خود کال کروں گی۔"

"کتنا انتظار کرنا ہو گا؟" میری آواز بھرا گئی۔

"ایک دو دن تک۔" اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ سینے میں دھڑکن کی گونج تھی۔ کچھ دیر کے لئے مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں ایک ٹین ایجر ہوں اور پہلی بار کسی لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

دو تین روز انتہائی بے چینی میں گزرے۔ میری نگاہ ہر وقت اپنے سیل فون پر رہتی تھی۔ کوئی ایس ایم ایس آتا، کوئی فون کال آتی تو میں بے طرح چونک جاتا۔ پھر مایوسی ایک سرد لہر

بن کر رگ وپے میں اتر جاتی۔ بہت سے اندیشے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں وہ پھر پہلے کی طرح اچانک اوجھل تو نہیں ہو جائے گی؟ تیسرے روز مجھے محسوس ہونے لگا کہ شاید میں نے ثروت کی بات پر بھروسا کر کے غلطی کی ہے۔ وہ کبھی مجھ سے رابطہ نہیں کرے گی...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آناً فاناً اپنے گارڈن ٹاؤن والے ٹھکانے سے بھی لاپتا ہو جائے۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت ثروت کی کال آ گئی۔ یہ کسی پی سی او کا نمبر تھا۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے اس کی جاں فزا آواز سنائی دی۔ ''ہیلو تابش! میں ثروت بول رہی ہوں۔''

''بہت انتظار کروایا تم نے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ میری بات اور میرے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''رائے ونڈ روڈ پر۔''

''اقبال ٹاؤن میں سپر کافی شاپ پر آ سکتے ہیں؟''

''آ سکتا ہوں۔ کب تک پہنچوں؟''

''اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ آپ ٹھیک ڈھائی بجے پہنچ جائیں۔''

جونہی گفتگو ختم ہوئی، میں نے عمران کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پروگرام بنا کہ عمران میرے ساتھ جائے گا لیکن ثروت کے سامنے نہیں آئے گا۔ بس میرے آس پاس موجود رہے گا۔ ہم پندرہ منٹ بعد ہی روانہ ہو گئے۔ عمران موٹر سائیکل پر تھا جبکہ میں گاڑی میں۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کر رہی تھیں اور اس سے کئی گنا رفتار کے ساتھ میرا دل حرکت کر رہا تھا۔ پردۂ غیب سے جو کچھ ظہور میں آنے والا تھا، وہ میرے لئے بے حد اہم تھا۔ اسی پر میری آئندہ زندگی کا دارومدار تھا۔ جو کچھ بھی تھا، دل سے ایک گواہی بار بار آ رہی تھی۔ وہ اب بھی مجھے پیار کرتی ہے۔ جس طرح میں نے اس کی یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے، اس کے دل میں بھی میری یادیں موجود ہیں۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں خوب صورت کافی شاپ کے نیم گرم ہال میں موجود تھا اور ثروت کا انتظار کر رہا تھا۔ عمران کافی شاپ سے باہر اوپن ایئر میں ایک کونے میں بیٹھا سہ پہر کے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بے رحم ہوتی ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلے بھی تھا لیکن آج یہ بے رحمی شدید تھی۔ ثروت نے ڈھائی بجے پہنچنے کا کہا تھا مگر وہ تین بجے پہنچ سکی۔ حسبِ سابق اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آ رہی تھیں...... بلکہ آنکھوں پر بھی براؤن شیڈ کے سن گلاسز تھے۔ وہی خوش قامتی، وہی ہلکورا لیتی ہوئی دل نواز چال، وہی ایک جاں فزا خوشبو قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی اس

نے مجھے دیکھ لیا تھا، وہ سیدھی میری میز پر چلی آئی۔ میں نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ وہ اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ ہم کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر اَن گنت شکوے شکایتوں کا بوجھ تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا ثروت؟''

''ہوں......'' اس نے کہا پھر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے ہولے بولی۔ ''ہم تم کتنے بدل گئے ہیں تابش۔''

''لیکن جو کچھ دلوں میں تھا وہ تو نہیں بدلا نا۔ درمیان میں چار سال کا طویل وقفہ ہے لیکن مجھے یہی لگ رہا ہے کہ سلسلہ وہیں سے جڑا ہے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہے۔ میں امی اور فرح کو لے کر تمہارے گھر آیا ہوں۔ تمہاری ناراضی دور کرنے کے لئے۔ تمہاری ڈھارس بندھانے کے لئے...... تمہاری بنی ہوئی چائے پینے کے لئے اور تم سے بہت سی باتیں کرنے کے لئے...... ہاں، لگتا ہے کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ تم مجھے اچانک چھوڑ کر گئی ہو، نہ امی ہم سے جدا ہوئی ہیں، نہ ہم سب تتر بتر ہوئے ہیں...... وہ بے رحم چار سال بھی ابھی ہمارے درمیان نہیں آئے جنہوں نے مجھے بار بار مارا اور زندہ کیا۔''

وہ پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد دل گرفتہ آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں رہے اتنا عرصہ؟''

''یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں لیکن پہلے تم نے پوچھا ہے اس لئے بتا دیتا ہوں۔ تفصیلی جواب تو بہت لمبا ہے ثروت...... اور شاید ابھی تمہارے پاس اتنا وقت نہ ہو...... مختصر یہ ہے کہ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ ایک ایسی جگہ تھا جہاں مجھے میری خبر بھی نہیں ملتی تھی۔ اتر پردیش کے دوردراز علاقے میں ایک خودمختار اسٹیٹ تھی۔ دنیا سے بالکل کٹی ہوئی جگہ تھی...... اب ان سارے حالات کے بارے میں سوچتا ہوں تو جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا ہے لیکن...... لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ ہم تمہارے گھر پہنچے تو پتا چلا کہ تم اور نصرت، ناصر بھائی کے ساتھ پاکستان سے ہی چلے گئے ہو۔ میں حسرت سے تمہارے گھر کے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا ثروت اور پھر آنے والے دنوں میں، مَیں نے اس بند دروازے کو اتنی بار دیکھا...... اتنی بار دیکھا کہ وہ سوتے جاگتے میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا ثروت کہ میں جس طرف بھی دیکھتا ہوں، وہ بند دروازہ ہی نظر آتا ہے......'' میرا گلا

رندھ گیا۔

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا تابش! ہر طرف سے انگلیاں اٹھائی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کو لگتا تھا کہ ناصر بھائی کو کچھ ہو جائے گا، ہم انہیں بھی کھو دیں گی...... اور ویسے بھی ناصر بھائی نے ہمیں کچھ بتایا نہیں۔ انہوں نے ساری تیاری خاموشی سے کی تھی۔ انہوں نے آخر میں مجھے قسم دے دی کہ میں آپ کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی اور میں سمجھتی ہوں تابش ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''ثروت! کیا یہاں سے جانے کے بعد بھی تمہارے دل میں نہیں آیا کہ ایک بار مجھ سے رابطہ کر لو؟ صرف ایک بار مجھے حالات کو سنبھالنے کا موقع دے دو؟ پھانسی پانے والے مجرم کو بھی پھانسی سے پہلے پانی پلا دیتے ہیں، تم نے تو مجھے اپنی شکل تک نہ دکھائی۔ آواز تک نہ سنائی......''

''آپ میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے تھے تابش! کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا تھا...... اپنی اس بے بسی نے مجھے بہت رُلایا۔ پر میں کچھ کر نہ سکی......'' وہ بول رہی تھی اور اپنے دودھیا ہاتھوں کی حنائی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ہاتھوں سے پیچھے اس کی کلائیوں میں کانچ کی خوش رنگ چوڑیاں تھیں۔ ان چوڑیوں کی مدھم کھنک مجھے کچھ بھولے بسرے نغمے یاد دلا رہی تھی۔ وہ نغمے جو کبھی ہماری تنہائیوں کے ساتھی رہے تھے۔ جن کے بولوں میں ملن کی گھڑیوں کی چاپ تھی۔ انتظار کی میٹھی میٹھی کسک تھی...... اور ساتھ ساتھ شہنائیوں کی گونج بھی سنائی دیا کرتی تھی۔ میں نے پلکیں اٹھا کر ثروت کی طرف دیکھا۔ اس میں بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ وہی سادگی، وہی ملاحت، آئینے جیسی وہی شفاف رنگت، جھیل آنکھوں پر گری ہوئی وہی لمبی پلکیں...... ثروت کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اسکرین کو دیکھنے کے بعد کال ریسیو کی۔ ''جی...... جی...... نہیں، اس کی ضرورت نہیں...... غلط کہتا ہے وہ۔ صدقے کے لئے کالا رنگ ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔''

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ''کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور پلکیں جھکا لیں۔ ''میرے شوہر۔''

یہ دو الفاظ، دو سماعت شکن دھماکوں کی طرح تھے۔ مجھے لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر شے تھم کر سکتے میں چلی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی۔ ایک یخ بستہ لہر سی کانوں کے راستے میرے جسم میں اتری اور مجھے سرتاپا برفاب کر گئی۔ میں بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ پلکیں جھکائے بیٹھی تھی۔

یہی وہ الفاظ تھے جو میں ثروت کے منہ سے سننا نہیں چاہتا تھا اور یہی وہ ''جواب'' تھا جس کا سوال پچھلے آدھ گھنٹے سے میری زبان پر تو تھا مگر ہونٹوں سے ادا نہیں ہوا تھا۔ اس سوال کی غیر معمولی سنگینی اسے میرے ہونٹوں تک آنے سے روک رہی تھی۔ بس یہ ڈر تھا کہ پتا نہیں اس سوال کا کیا جواب مل جائے گا۔ اور اب...... یہ جواب بغیر میرے پوچھے ہی میرے سامنے آ گیا تھا۔ اور یہ ایسا جواب تھا جس نے چند لمحوں میں میرے سینے کے اندر ایک وسیع و عریض قبرستان آباد کر دیا۔ ہر قبر آرزوؤں اور امیدوں کا مدفن تھی۔

''مبارک ہو۔'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اور آپ؟'' اس نے نم ناک پلکیں اٹھائیں۔

میں نے گہری سانس لے کر بمشکل کہا۔ ''ثروت! شادی کا مطلب خوشی ہوتا ہے اور جہاں تک خوشی کی بات ہے، میں اس سے بہت دور ہوں۔''

اس کے موبائل سیٹ پر میسج ٹون ہوئی۔ اس نے اداسی سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''میرا خیال ہے، اب مجھے جانا چاہئے......''

''ہاں، اب چلنا چاہئے۔'' میری آواز انجانے بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دیجئے گا۔'' وہ عجیب سی آواز میں بولی۔

''ثروت! یہ نہیں پوچھو گی، میں اب تک کیسے جیا اور کہاں رہا؟''

اس کی جھیل آنکھوں پر ایک بار پھر گھنیری پلکوں کا سایہ ہو گیا۔ وہ ہولے سے بولی۔ ''جہاں بہت کچھ ''اَن کہا'' رہ گیا ہے، اس کو بھی رہنے دیں۔ میں جانتی ہوں، میں نے آپ کو ایک ایسا دکھ دیا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ اسی لئے تو آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ سے ایک التجا بھی ہے تابش! آپ نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ امید ہے اب بھی نہیں کریں گے۔''

''کہو۔'' میں بمشکل بول پایا۔

''ہم دوبارہ نہیں ملیں گے تابش! اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

''کچھ اور؟'' میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''بس۔''

''اس سے تو بہتر تھا کہ شاپنگ مال میں تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی۔ اور اگر ہوئی تھی تو تم وہیں میرے لئے اجنبی بن جاتیں۔ اس طرح زخموں سے خون تو نہ رستا۔'' میرے لہجے کی

شکستگی ناقابلِ بیان تھی۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔ لب تھرا کر رہ گئے۔ آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''اسی لئے تو اس ملاقات کو آخری ملاقات بنانا چاہتی ہوں۔ ہم دوبارہ بھی ملیں گے تو اسی طرح زخموں سے خون رِسے گا۔''

ہم کتنی دیر خاموش بیٹھے رہے...... جیسے قبرستان میں آمنے سامنے دو قبریں جن کے کتبوں پر اجل کی بے رحمی سے متعلق شعر لکھے ہوں۔ آخر میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ثروت! جیسے تمہاری مرضی۔ جہاں اتنی خواہشیں مری ہیں، شاید میری یہ خواہش بھی آہستہ آہستہ مر جائے گی کہ تمہارے بارے کچھ جان سکتا۔ اگر زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے لینا۔ تمہارے لئے میرے رابطے کا نمبر ہمیشہ وہی رہے گا جو میں نے اس دن تمہیں دیا تھا۔''

اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ جب جدائیاں طے ہو چکی ہوں تو یہ نمبر اور یہ پتے تعلق کا ذریعہ نہیں بن سکتے......

ہم کچھ دیر بالکل خاموش بیٹے رہے جیسے کسی جانکاہ موت پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔

''مجھے اجازت ہے؟'' آخر اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہاں کہوں۔''

میرے ہاتھ دو بے جان پرندوں کی طرح میرے سامنے میز پر رکھے تھے۔ چند لمحے کے لئے لگا کہ وہ الوداعی انداز میں میرے ہاتھوں کو چھونا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے اپنی انگلیوں کو میری طرف بڑھانے کے بجائے اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھا دیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ ''خدا حافظ۔'' اس نے کہا۔

''خدا حافظ۔'' میں نے جواب دیا۔

مجھے لگا کہ کافی شاپ میں موجود ہر شے سے خون رِس رہا ہے...... تازہ سرخ خون۔ یہ خون دیواروں سے بہہ رہا ہے اور چھت سے ٹپک رہا ہے۔ اس خون کے اندر چلتے چلتے ثروت میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں آخر تک دیکھتا رہا، اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایسے جانے والے مڑ کر نہیں دیکھتے...... ہاں، وہ کہیں آگے جا کر بہت روتے ہیں۔ یہ رونے والی شام تھی...... ٹوٹ کر رونے والی۔

مجھے بھی تنہائی چاہئے تھی۔

میں کافی شاپ سے باہر آیا۔ تب تک ثروت جا چکی تھی۔ میرے اور عمران کے درمیان

کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم خاموشی سے کار میں بیٹھے اور واپس روانہ ہو گئے۔ کار عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ ''شادی ہو چکی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے بھی مختصر جواب دیا۔

''ناصر اور نصرت ساتھ ہی رہتے ہیں۔''

''پتا نہیں۔''

''دوبارہ ملے گی؟''

''نہیں۔''

گاڑی تیزی سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ عمران جانتا تھا کہ مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ زیادہ مخل نہیں ہوا۔ میری عجیب سی کیفیت تھی۔ کوئی بھاری بوجھ دل کو پیس رہا تھا۔ عاطف نے مجھ سے بات کرنا چاہی لیکن میں اسے نظر انداز کرتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دروازے بند کر لئے اور تاریک کمرے میں گم صم لیٹ گیا۔ آنسو اپنے آپ ہی چہرے کو بھگونے لگے ایک خاموش بارش کی طرح جو تواتر سے برستی ہے اور سب کچھ بھگوتی چلی جاتی ہے۔ کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی دوبارہ ختم ہو گئی تھی یہ کہانی۔ شاید ایسے ہی ہونا تھا۔ شاید یہی لکھا ہوا تھا۔ آس کا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو رہتی ہی انہونیوں کی تلاش میں ہے...... اور انہونیاں تو بس کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں۔ معجزے عام ہو جائیں تو پھر وہ معجزے نہ رہیں۔ چار سال کا عرصہ کوئی کم تو نہیں ہوتا۔ میں چار سال اس سے دور رہا تھا...... اسے میرا پتا تھا، نہ مجھے اس کا۔ پھر بھی میں نے یہ آس پالی تھی کہ اس نے شادی نہیں کی ہو گی۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ جب میں اسے ڈھونڈوں گا تو وہ مل جائے گی اور یوں ملے گی کہ میرے جسم اور روح کا حصہ بن جائے گی......

ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایسا نہیں ہونا تھا۔

......لیکن یادوں کے کانٹے...... ہاں، یادوں کے کانٹے تو شاید اس کے دل میں بھی تھے۔ انارکلی کیفے کے ویٹر مقبول نے مجھے بتایا تھا۔ وہ کیفے میں آتی تھی۔ اس میز پر بیٹھتی تھی جہاں کبھی ہماری سرگوشیاں گونجا کرتی تھیں۔ شاید وہ ان سب جگہوں پر گئی ہو جہاں جہاں ہم ملتے تھے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دل سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں۔ ان کی تہ میں کیا ہے، کوئی نہیں جان سکتا۔

رات ایک بجے کے قریب عمران نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کیا ہے عمران؟'' میں نے وہیں لیٹے لیٹے پوچھا۔

"کھانا نہیں کھاؤ گے یار؟"

"نہیں، بالکل بھوک نہیں۔"

"اچھا باہر تو آ جاؤ۔ سب پریشان ہو رہے ہیں۔"

"سر میں درد ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہوں یار۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ میرا رمز شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ میں ابھی دروازہ نہیں کھولوں گا۔ وہ چلا گیا۔

دکھ ایک مہیب طوفان کی طرح تھا جو مجھے اٹھا اٹھا کر پٹختا رہا۔ روندتا اور مسلتا رہا۔ پتا نہیں کہ وہ رات کیسے گزری۔

اگلے روز میں نے ناشتے کے نام پر چند لقمے لئے اور خاموشی سے موٹر سائیکل پکڑ کر نکل گیا۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ بہ زبانِ حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں کرب کے شدید ریلے سے گزر رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ فرح اور عاطف مجھ سے اَن گنت سوال کریں گے۔ میرا دکھ ان کے دل و دماغ تک میں بھی سرایت کر جائے گا۔ عمران اس وقت سویا پڑا تھا۔ میں نے وہی موٹر سائیکل لی جو اس کے زیرِ استعمال تھی۔ سیاہ ونڈ اسکرین والا ہیلمٹ اپنی شناخت چھپانے میں مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس رہائش گاہ سے باہر نکلتے ہوئے ہمیں بے حد محتاط رہنا پڑتا تھا۔ میری نگاہیں گاہے بگاہے عقب نما آئینے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اب بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جونہی میں گلشن اقبال کی طرف مڑا، چونک گیا۔ عقب میں ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ ایک دم ذہن میں وہ سنگین واقعہ گھوم گیا جب سیٹھ سراج کے ہرکارے چھیدے نے ہمیں فائرنگ کا نشانہ بنایا تھا اور پھر خود ایک اچانک موت کا شکار ہو گیا تھا۔

میں گلشن اقبال جانے کے بجائے سیدھا نکل گیا۔ ایک دو سڑکوں پر موڑ کاٹے۔ نیلے رنگ کی موٹر سائیکل بدستور پیچھے تھی اور اب کافی نزدیک آ گئی تھی۔ دفعتاً میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہو گئی۔ موٹر پر عمران تھا۔ میں نے اسے لباس سے پہچانا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گیا اور ہیلمٹ اتار کر بولا۔ "موٹر سائیکل چرانا جرم ہے۔ اس پر سزا ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے نیوز چینل کے نمائندے کی موٹر سائیکل چرا کر کوئی کیسے خیر منا سکتا ہے۔ اس کی تو اگلی پچھلی موٹر سائیکلیں نکل آتی ہیں۔ وہ اپنی موٹر سائیکلیں بھی برآمد کرا دیتا ہے جو اس نے ابھی چرائی بھی نہیں ہوتیں۔"

میں نے کوئی جواب دیا اور نہ ردِعمل ظاہر کیا۔ میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "میرا خیال ہے تم گلشن اقبال میں بیٹھنا چاہ رہے تھے۔" اس نے کہا۔

"بیٹھنا چاہ رہا تھا لیکن اکیلا۔"

"چلو تھوڑی دیر اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اکیلے بیٹھ جانا۔"

میں جانتا تھا کہ اس کو قائل کرنا ناممکن ہے۔ میں نے خاموشی سے موٹر سائیکل موڑی اور گلشن اقبال کی پارکنگ میں روک دی۔ ہم دونوں اندر چلے گئے۔ سبزہ زاروں اور کوتاہ قامت درختوں پر خوش گوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی سی تمازت کو ہوا کی مدھم حرکت زائل کر رہی تھی۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ ہم مصنوعی جھیل کے کنارے ایک چوبی بینچ پر بیٹھ گئے۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر دھواں فضا میں چھوڑا اور گھمبیر لہجے میں بولا۔ "تابش! میں تمہارے دل کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ لیکن سب کچھ پا لینے کا نام ہی تو محبت نہیں ہے۔ محبت تو کسی سے دور رہ کر بھی کی جا سکتی ہے اور ساری عمر کی جا سکتی ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے جھیل کی چھوٹی چھوٹی لہروں کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ "وہ بے شک کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن وہ تمہارے دل میں زندہ رہے گی۔ تم اس کو سوچو گے اور اس کا تصور بہت سے روپ بدل کر تمہارے سامنے آئے گا۔ اس کی یادیں سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پچھتاوا یہی ہے عمران کہ میں جلدی نہ لوٹ سکا۔ پتا نہیں وہ کب تک میرا انتظار کرتی رہی۔ کیسی کیسی آسیں دل میں پالتی رہی......"

"لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تابی! ہم گئے وقت کو آواز تو نہیں دے سکتے نا۔ وہ کیا ایک بھلا سا شعر ہے۔ ہر سوالی پر یہ دروازہ سدا رہتا ہے بند...... کب کسی کو گمشدہ لمحوں کی سوغاتیں ملیں...... اب تو بس دل پر پتھر رکھنا ہے تابی...... اپنی آگ میں جلنا جھلسنا ہے...... کڑھنا ہے...... زندگی کے دن گزارنے ہیں۔" وہ باقاعدہ رونے لگا۔ آنسو اس کی ٹھوڑی تک بہہ آئے۔ "بس تابی! عشق نام ہی جلنے کڑھنے اور کوئلہ ہونے کا ہے۔ اپنی ہی تپش سے پک پک کر مرونڈا ہو جانا...... مرونڈا سمجھتے ہو نا تم؟"

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے روتے روتے ناک سے 'سووں' کی زوردار آواز نکالی اور ناک کا رقیق مادہ چٹکی میں پکڑ کر میرے کُرتے کے دامن صاف کر دیا۔

"کیا کرتے ہو؟" میں نے سخت ناگواری سے کہا۔

"اوہ سوری...... سوری۔" اس نے میرا کرتہ پکڑ کر کھینچا اور پھر کھینچتا چلا گیا جیسے اسے جھیل کے پانی میں دھونا چاہتا ہو۔ میں نے رکنے کی بہت کوشش کی لیکن رک نہیں سکا۔ ہم دونوں دھڑام سے جھیل کے ٹھنڈے پانی میں گرے۔ "عمران۔" میں چلایا۔ بھنا کر میں نے

اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

اس نے جواباً میری گردن پر جھانپڑ مارا اور میرے اوپر چڑھ بیٹھا۔ ”اوئے کھوتے کے پتر! میرے ہوتے ہوئے بھلا تو بن سکتا ہے دیوداس۔ تیری تو ایسی کم تیسی۔“ اس نے میری گردن دبوچی۔

میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا اور خود کو چھڑانا چاہا۔ اس نے میری ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے پھر پانی میں گرا دیا۔ ہانپی آواز میں بولا۔ ”اتنی جلدی پیچھا نہیں چھڑانے دوں گا اسے تجھ سے۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا یہ ہو سکتا ہے۔ پوری تحقیقات اور پوری تفتیش ہوگی۔ پورے حالات معلوم کرنے ہوں گے اس کے۔ اور اگر تُو نے بھی کوئی دلیپ کماری دکھائی نا تو دونوں کانوں میں سر کر دوں گا تیرا۔ ایسا مکا ماروں گا کہ چباڑا کڑک ہو جائے گا۔“

”عمران! تُو ہوش میں تو ہے؟“ میں دہاڑا۔

”ہوش میں ہوں اور تمہیں بھی ہوش میں لانا چاہتا ہوں۔ پانی سے نکل۔ میں تجھ بتاتا ہوں۔ کچھ معلوم ہوا ہے مجھے۔“ اس کی آواز میں چمک سی تھی۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے کوئی خاص اطلاع دینا چاہتا ہے۔ ہم باہر نکل آئے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ گارڈز بھی سیٹیاں بجاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ سخت نالاں تھے کہ ہم نے قواعد کو توڑتے ہوئے جھیل میں چھلانگ لگائی ہے اور اودھم مچایا ہے۔ عمران نے انہیں کسی نہ کسی طرح رام کر لیا اور مجھے لے کر بڑی جھیل کی جنوبی جانب ایک خاموش اور تنہا گوشے میں آن بیٹھا۔ ہمارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ عمران نے اپنے سویٹر اور قمیص وغیرہ اتار کر نچوڑے اور سنہری دھوپ میں اپنے کسرتی جسم کے مسلز دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک جگہ دو ناکام عاشق بھی نہیں رہ سکتے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ میں ابھی تک اس کی بے ہودہ حرکت کی وجہ سے اَپ سیٹ تھا۔

”یار! اس چھوٹے سے شہر لاہور میں کیا میں ایک ناکام عاشق کافی نہیں ہوں جو تم بھی پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تمہیں یہ نامعقول حرکت نہیں کرنے دوں گا۔ آخر دم تک کوشش کروں گا کہ تمہارا نام رانجھا، مہینوال، پنوں اور عمران وغیرہ کی فہرست میں نہ آ سکے۔ اور اگر تم نے اس کوشش میں میرا ساتھ نہ دیا تو تمہارا حشر نشر کر ڈالوں گا۔“

”عمران! میں سچ کہتا ہوں۔ تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم...... تم ثروت کے بارے میں کیا

بات کر رہے تھے؟“

اس نے سگریٹ سلگانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پیکٹ، لائٹر وغیرہ سب کچھ بھیگ چکا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، کل جب تم کمرے میں گھس کر بیٹھ گئے تھے تو میں بھی کمبل اوڑھ کر سو گیا تھا؟ نہیں جگر! جب تیرے دل پر چوٹ پڑتی ہے تو ساتھ ہی میرے دل پر بھی پڑتی ہے۔ میرا وشواس کرو۔ یہ ہو ہی نا ہیں سکت ہے کہ تم تڑپ رہے ہو اور میں شانتی سے سوتا رہوں۔ اگر تم ایسا سوچت ہو تو یہ میرے لئے بڑی نراشا کی بات ہووے گی۔“ اس نے بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کی۔

”تم نے کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے کچھ چھان بین کرائی ہے اور مجھے ایک دو باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو باتیں خاص طور پر اہم ہیں۔“

”کچھ بکو بھی۔“

”ان خاص باتوں سے پہلے یہ جان لو کہ ثروت کا شوہر وہی یوسف ہے جس سے جرمنی میں اس کی منگنی ہوئی تھی اور جس کے بارے میں ہم پہلے بھی جانتے ہیں۔ جو دو خاص باتیں پتا چلی ہیں، ان میں پہلی تو یہ ہے کہ ثروت اور یوسف کے درمیان کوئی خاص قسم کی ناچاقی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے ثروت، شوہر کا گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی...... اور دوسری بات یہ ہے کہ یوسف کے گھر میں انیس بیس برس کی ایک دوسری لڑکی بھی موجود ہے جس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ یوسف کی دوسری بیوی ہے۔“

”عمران! تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“ میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

”ایک سو دس فیصد سنجیدہ ہوں۔“

”یہ باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جیلانی کے ذریعے۔ میں نے اسے اس کام پر لگایا تھا۔ اور تمہیں پتا ہی ہے، وہ ہر فن مولا بندہ ہے۔ اس نے بس دو تین گھنٹے کے اندر ایک ایسی عورت کا کھوج لگا لیا جو یوسف کے گھر میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل تک وہ اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرے گی۔“

”تم ثروت اور اس کے شوہر کے درمیان کس طرح کی ناچاقی کی بات کر رہے ہو؟“

”ابھی وضاحت سے تو پتا نہیں چلا لیکن امید ہے کہ ایک دو دن میں چل جائے گا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بہرحال، ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا

عمران! ہر کسی کے گھریلو معاملات ہوتے ہیں۔ اب ثروت ہی لڑکی بھی ڈال دیتا.....''

''واہ..... واہ کیا بات کی ہے تم نے۔'' عمران نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہ ڈائیلاگ بہت سی فلموں میں بولا گیا ہے۔ چار پانچ فلموں میں تو دلیپ کمار صاحب نے ہی اس طرح کا ڈائیلاگ بولا ہے..... نہیں، اب رادھا کا جیون اس کے پتی کے ساتھ ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا بھی پاپ ہے۔ میں اب اس کے جیون پر اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا..... دور چلا جاؤں گا..... بہت دور..... بہت دور..... ٹن ٹنان..... اور اس کے ساتھ ہی انٹرویل ہو جاتا تھا۔ بہرحال، دلیپ صاحب بہت دور نہیں جاتے تھے کیونکہ پرانی فلموں میں ''بہت دور'' جانے سے مطلب گاؤں سے پچاس ساٹھ میل دور بھی آنا ہوتا تھا۔''

''عمران! تمہاری بکواس میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی ہے۔ آخر تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟''

''کچھ ثابت کرنا نہیں چاہ رہا۔ بس اتنی سی درخواست ہے کہ ہمیں رادھا کے بارے میں..... میرا مطلب ثروت کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل ہونی چاہئیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو..... یا کوئی مشورہ درکار ہو۔ جیسا کہ اندازہ ہو رہا ہے، اس کے بھائی ناصر صاحب اس کے ساتھ نہیں ہیں..... بس دونوں بہنیں ہیں یہاں۔ نصرت بھی پریشان ہے۔ احمد تھانوی سے اس کی جو ملاقات ہوئی تھی، اس کے بارے میں کچھ بتایا ہے تمہیں؟''

''تم نے ہی بتایا تھا کہ نصرت نے پیر صاحب سے اپنی گھریلو پریشانیوں کا ذکر کیا تھا اور دعا وغیرہ کے لئے کہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لئے کسی اچھے رشتے کی خواہش رکھتی ہے۔''

''ہاں..... لیکن کل احمد تھانوی صاحب نے کچھ اور بھی بتایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس کی اہم پریشانی اس کی بڑی بہن کی وجہ سے ہے۔ اس کی شوہر کے ساتھ ناچاقی ہے۔ اسی وجہ سے وہ تو دس ماہ پہلے جرمنی سے اکیلی ہی پاکستان آ گئی تھی۔ بعد میں اس کا شوہر یوسف پاکستان آ گیا۔ اب دونوں میاں بیوی میں کچھ سلوک ہے مگر حالات ابھی بھی ٹھیک نہیں ہیں.....''

''نصرت نے یوسف کی دوسری شادی کا کوئی ذکر بھی کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اس بارے میں نصرت نے تو کچھ نہیں بتایا لیکن کل حمیدن نے یہ کہا ہے کہ انیس بیس سال کی ایک انگریز لڑکی ہے جو یوسف صاحب کی بیوی ہی ہے۔ حمیدن!

نوکرانی کا نام ہے۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آج شام حمیدن سے ملنے کا پروگرام ہے۔ جیلانی اسے چھ بجے کے قریب گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں لے کر آئے گا۔ ہم وہاں اس سے تفصیلی بات کر سکیں گے۔"

"اس سے کیا ہوگا عمران؟"

"ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی کوئی مدد کر سکیں۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے یار...... تمہاری اپنی ہے۔ ٹھیک ہے، اس کی شادی اور جگہ ہوگئی ہے لیکن باقی سارے رشتے اسی ایک رشتے کی وجہ سے ختم تو نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک خاصا سنجیدہ معاملہ ہے یار! دیکھو کہ وہ جرمنی سے تن تنہا پاکستان چلی آئی۔ یہاں پہلے کسی سہیلی کے گھر ٹھہری...... پھر فائزہ کے پاس رہی اور اسی کے ساتھ دو تین مہینے سروس بھی کی۔ اب اس کا شوہر پھر اسے اپنے پاس لے گیا ہے...... اب یہ اندازہ بھی ہو رہا ہے کہ کوئی ٹین ایجر جرمن لڑکی اس کی دوسری بیوی ہے۔"

ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور اپنے کپڑے سکھاتے رہے۔ میں تو اتفاقاً اپنا موبائل لے کر ہی نہیں آیا تھا۔ عمران کا موبائل بھیگ گیا تھا۔ اس نے دھوپ میں رکھا ہوا تھا اور گاہے بگاہے موبائل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا تھا کہ وہ اسے داغ جدائی دینے کی کوشش نہ کرے۔ اچانک موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ عمران نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔

"پیر احمد تھانوی صاحب واقعی پہنچے ہوئے ہیں۔ دیکھو، اس بھیگے ہوئے سیٹ پر بھی ان کی کال آ گئی۔ اب یہ بچ جائے گا۔"

اس نے کال اٹینڈ کی اور اسپیکر بھی آن کر دیا۔ تھانوی صاحب کی آواز آئی۔ "ہیلو، کیسے ہو عمران؟"

"آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لڑکی نصرت یہاں پھر آئی تھی۔ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی کہ اچانک اسے واپس جانا پڑ گیا۔"

"وہ کیوں حضرت؟" عمران نے پوچھا۔

"فرید بتا رہا تھا کہ موبائل پر کوئی کال سنی تھی اس نے۔ پریشان ہوگئی اور ٹوکن واپس کر کے جلدی سے نکل گئی۔"

"کیا معاملہ ہوسکتا ہے جی؟" عمران نے پوچھا۔

"پتا نہیں لیکن یہ لڑکی کافی پریشان لگتی ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی ایسا رشتے دار مرد بھی اس

کے آس پاس نہیں جو اس کی مدد کر سکے۔ اگر تم لوگ کچھ کر سکتے ہو اور مناسب طریقے سے کر سکتے ہو تو اس کے لئے کرو۔"

"بالکل ٹھیک ہے حضرت۔ ہم ابھی اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ تھوڑی سی پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ میں حاضر ہوں گا تو بتاؤں گا۔"

احمد تھانوی صاحب نے کہا۔ "اس روز ہم نے جو کوشش کی، وہ کافی کامیاب رہی ہے۔ نیازے کی حالت اب بہتر ہو رہی ہے۔ کل رات بھی بارش ہوئی ہے لیکن اس میں پہلے کی طرح جو شدید بے چینی پیدا ہوتی تھی، وہ نہیں ہوئی۔ وہ تم سے دوبارہ ملنا بھی چاہ رہا ہے۔"

"آپ جب کہیں گے، میں حاضر ہو جاؤں گا اور اگر اس کا وہم توڑنے کے لئے پھر بارش میں بھیگنا ضروری ہے تو میں اس کے لئے بھی حاضر ہوں۔"

احمد تھانوی صاحب کے ساتھ عمران کی گفتگو دو تین منٹ مزید جاری رہی۔ فون بند کر کے اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا خیال ہے تمہارا؟ کیا نصرت کسی گھریلو مسئلے کی وجہ سے آناً فاناً واپس گئی ہوگی؟"

میں نے کہا۔ "اگر ملازمہ حمیدن سے تمہاری ملاقات کنفرم ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ بتا دے۔"

عمران نے اثبات میں سر ہلایا......

حمیدن سے ہماری ملاقات طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوئی۔ گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں شام سے تھوڑی دیر پہلے حمیدن اپنی آٹھ نو سالہ بیٹی کے ساتھ آ گئی۔ بیٹی بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے لگی۔ حمیدن ہمارے پاس آ بیٹھی۔ حمیدن کی عمر پینتیس برس کے قریب تھی۔ جسم فربہ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ جیلانی بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ جیلانی نے بتایا تھا کہ حمیدن کو شیشے میں اتارنے کے لئے اسے صرف تین ہزار روپے خرچ کرنے پڑے ہیں۔ ان تین ہزار کے عوض وہ یوسف کے گھر کی ہر "معلوم بات" بتانے کو تیار ہو گئی ہے۔

حمیدن نے کہا۔ "یہ ثروت بی بی یوسف صاحب کی پہلی بیوی ہیں جی۔ ہم ان کو بڑی بی بی جی کہتے ہیں۔ گھر کے سارے ملازم بڑی بی بی کی عزت کرتے ہیں۔ چھوٹی بی بی اور طرح کی ہے۔ ایک تو اس کو اپنی بولی نہیں آتی، دوسرے وہ کبھی کبھی بہت غصہ بھی کرتی ہے۔"

"تم کب سے ملازم ہو اس گھر میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی چار مہینے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ باہر کے ملک سے آئے ہیں۔ ابھی کرائے کی کوٹھی میں رہ رہے ہیں لیکن ان کا اپنا بڑا شاندار مکان بھی بن رہا ہے جوہر ٹاؤن میں۔"

"یوسف صاحب کیسے بندے ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم سے تو ٹھیک ہیں جی۔ بخششیں وغیرہ بھی دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی بڑی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ سنا ہے، کافی زیادہ تنخواہ ہے ان کی۔ شاید دس پندرہ لاکھ روپے۔"

"بڑی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟"

"بس ٹھیک ہے جی...... جو چیز لاتے ہیں، دونوں بیبیوں کے لئے لاتے ہیں۔ دونوں کو ٹائم دیتے ہیں مگر پھر بھی قدرتی بات ہے، چھوٹی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک زیادہ ہے۔ وہ بھی ہر وقت ان کے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔"

"گھر میں اور کون کون ہے؟"

"بس جی، ہم تین چار نوکر ہیں۔ ایک بڑی بی بی کی چھوٹی بہن نصرت بی بی ہے۔ ہاں، دو ڈھائی مہینے پہلے یوسف صاحب کے ابا جی "بڑے صاحب" بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ کافی پیسے والے ہیں۔ باہر کے ملک میں ان کی پراپرٹی شراپرٹی بھی ہے۔ جب تک وہ یہاں رہے، بڑی بی بی ثروت کے ساتھ یوسف صاحب کا سلوک بڑا اچھا رہا۔ وہ ایک دوسرے سے ہنستے بولتے تھے۔ یوسف صاحب بڑی بی بی کو لے کر شاپنگ شوپنگ کرنے بھی جاتے تھے۔ لگتا تھا کہ یوسف صاحب اپنے ابا جی سے ڈرتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "تم بتا رہی ہو کہ ابا جی کے ہوتے ہوئے یوسف صاحب کا سلوک بڑی بی بی سے اچھا رہا ہے۔ یعنی اب اس کا سلوک اچھا نہیں ہے؟"

وہ ذرا توقف کر کے بولی۔ "آہو جی۔ بڑے صاحب کے جانے کے بعد ان دونوں میں پھر زیادہ صلح صفائی نہیں رہی ہے۔ کبھی کبھی جھگڑا شگڑا بھی ہو جاتا ہے دونوں میں۔ بلکہ...... آج دوپہر کو بھی ہوا ہے۔"

میں چونک گیا۔ احمد تھانوی صاحب نے بتایا تھا کہ آج نصرت کو دوپہر کے وقت کوئی فون کال آئی تھی جس کے بعد وہ فوراً واپس چلی گئی تھی۔ کہیں یہ اسی جھگڑے کا شاخسانہ تو نہیں تھا۔

"آج کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ خرابی تو یوسف صاحب کی طرف سے ہی ہوتی ہے جی۔ بڑی بی بی تو کچھ بولتی ہی نہیں ہیں لیکن کبھی ان کو بھی تھوڑا بہت غصہ آ جاتا ہے۔ آج دوپہر کو چھوٹی بی بی نے کوئی

واہیات سی فلم ٹی وی پر لگائی ہوئی تھی۔ آواز بھی بڑی اونچی کر رکھی تھی۔ بڑی بی بی نے کہا، میں نے نماز پڑھنی ہے، آواز ذرا کم کر دو۔ اس بات پر چھوٹی بی بی جھگڑا کرنے لگی۔ اتنے میں یوسف صاحب بھی چھت سے اتر کر آ گئے۔ انہوں نے بھی بڑی بی بی کو ہی جھڑکا اور کہا کہ وہ برداشت کرنا سیکھے، وہ اپنا دل تنگ سے تنگ کرتی جا رہی ہے۔ بڑی بی بی رونے لگیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک چھوٹا اٹیچی کیس لیا اور کہیں جانے کے لئے نکل پڑیں۔ یوسف صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے بی بی کو گیٹ پر روک لیا۔ وہاں پھر جھگڑا ہوا۔ بی بی جانا چاہتی تھی اور یوسف صاحب انہیں روک رہے تھے۔ وہ بی بی کو کھینچ کر اندر لے گئے۔ بی بی کمرا بند کر کے روتی رہیں۔ نصرت بی بی بھی گھر میں نہیں تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد آئیں اور انہوں نے بڑی بہن کو سنبھالا۔''

''اب کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، ان میں جھگڑا ہوتا ہے اور پھر جلدی سے ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یوسف صاحب نے بی بی ثروت کو منا لیا ہے۔ آج سویرے وہ بی بی ثروت کے کمرے میں ہی ناشتا کر رہے تھے اور باتیں شاتیں بھی ہو رہی تھیں۔''

جیلانی نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے حمیدن...... کہیں اپنے باپ کے ڈر کی وجہ سے تو یوسف، بی بی ثروت کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں ہے؟''

''آپ کی بات ٹھیک بھی ہو سکتی ہے جی۔'' حمیدن نے سر ہلایا۔

''بی بی ثروت سے یوسف صاحب کے ابا جی کا رویہ کیسا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''بہت چنگا جی...... بہت ہی چنگا۔ وہ انہیں بہو نہیں، بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ انگریز بی بی سے ان کو کچھ زیادہ پیار نہیں ہے۔ اس سے بس ضرورت کی بات ہی کرتے تھے۔''

صورتِ حال کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یوسف نے ثروت سے شادی اپنے ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے کی جبکہ جرمن لڑکی سے اس کا کوئی معاشقہ وغیرہ تھا۔ حمیدن کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یوسف کا والد امیر کبیر اور صاحبِ جائیداد ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ جائیداد سے محروم ہونے کے ڈر سے یوسف، ثروت کو خود سے دور کرنا نہ چاہتا ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا تھا، اگر ایسی بات تھی تو پھر اس نے جرمن لڑکی سے شادی کیوں کی؟ اور اگر کی تھی تو پھر اسے منظرِ عام پر کیوں لایا؟ یا پھر ممکن تھا کہ یہ شادی خفیہ ہو اور خفیہ رہ نہ سکی ہو...... یا جرمن بیوی نے ہی اسے مجبور کر دیا ہو کہ وہ اس شادی کا اعلان کرے......

جیلانی نے حمیدن سے پوچھا۔ ''یوسف کی جرمن بیوی خوبصورت ہے؟''

''ہاں جی، خوب صورت تو ہے۔ نیلی آنکھیں، گولڈن بال۔ لگتا ہے کہ شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ پر خوش شکل ہونا اور بات ہوتی ہے جی اور سوہنا ہونا اور بات۔ چھوٹی بی بی خوش شکل ہے، پر بڑی بی بی سوہنی ہے۔ اوپر سے بھی اور اندر سے بھی۔ ہمیں تو بڑی بی بی ہی چنگی لگتی ہے جی۔''

عمران نے جیلانی کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو بھئی! حمیدن نے شیکسپیئر اور شیلے کے پائے کی بات کی ہے۔ خوش شکل ہونا اور بات ہے، سوہنا ہونا اور بات۔''

جیلانی نے کہا۔ ''حمیدن! تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے، یہ دو شادیاں کیسے اور کیوں ہوئیں؟''

وہ بولی۔ ''میں تو جی موٹی عقل کی غریب نوکرانی ہوں۔ سارا دن کھوتے کی طرح کام کرنے والی پھر بھی مہینے کے آخر میں رونے والی۔ بڑے لوگوں کی باتیں بڑے لوگ ہی جانیں۔ پر میرا اندازہ ہے کہ بی بی ثروت بزرگوں کی مرضی سے آئی ہے اور چھوٹی بی بی کے ساتھ یوسف صاحب کا کوئی چکر شکر تھا۔ میرا مطلب ہے، کوئی پہلے کا معاملہ۔ سنا ہے کہ وہ اس دفتر میں کام کرتی تھی جہاں یوسف صاحب کرتے تھے۔ دونوں کی عمروں میں کافی فرق بھی لگتا ہے جی۔ پر جب مت ماری جائے تو ایسے فرق کون دیکھتا ہے۔''

حمیدن کے ساتھ ہماری گفتگو کوئی ایک گھنٹا رہی۔ یہاں تک کہ شام کا اندھیرا پھیل گیا اور وہ واپسی کے لئے بے چین نظر آنے لگی۔

جیلانی...... حمیدن کی مٹھی کو تھوڑا سا مزید گرم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ ایک دو دن میں کچھ مزید کارآمد باتیں بتائے گی۔

○......❖......○

اس رات میں دیر تک اکیلا ہی چھت پر ٹہلتا رہا۔ موسم صاف تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ بالو گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا میرے بازوؤں میں تھا۔ وہ کبھی اپنے ننھے ہاتھ میرے منہ پر چلاتا، کبھی ناخنوں سے میری جلد کریدتا پھر ایک دم گردن گھما کر اوپر دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی نگاہ تاریک آسمان کی بے کراں وسعتوں میں دمکتے ستاروں پر جا ٹکتی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے ستاروں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ کیا اناری رخساروں اور جھیل آنکھوں والی سلطانہ بھی ان ستاروں میں کہیں موجود تھی؟ پتا نہیں کیوں لگا کہ وہ موجود ہے۔ ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی گم گشتہ آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ ''......مہروج! تم ثروت نام کی اس لڑکی سے بہت پیار کرتے ہو۔ شاید اتنا پیار جتنا تم خود بھی نہیں جانتے۔ اسے ڈھونڈنا جرور...... اس سے ملنا جرور۔ اور مجھے یخین (یقین) ہے مہروج! وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی تو اس سے کہنا......''

میں سلطانہ کی آواز سنتا رہا۔ میرے قدم چھت کے پتھریلے فرش پر اٹھتے رہے اور بالو میری بانہوں میں کھیلتا رہا...... ہمکتا رہا۔

میں نے سوچا کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ثروت کے سلسلے میں اب بھی کوئی گنجائش موجود ہے؟ کیا اب بھی کوئی ایسی انہونی ہو سکتی ہے جو میری اور اس کی راہوں کو ملا دے؟

بالو کے دودھ کا وقت ہو گیا تھا۔ صفیہ آئی اور اسے نیچے لے گئی۔ میں اوپر ہی رہا۔ سرد ہوا کی کاٹ میرے لئے بے معنی تھی۔ میں برداشت کے معاملے میں اتنا ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ شاید اس سے دس گنا سردی بھی جھیل سکتا تھا۔

عاطف نے چھت پر جو چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا، وہ آج کل میرے استعمال میں تھا......

میں رات کے وقت دیر تک یہاں مصروف رہتا۔ اپنے آپ کو جسمانی مشقت کے حوالے کر

کے مجھے عجیب سا سکون ملتا تھا۔ جب سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹتے، جب مساموں سے پسینا دھاروں کی صورت میں بہتا اور سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چلتی، میرے سامنے جیکی کا مسکراتا ہوا چہرہ آ جاتا۔ اس نے کہا تھا...... تکلیف کا صلہ ملتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ قدرت اپنے اس اٹل اصول سے انحراف کر ہی نہیں سکتی۔

میں جان توڑ ورزش میں مصروف ہو گیا۔ ایک خیالی دنیا میں چلا گیا...... اپنے اردگرد موجود ان بدترین لوگوں کے سامنے آ گیا جن سے مجھے نبرد آزما ہونا تھا۔

اسی دوران میں عمران بھی اوپر چلا آیا۔ اس کا چہرہ ہی بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔ وہ بولا۔ ''ابھی احمد تھانوی صاحب کا فون آیا ہے۔ نصرت آج پھر ان کے پاس پہنچی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔ آج اس نے تھانوی صاحب سے بہت اہم ڈسکشن کی ہے۔''

''کس حوالے سے؟'' میں نے پوچھا۔

''خاوند سے علیحدگی اور طلاق کے موضوع پر۔''

''کیا مطلب؟ نصرت کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

''اس نے یہ گفتگو اپنی بہن ثروت کے حوالے سے کی ہے۔ اس نے تھانوی صاحب سے اس بارے میں شرعی پوزیشن پوچھی ہے۔ بہت سے متعلقہ سوال کئے ہیں۔ تھانوی صاحب نے نصرت کو بتایا ہے کہ مذہب میں کسی بھی صورت میں زبردستی نہیں ہے۔ اگر ایک عورت سمجھتی ہے کہ وہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور شوہر کی اصلاح کا بھی کوئی امکان نہیں تو وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں ہے۔ اس کے لئے طلاق کا راستہ ہے۔ جو بے شک ناپسندیدہ ہے لیکن موجود ہے۔ میں نے کہا تھا نا تابش! ثروت کے ازدواجی معاملوں میں کافی گڑبڑ ہے۔''

''نصرت کیا کہتی ہے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اس کی بڑی بہن اور اس کے شوہر میں بہت فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ معاملے ایسی جگہ پر ہیں جہاں اس کی بہن کو شوہر سے علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ لیکن وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ وہ اسے ایک گناہ کی طرح سمجھ رہی ہے۔ اس کی یہ سوچ اس کی زندگی تباہ کر دے گی۔ نصرت کا کہنا ہے کہ ثروت کے شوہر نے جعلی اجازت نامے کے ذریعے خفیہ شادی کی۔ اب وہ دوسری بیوی کو گھر لے آیا ہے۔ وہ پرلے درجے کا مفاد پرست ہے اور صرف اپنے باپ سے جائیداد کا باقی حصہ حاصل کرنے کے لئے ثروت کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے

ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ثروت اس کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔"

عمران کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"جہاں تک میری چھٹی حس کہتی ہے جگر...... اب موقع آ گیا ہے کہ ہم نصرت سے مل لیں۔"

"کہیں اس سے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ...... ثروت مجھ کو خدا حافظ کہہ کر جا چکی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے راستے میں نہ آؤں...... اب ہم نصرت سے ملے تو وہ سمجھے گی کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔"

"بالکل اصلی ناکام عاشقوں والا رویہ ہے تمہارا۔ یہی کرتوت تھے جن کی وجہ سے عظیم اداکار دلیپ کمار کو ہر فلم میں ہیروئن سے ہاتھ دھونے پڑے۔ وہی گھسی پٹی سوچ، میں اس کے رستے میں نہیں آؤں گا...... میں اس کی زندگی پر اپنا منحوس سایہ نہیں پڑنے دوں گا۔ میں اندر ہی اندر جل کر خاک ہو جاؤں گا، راکھ ہو جاؤں گا، مرونڈا بن جاؤں گا...... بندۂ خدا...... یہ نیا دور ہے۔ خود اذیتی والی حرکتیں چھوڑو۔ منطقی انداز میں سوچو، ہم اس کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کرنے نہیں جا رہے۔"

"اچھا کہو، کیا کرنا ہے؟"

"احمد تھانوی صاحب بتا رہے تھے کہ کل نصرت پھر آ رہی ہے۔ وہ جب تھانوی صاحب سے مل کر واپس جائے گی، ہم اس کے سامنے آئیں گے اور اس سے ملاقات کریں گے۔"

"لیکن......"

"لیکن کے آگے جھانپڑ ہے۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔" اس نے اپنی ہتھیلی میرے ہونٹوں پر جمائی اور میرا منہ بند کر دیا۔

اگلے روز سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح ہم نے سوچا تھا۔ نصرت پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر اور ان سے وظیفہ جات وغیرہ لکھوا کر رکشا پر روانہ ہوئی تو ہم کار میں اس کے پیچھے تھے۔ وہ ابھی گارڈن ٹاؤن سے کافی دور تھی جب ہم نے کار رکشا کے پاس سے گزاری۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اتفاقاً میری نگاہ نصرت پر پڑ گئی ہے۔ نصرت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ ایک دو سیکنڈ کے لئے وہ مجھے پہچان نہیں سکی پھر ہکا بکا رہ گئی۔ کچھ دیر تک رکشا ہماری کار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر میں نے رکشا ڈرائیور کو ہاتھ

کے اشارے سے روکا۔ اس نے رکشا سائیڈ پر روک دیا۔ میں کار سے اتر کر نصرت کی طرف بڑھا۔ وہ بھی رکشا میں سے باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ چہرے پر کئی رنگ یکجا ہو گئے تھے جن میں پریشانی کا رنگ بھی شامل تھا۔ "تابش بھائی آپ......؟" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ اس کے انداز نے ثابت کیا کہ ثروت نے ابھی تک اسے میری اور اپنی حالیہ ملاقاتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔

میں نے کہا۔ "میں بھی تمہیں دیکھ کر اتنا ہی حیران ہو رہا ہوں جتنی تم۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ شاید اب کبھی......" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

...... قریباً پندرہ منٹ بعد ہماری کار ایک اسنیک بار کے سامنے رک رہی تھی...... عمران کار میں ہی رہا جبکہ میں اور نصرت اتر کر اندر چلے گئے۔ نصرت حیران تھی کہ اس نے اپنا تین چوتھائی چہرہ چادر کے پلوں میں چھپا رکھا تھا پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا...... اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں سے اس کے پیچھے تھے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ میں اسے بہت بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی اور بول چال کے اعتبار سے بھی۔ ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ڈھیروں سوال جواب تھے لیکن نصرت کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لئے ہم اہم سوال و جواب کے دائرے میں ہی رہے۔ نصرت میری بہن فرح اور بھائی عاطف کے بارے میں جاننے کے لئے بہت بے چین تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ دونوں خیر خیریت سے ہیں۔ نصرت نے ہماری والدہ کی وفات پر جو نصرت کی خالہ بھی تھیں، گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے سپاٹ لہجے میں مجھے بتایا کہ ثروت باجی کی شادی ہو چکی ہے اور یہ وہیں ہوئی ہے جہاں ان کی منگنی طے تھی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ اس کی ثروت باجی اپنے گھر میں خوش و خرم ہیں۔ انہیں ایک اچھا شوہر ملا ہے...... اس نے اس "اچھے شوہر" کی دوسری شادی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں نے کہا۔ "نصرت! میں جتنا عرصہ انڈیا میں رہا ہوں، کچھ لوگ بہت ہی شدت سے یاد آتے رہے ہیں۔ ان میں ناصر بھائی بھی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟"

وہ چند سیکنڈ کے لئے چپ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے وہ بہت سی دیگر باتیں چھپا رہی ہے، ناصر بھائی کے بارے میں بھی چھپانا چاہ رہی ہے۔ لیکن پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے ایک بار رونا شروع کیا تو روتی چلی گئی۔ "کیا ہوا نصرت! ناصر بھائی ٹھیک تو ہیں نا؟"

وہ ہچکیوں میں بولی۔ ''وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں تابش بھائی۔ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔'' میرے سینے میں جیسے کوئی شے چھناکے سے ٹوٹی اور بکھر گئی۔ کئی سیکنڈ تک میں کچھ بول نہیں سکا۔ وہ روشن چہرہ میری نگاہوں میں چمکا اور پوری طرح چمک کر ایک دم بجھ گیا۔ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ ''نصرت! کیا ہوا انہیں؟''

''ایکسیڈنٹ۔'' وہ سسک کر بولی۔ ''فرینکفرٹ سے ہمبرگ جاتے ہوئے ان کی کار کا حادثہ ہو گیا۔ ناصر بھائی کی بھی منگنی ہو چکی تھی۔ ان کی منگیتر اور منگیتر کا بھائی بھی اس حادثے میں ختم ہو گئے۔ دو سال ہو گئے ہیں لیکن ہم ابھی تک اس حادثے کے اثر سے نکل نہیں سکے۔''

ہم کتنی ہی دیر تک اس تکلیف دہ موضوع پر بات کرتے رہے پھر دھیرے دھیرے گفتگو میں دیگر موضوعات بھی شامل ہونے لگے۔ میں نے نصرت سے پوچھا۔ ''جب یہ واقعہ ہوا، ثروت کی شادی ہو چکی تھی؟''

''جی تابش بھائی! صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ باجی نے تو اس کا اتنا غم لیا کہ بستر پر پڑ گئیں۔ ایک دفعہ تو ایسے لگنے لگا کہ ان کو بھی کچھ ہو جائے گا۔ بڑی مشکلوں سے دو تین مہینوں بعد کچھ سنبھل سکیں۔''

ناصر کے مرنے کی اطلاع نے ہمیں ایک دم سوگوار کر دیا تھا۔ کسی اور موضوع پر بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دوسری طرف یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ نصرت اگر اب چلی گئی تو پھر شاید جلد ہی اس سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اس کی باتوں اور اس کے انداز سے ''گریز'' صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ پتا چل رہا تھا کہ وہ اس ملاقات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہے کہ اس ملاقات سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے سمجھا دیا کہ ثروت کی کچھ گھریلو مصروفیات ہیں۔ شاید ابھی اس کے لئے ممکن نہ ہو کہ وہ مجھ سے مل سکے۔ اس نے گارڈن ٹاؤن والے گھر کا ادھورا سا ایڈریس تو بتا دیا مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی ثروت باجی اور یوسف بھائی کچھ دنوں کے لئے لاہور سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''نصرت! کیا فرح اور عاطف وغیرہ سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا؟''

وہ بولی۔ ''دل تو بہت کچھ چاہتا ہے تابش بھائی لیکن میں باجی اور یوسف بھائی کی اجازت کے بغیر تو کچھ نہیں کر سکتی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ثروت باجی ابھی کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتیں۔ پھوپی زینب، چچی کلثوم اور تایا شفیق سمیت کئی رشتے دار لاہور میں موجود ہیں لیکن ابھی تک کسی کو پتا نہیں کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ سے بھی...... بس اتفاقاً ہی ملاقات ہو گئی

ہے......''

اس نے یوں کہا جیسے اس ''اَن چاہی'' ملاقات نے اسے خوش تو کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ بہت پریشان بھی کیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''ابھی تم کہاں سے آ رہی تھیں؟''

اس نے ایک اور غلط بیانی کرتے ہوئے کہا۔ ''انارکلی گئی تھی، کچھ چیزیں لینے کے لئے۔''

میں کچھ دیر تک نصرت کی طرف دیکھتا رہا پھر طویل سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''نصرت! ناصر بھائی کی وفات کی اطلاع دے کر تم نے جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے بعد کوئی اور بات چھیڑنے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن کچھ باتیں کرنا ضروری بھی ہیں۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''نصرت! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک سچی لڑکی ہو لیکن اس وقت حالات کی مجبوری تمہارے سچ پر گہرا سایہ ڈال رہی ہے۔''

''مم...... میں سمجھی نہیں تابش بھائی!''

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''نصرت! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چند دن پہلے میں ثروت سے مل چکا ہوں۔ شاید ثروت نے تمہیں یہ بات بتانی مناسب نہیں سمجھی۔''

''آ...... آپ ملے ہیں؟'' وہ ششدر رہ گئی۔

''ہاں نصرت! میں اس سے ملا ہوں اور میں نے اس کے بارے میں کافی کچھ جانا بھی ہے۔ اور جو کچھ میں نے جانا ہے، وہ اس سے بہت مختلف ہے جو تم بتا رہی ہو۔''

میز پر رکھے ہوئے نصرت کے ہاتھوں میں لرزش نمودار ہو گئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''آپ...... کو...... کیا پتا چلا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ثروت اپنے گھر میں بالکل بھی خوش نہیں ہے۔ یوسف کا کہیں معاشقہ تھا۔ اس نے خفیہ طور پر دوسری شادی کی اور پھر دوسری بیوی کو گھر بھی لے آیا۔ اس نے صرف اپنے امیر باپ کے خوف سے ثروت کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ان دونوں میں طلاق تک نوبت پہنچ چکی ہے لیکن ثروت اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ ''آپ غلط نہیں کہہ رہے لیکن صحیح بھی نہیں کہہ رہے۔ شاید کسی نے آپ کو درست نہیں بتایا۔ تھوڑی بہت بات تو ہے میاں بیوی میں...... لیکن ایسی

باتیں تو گھروں میں ہوا ہی کرتی ہیں......"

"کیا یوسف کی دوسری شادی والی بات بھی غلط ہے؟"

"ہاں...... یہ شادی ہوئی تو ہے......لیکن میں سمجھتی ہوں تابش بھائی، یہ سب کچھ عارضی ہے۔ وقتی جذبات کا نتیجہ ہے۔ یوسف بھائی کی اصل اور خاندانی بیوی تو باجی ثروت ہی ہیں۔ مم...... مجھے یقین ہے کہ یوسف بھائی بہت جلد گریس کو چھوڑ دیں گے۔"

میں نے نصرت کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"نصرت! کچھ لوگوں کے چہرے شیشے کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولنا چاہیں بھی تو نہیں بول سکتے۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔"

وہ روہانسی ہوگئی۔ غالباً وہ خوف زدہ تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی انکشاف کی وجہ سے ثروت کے مسائل میں اضافہ ہو اور وہ جو پہلے ہی دکھوں کے بھنور میں ہے، کچھ اور بھی بے حال ہو جائے۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں تابش بھائی! تھوڑی بہت رنجش ضرور ہے لیکن......"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔"کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم ابھی انارکلی سے نہیں بلکہ شاہ جمال سے آرہی ہو۔ وہاں کسی پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر...... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہاں ثروت کی شدید گھریلو پریشانیوں کے سلسلے میں ہی گئی ہوگی۔"

نصرت کا رنگ کچھ اور زرد ہوگیا۔ وہ سٹپٹائی ہوئی آواز میں بولی۔"تابش بھائی! میں آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں۔ آپ ثروت باجی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں...... وہ پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔"

میں نے کہا۔"نصرت! تمہاری بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا تھا۔"بہت دکھی" کو اس کے حال پر چھوڑنا کیا مناسب ہو گا؟ جہاں تک تمہارا مسئلہ ہے نصرت! وہ بھی میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم ڈر رہی ہو کہ ثروت تمہیں مجھ سے ملنے اور صورتِ حال سے آگاہ کرنے پر موردِ الزام ٹھہرائے گی...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں نصرت! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس سارے معاملے میں کبھی تمہارا نام نہیں آئے گا۔ اور میں ایک بھائی کی حیثیت سے تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے ثروت کے مسئلوں میں کوئی چھوٹا سا بھی اضافہ ہو۔"

"لیکن تابش بھائی......"

"لیکن میری بہن! اگر تم کچھ نہ بھی بتاؤ گی تو صورتِ حال میں کوئی خاص فرق نہیں

پڑے گا۔ میں بہت کچھ جان چکا ہوں اور باقی بھی مجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

وہ آبدیدہ ہوگئی۔"تابش بھائی! آپ کیوں خواہ مخواہ خود کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ آپ خود کو اس سارے معاملے سے الگ کیوں نہیں رکھتے؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ یہ جملہ بے دھیانی میں بول گئی تھی لیکن اس جملے میں چھپے ہوئے اندیشے مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے کہا۔"نصرت! ایک طرف تم کہہ رہی ہو کہ سب ٹھیک ہے۔ دوسری طرف مشکلوں کی بات بھی کر رہی ہو۔ جب سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر ثروت کے بارے میں جاننے سے میں مشکل میں کیوں پڑوں گا......؟"

"آپ نہ پڑیں گے لیکن ان کے لئے تو مشکل ہو سکتی ہے نا۔ آپ کو اس معاشرے کا پتا ہی ہے۔ آپ سے زیادہ اور کون جانے گا کہ چار سال پہلے کیا ہوا تھا۔ باجی کچھ گھنٹوں کے لئے گھر سے باہر رہی تھیں اور خیریت سے واپس آگئی تھیں لیکن ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنی باتیں بنی تھیں، اتنی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں کہ ہم زندہ درگور ہو گئے تھے۔ آپ کچھ کر سکے تھے، نہ ناصر بھائی، نہ کوئی اور...... تھانے دار اشرف اور گورایا جیسے لوگوں نے سراج کے ساتھیوں والا کردار کیا تھا اور ہمیں بے بس کر کے دکھ دیا تھا...... آپ کے سامنے ہی تو ابا جی کی لاش اٹھی تھی تابش بھائی۔ امی کے جنازے کو آپ نے بھی کندھا دیا تھا...... کس طرح ایک ہنستا بستا گھر اجڑا تھا تابش بھائی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ اس کی مار بڑی سخت ہے تابش بھائی۔ ہم اور طرح کے لوگ ہیں، ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے......"

میری اور نصرت کی گفتگو جاری تھی جب اچانک میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ ہال کے ایک گوشے میں گئی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ وہاں دھاری دار کوٹ والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص موجود تھا۔ اس کی پھولی ہوئی ناک اس کے چہرے پر خاصی نمایاں تھی۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص سیٹھ سراج اور شیرے کے ساتھیوں میں سے ہے۔ اور اگر وہ یہاں موجود تھا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے نصرت کا خیال ہی آیا۔ وہ میرے ساتھ یہاں موجود تھی اور کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھی۔

میں نے بائیں ہاتھ سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دایاں ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھایا اور بڑی آہستگی سے اعشاریہ پانچ کا پستول نکال لیا۔ ایک ہی ہاتھ سے میں نے اس کا میگزین علیحدہ کر کے اس میں گولیوں کی تعداد دیکھی اور پھر اسے دوبارہ اٹیچ کر کے سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

نصرت کو شک پڑ گیا تھا کہ میں ٹیبل کے نیچے کچھ کر رہا ہوں۔ اس کی نظر کا زاویہ بدلا اور اس نے میری گود میں سیاہ رنگ کا پستول دیکھ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی چہرے پر زردی چھا گئی۔ ''آ...... آپ کے پاس پستول ہے بھائی؟''

میں اسے کیا بتاتا کہ اب میرے ہاتھوں میں پھول، کتابیں، خوشبوئیں اور امن آشتی کی لکیریں نہیں ہیں۔ اب یہ ہاتھ بہت بدل چکے ہیں۔ اب ان ہاتھوں کے اثاثے کچھ اور طرح کے ہیں۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''نصرت! ایک ایسا بندہ یہاں موجود ہے جو کوئی غلط حرکت کر سکتا ہے۔ اگر کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تو تم...... پچھلے دروازے سے نکل کر چھوٹی سڑک پر چلی جانا۔ جو سواری بھی ملے، اس میں بیٹھ کر نکل جانا۔''

''ل ل...... لیکن۔''

''اگر کوئی پیچھا کرے تو پولیس اسٹیشن سامنے ہی ہے۔ سوڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔''

نصرت کا پورا جسم لرزنے لگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ گوشے میں بیٹھا ہوا موٹی ناک والا الرٹ ہو گیا ہے۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اسے دیکھ کر چونکا ہوں۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ وہ اپنی میز چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے والا ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ نصرت کو وہیں پر چھوڑ کر میں عام سے انداز میں اٹھا اور گوشے کی طرف بڑھا۔ وہ شخص تاڑ گیا کہ میں اس کی طرف آ رہا ہوں۔ یکایک اس نے اپنا ہاتھ اپنے دھاری دار کوٹ کی جیب میں ڈالا اور پستول نکال لیا۔ یقیناً اس نے جو کرنا تھا، اس کا فیصلہ وہ پہلے سے کر چکا تھا۔ میں ابھی اس سے آٹھ دس قدم دور تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے بے دریغ مجھ پر فائر کیا۔ میں فائر کے دھماکے سے پہلے ہی جھک گیا تھا۔ گولی ایک میز پر رکھے ہوئے ایک خاتون کے سنہری شولڈر بیگ میں لگی۔ میں نے بیگ کو اچھل کر نصرت کے پاؤں میں گرتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا، میرے ہاتھ میں دبے پستول کی نال سے شعلہ نکلا۔ گولی حملہ آور کے کندھے میں کہیں لگی۔ وہ پیچھے کی طرف گرا لیکن گرتے گرتے ساتھ ہی اٹھا اور ایک خالی میز کو الٹاتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ پورے اسنیک بار میں کہرام مچ گیا تھا۔ میزیں الٹ رہی تھیں، برتن گر رہے تھے...... لوگ بھاگ رہے تھے۔

میں پوری رفتار سے موٹی ناک والے شخص کے پیچھے لپکا۔ ابھی میں نے آٹھ دس قدم ہی اٹھائے تھے کہ میری بائیں، جانب سے ایک پرچھائیں سی مجھ پر جھپٹی۔ یوں لگا جیسے رفتار سے بھاگتا ہوا کوئی ٹرک مجھ سے آن ٹکرایا ہے۔ میں ایک میز کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک خاتون کو روندتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ شیشے کی ایک نہایت خوب صورت سائیڈ ٹیبل میری ٹکر سے چکنا چور ہوئی۔ دیوار کے ساتھ میرے سر کا بھی زوردار تصادم ہوا تھا۔ یہ میری غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جس نے مجھے بے ہوش ہونے سے بچایا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں بھنا کر اٹھا، کرخت شکل و صورت والا ایک گرانڈیل شخص میرے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا لمبا چاقو تھا۔ بڑی بیدردی سے اس نے میرے پیٹ پر وار کیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر خود کو بمشکل بچایا پھر بھی چاقو کی نوک میری چرمی جیکٹ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے طوفانی مکا اس کے چوڑے جبڑے پر رسید کیا...... وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اسے جبڑے پر میری دوسری ضرب سہنا پڑی۔ غالباً اسے ایسی زوردار ضربوں کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن کھو کر شیشے کے طویل کاؤنٹر سے ٹکرایا۔ تب دوبارہ اچھل کر میری طرف آیا۔ اس مرتبہ میں نیچے جھکا، مہلک چاقو میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ میرے اردگرد سے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں خواتین کی آوازیں نمایاں تھیں۔ میں نے گرانڈیل شخص کے پہلو پر زوردار لات رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ یقیناً اس کی ایک آدھ پسلی اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے گرے ہوئے پستول کے لئے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ اس دوران میں میرے مدِمقابل کو جو ایک سیکنڈ کا وقفہ ملا، اس میں اس نے بار کے عقبی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کھلا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ کس میں اتنی جرأت تھی کہ اسے روکتا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ بار سے نکلتے ہی وہ یوں اوجھل ہوا جیسے زمین میں کہیں سما گیا ہو۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، وہ کہیں نہیں تھا...... یوں لگا جیسے وہ کسی قریبی دکان میں گھسا ہے اور پھر دوسری طرف سے نکل گیا ہے۔

اسنیک بار کے ملازمین اور مالک بھی میرے اردگرد موجود تھے اور چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن حملہ آور اوجھل ہو چکا تھا۔ پھر مجھے نصرت کا خیال آیا...... وہ کہاں تھی؟ میرا اندازہ تھا کہ وہ میری ہدایت کے مطابق بھاگی نہیں ہے بلکہ وہیں کہیں دبک گئی ہے۔ یہ اندازہ درست تھا۔ وہ بار ہی کے ایک گوشے سے نکلی اور روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب مجھے عمران بھی نظر آیا۔ بار میں دو گولیاں چلی تھیں اور یقیناً یہ آوازیں پارکنگ میں عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ ''کیا ہوا تابی! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' اس نے مجھے سرتاپا دیکھا۔

''ہاں، ٹھیک ہوں۔ سیٹھ سراج کے بندے تھے۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

عمران کی نگاہ میری کٹی ہوئی جیکٹ پر پڑی اور اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس

ہوا۔ ہمارے اردگرد ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہم واپس بار کے اندر آئے۔ میں نے سب سے پہلے اپنا پستول تلاش کیا اور جیب میں ڈالا۔ بار کے ہال میں کافی نقصان ہوا تھا۔ پتلون اور جرسی والی ایک جواں سال لڑکی ہنگامے کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی، اسے ہوش میں لایا جا رہا تھا۔

کون تھے یہ لوگ؟ کیا چاہتے تھے؟ انہوں نے کیوں حملہ کیا؟ اس طرح کے بہت سے سوال مجھ سے پوچھے جا رہے تھے۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تابی! تم نصرت کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ یہاں کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

لیکن جب میں نصرت کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا تو اسنیک بار کے ”منیجر مالک“ نے مجھے روک لیا۔ ”جناب! آپ رکیں۔ میں نے پولیس کو بلایا ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”ان کو جانے دو۔ ان کے ساتھ خاتون ہے۔ ان کی جگہ میں ہوں یہاں۔“

مالک بولا۔ ”آپ بھی رک جائیں۔ پانچ دس منٹ کی بات ہے۔ وہ لوگ پہنچ ہی رہے ہوں گے۔“ مالک کو یقیناً زیادہ فکر توڑ پھوڑ سے ہونے والے اپنے نقصان کی تھی۔

عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ دونوں یہاں کھڑے رہیں...... اور ابھی کسی طرف سے کوئی اور حرامزادہ ان پر گولی چلا دے...... ان کو جانے دو۔ ان کے سارے معاملات کے لئے میں جو ہوں یہاں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم نکلو تابش! یہ لو گاڑی کی چابی۔“

عمران کے تحکمانہ لہجے نے بار کے مالک کو چپ کرا دیا۔ میں ڈری سہمی نصرت کو لے کر پارکنگ میں آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے آ کر میں نے دیکھا کہ ایک پولیس موبائل جس میں ایک سُست الوجود تھانے دار بھی بیٹھا تھا، اسنیک بار کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اس معاملے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسے مسئلوں کو عمران چٹکیوں میں حل کرتا ہے۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے۔

ہم گلبرگ مین مارکیٹ کی طرف نکل آئے اور پھر ایک اور ریستوران میں جا بیٹھے۔ اپنی کٹی ہوئی جیکٹ میں نے گاڑی میں ہی رہنے دی تھی۔ نصرت کے چہرے پر اب تک حیرت جمی ہوئی تھی۔ اسے جیسے میرے اس روپ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ روپ اُس روپ سے

یقیناً بہت مختلف تھا جو وہ بچپن سے لے کر چار سال پہلے تک دیکھتی رہی تھی۔ دبلا پتلا، کم گو اور دبو تابش بھائی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آج اس نے جس تابش کو دیکھا تھا، وہ نہ صرف مار دھاڑ کر سکتا تھا بلکہ آتشیں اسلحے کا استعمال بھی اس کے لئے معمولی بات تھی۔ نصرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ میں نے دو خطرناک غنڈوں سے ٹکر لی تھی بلکہ انہیں بھاگنے پر بھی مجبور کیا تھا۔ اس واقعے کی شدت نے اسے ابھی تک لرزہ براندام کر رکھا تھا۔

”آپ بہت بدل گئے ہیں تابش بھائی۔ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں کسی اور شخص سے مل رہی ہوں۔“ وہ کانپتی سی آواز میں بولی۔

”یہ تم تعریف کر رہی ہو یا ناپسندیدگی ظاہر کر رہی ہو؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تابش بھائی! مجھے لگتا ہے کہ آپ...... بہت خطرناک قسم کا وقت گزار رہے ہیں۔ آپ کے آس پاس جو لوگ ہیں، وہ بھی خطرناک ہیں۔ یہ آپ کا دوست کون ہے جس نے ذمے داری لے کر ہمیں وہاں سے نکالا ہے؟“

”یہ بھی ہے ایک۔ تم اسے جانو گی تو تمہاری یہ موجودہ حیرت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں نصرت جن کو دیکھ کر زندہ رہنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔“

نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ نصرت میں وہ جھجک اور وہ خوف کی کیفیت کم ہو گئی ہے جو اس ملاقات کے شروع میں اس میں نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میری بدلی ہوئی شخصیت دیکھی تھی۔ عورت ایک کمزور صنف کا نام ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر سہارے، تحفظ اور مضبوطی کی طلب ہوتی ہے۔ اور یہ صفات اسے جہاں بھی نظر آتی ہیں، کشش کرتی ہیں۔

میں گفتگو کے ذریعے اسے ہفتوں تک قائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تو بھی شاید کامیاب نہ ہوتا لیکن بار میں پیش آنے والے اس ایک واقعے نے نصرت کو اس کے سخت خول کے اندر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرنے کے راستے پر گامزن ہو گئی تھی۔ وہ اب تفصیل سے جاننا چاہ رہی تھی کہ میں اتنا عرصہ کہاں اور کس حال میں رہا ہوں۔ کن کن مرحلوں سے گزرا ہوں۔ کن کن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے...... اور کیا ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے دونوں گھرانوں کی زندگیوں کو تباہ کیا۔

میں اسے گزرے ماہ و سال کے سارے حالات تو نہیں بتا سکتا تھا تاہم چیدہ چیدہ واقعات سے اسے آگاہ کیا...... نصرت نے اپنے موبائل فون سے گھر میں ثروت کو فون کر دیا اور اسے بتایا کہ اسکول کے دور کی ایک دوست اسے مل گئی ہے، اس لئے وہ کچھ دیر بعد آئے

گی۔ میں نے ایک بار پھر ثروت اور اس کے گھریلو حالات والا موضوع چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ نصرت کی آنکھوں میں فوراً نمی جاگ گئی۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد گھمبیر آواز میں بولی۔ ’’تابش بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ باجی کے گھریلو حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ یوسف بھائی نے اپنے مطلب کے لئے باجی کو کھلونا بنا رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کی حیثیت اس گھر میں بیوی کی ہے ہی نہیں۔ بیوی تو وہی گریس ہے۔ یوسف بھائی نے اس کا اسلامی نام حدیقہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ جب بندے کا دل نہ بدلے تو کچھ نہیں بدلتا۔ وہ صرف نام کی مسلمان ہے۔ اس نے یوسف بھائی پر پوری طرح قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ شاید بے دام کی غلامی اسی کو کہتے ہیں۔‘‘

’’کیا یہ گریس والا معاملہ ثروت سے شادی کے بعد شروع ہوا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

نصرت نے آنسو پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ’’نہیں تابش بھائی! یہ چکر پہلے سے چل رہا تھا۔ یوسف بھائی فرینکفرٹ کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر تھے۔ یہ وہاں ان کی ماتحت تھی۔ وہیں سے یہ افیئر شروع ہوا۔ یوسف بھائی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے والد فاروقی صاحب کی وجہ سے ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ جرمن لڑکی سے شادی کر کے وہ والد کی جائیداد سے عاق ہو سکتے تھے۔ فاروقی صاحب اپنی جائیداد کا تقریباً آدھا حصہ اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ آدھا حصہ بھی پندرہ سولہ لاکھ روپوں سے کم کا نہیں تھا۔ یوسف بھائی نے باجی ثروت سے شادی کر لی اور کچھ ہی ہفتے بعد فاروقی صاحب نے پراپرٹی یوسف بھائی کے نام کر دی۔ پراپرٹی نام ہو گئی تو یوسف بھائی نے اپنا اصل کھیل کھیلا اور ایک فیک اجازت نامے کے ذریعے گریس سے میرج کر لی۔ نہ صرف میرج کر لی بلکہ اسے گھر بھی لے آئے۔ اس موقع پر باپ بیٹے میں تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے...... لیکن آہستہ آہستہ یوسف بھائی نے فاروقی صاحب کو منا لیا...... فاروقی صاحب نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ لاہور میں اپنا پرانا گھر ثروت باجی کے نام کریں گے۔ اس کے علاوہ یوسف بھائی دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک کریں گے اور ثروت باجی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’تمہاری بات سمجھ آ رہی ہے نصرت...... کیونکہ ابھی فاروقی صاحب کی آدھی جائیداد کا فیصلہ ہونا باقی ہے اس لئے یوسف اپنے باپ کی خواہش کے مطابق ثروت کو برداشت کرنے پر مجبور ہے۔‘‘

’’بالکل ایسا ہی ہے تابش بھائی۔‘‘ نصرت نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ’’یوسف بھائی

گریس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس گھر میں باجی کے لئے کوئی جگہ نہیں اور نہ کبھی ہو گی۔ ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ یوسف بھائی سے خلع حاصل کر لیں...... اور انہیں نورا مل بھی سکتا ہے۔ لیکن...... وہ اس کے بارے میں سننا بھی پسند نہیں کرتیں۔ وہاں ہر دکھ سہہ رہی ہیں لیکن حالات کی اس ستم ظریفی کو سمجھنے کے لئے بالکل تیار نہیں کہ وہ ایک غلط جگہ پر، غلط لوگوں کے درمیان، غلط حیثیت سے آ گئی ہیں۔‘‘

نصرت کا چہرہ کرب کی آماجگاہ تھا۔ اپنی جوان سال من موہنی بہن کا دکھ اس کی آنکھوں میں جم کر رہ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔ پھر اپنائیت کے انداز میں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ’’تابش بھائی جان! میں آپ کو یوسف بھائی اور باجی کے بارے میں ایک اور خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن حقیقت وہی ہے جو میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں......‘‘

میں تجسس سے نصرت کی طرف دیکھنے لگا۔ نصرت نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی......

قسط ۲۸

وہ انکشاف انگیز انداز میں بولی۔ ’’ان کے درمیان میاں بیوی والا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یوسف بھائی بری طرح گریس کی محبت میں گرفتار ہیں...... انہوں نے والد کے مجبور کرنے پر اور اپنی بیمار والدہ کی خاطر باجی ثروت سے شادی تو کر لی مگر ان سے ہمیشہ دور رہے۔ باجی سے شادی کے صرف چھ مہینے بعد ہی انہوں نے گریس سے نکاح کر لیا تھا۔ ایک مہینا اس شادی کو خفیہ رکھنے کے بعد وہ گریس کو گھر لے آئے۔ اس کام کے لئے انہیں یقیناً گریس نے ہی مجبور کیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ یہ رشتہ چھپا رہے۔‘‘

نصرت جو کچھ بتا رہی تھی، وہ واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ثروت شادی شدہ تھی اور نہیں بھی۔ اسے ثانوی بیوی کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ اسے ایک شخص بڑی بے حسی سے صرف اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ اسے صرف اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے باپ کی طرف سے جائیداد اس کے نام منتقل ہو جائے۔ ایک دو یا پھر تین چار سال بعد جب بھی جائیداد اس کے نام منتقل ہو جاتی، وہ ثروت کو دھکا مار کر گھر سے نکال سکتا تھا۔

وہ اس گھر میں ایک بیکار شے کی طرح پڑی تھی جیسے کوئی اَن چاہی مہمان...... یا پھر کوئی بے ضرورت فرنیچر یا کوئی فالتو کپڑا۔ لیکن کیا وہ واقعی اَن چاہی، بے ضرورت یا فالتو تھی؟

میرے سینے میں انگارے دہکے اور آنکھیں جل اٹھیں۔ اسے کیا پتا وہ کیا تھی؟ کسی کے لئے اس کی کیا اہمیت تھی؟ کوئی کس کس طرح اس کے لئے تڑپا تھا اور اب بھی تڑپ رہا تھا۔ وہ تو زندگی کا دوسرا نام تھی، وہ تو ہزار ہا روز و شب کا حاصل تھی۔ اَن گنت دعاؤں کا گمشدہ ثمر تھی۔ میں نے چند روز پہلے اسے دیکھا تھا اور میری آنکھیں اب تک اس کی دید سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ اس کا ملیح چہرہ، اس کی آبگینہ آنکھیں، اس کی دل کی گہرائی تک اُتر جانے والی آواز، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔

''آپ کس سوچ میں کھو گئے تابش بھائی جان؟'' نصرت کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

میرے اور نصرت کے درمیان ثروت کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی۔ نصرت کے خیالات وہی تھے جو وہ اس سے پہلے پیر احمد تھانوی کے سامنے بیان کر چکی تھی۔ اس نے احمد تھانوی صاحب کو بتایا تھا کہ وہ اپنی بہن کے سارے گھریلو معاملات کو بڑی گہرائی سے دیکھتی رہی ہے اور اس کے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی بہن اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے۔

میں نے کہا۔ ''نصرت! اس بارے میں ثروت سے کبھی تمہاری کھل کر بات ہوئی ہے؟''

نصرت بولی۔ ''یہ کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ہم جرمنی میں ہی تھے۔ میں نے کئی دفعہ باجی کو کمرے میں بند ہو کر روتے دیکھا تھا۔ بے شک ناصر بھائی کی موت کا غم بھی ابھی پوری طرح بھولا نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی کہ یہ اور طرح کا غم ہے۔ ایک دن جب وہ سوچی سوچی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں، میں نے ان سے وجہ پوچھی تو وہ بولیں کہ پاکستان بہت یاد آ رہا ہے۔ پتا نہیں فرح اور عاطف کہاں ہوں گے، کیا کر رہے ہوں گے اور پھوپی زینب اور ماموں عرفان۔ میں نے کہا باجی! آپ نے سب کا نام لیا ہے لیکن تابش بھائی کا نہیں لیا، ان کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ میں نے کہا مجھے پتا ہے باجی! آپ ان کو بہت یاد کرتی ہیں۔ وہ ہر وقت آپ کے خیالوں میں رہتے ہیں۔ آپ انہیں بھولی ہیں نہ کبھی بھول سکیں گی۔ وہ سسکنے لگیں۔ میں نے کہا، باجی! آپ دہری زندگی جی رہی ہیں۔ یہ کسی طور بھی مناسب نہیں۔ یوسف بھائی آپ کے نہیں ہیں اور نہ کبھی ہوں گے اور جو آپ کا ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ کیوں یوسف بھائی سے طلاق نہیں لے لیتیں۔ کیوں کسی کے مفاد کے لئے خود کو برباد کر رہی ہیں۔

''تابش بھائی! ان دنوں میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ باجی شاید اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہیں۔ لیکن انہی دنوں میں بیمار پڑ گئی۔ سینے میں دائیں طرف ذرا نیچے درد شروع ہو گیا۔ تیز بخار اور رات کے وقت متلی کی شکایت بھی شروع ہو گئی۔ اسپتال داخل ہونا پڑا۔ میری تکلیف کے دنوں میں یوسف بھائی نے بھی کافی ذمے داری اٹھائی اور بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ایسے کاموں میں وہ کافی ماہر ہیں۔ ناراض دوستوں کو منا لینا، جہاں کوئی مطلب ہو وہاں اپنے لئے جگہ بنا لینا، ضرورت ہو تو نرم پڑ جانا، ضرورت نہ ہو تو پتھر کی طرح سخت ہو جانا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید انہی دنوں میں باجی نے ایک بار پھر اپنا خیال بدل دیا۔ ویسے بھی ان کے پاس آپ کی کوئی خبر نہیں تھی، نہ پاکستان میں ہمارے کسی اور عزیز کو آپ کے اور فرح، عاطف کے بارے میں کچھ پتا تھا۔ ایسے میں بندہ کتنی دیر تک جھوٹی آسوں، امیدوں کا سہارا لے سکتا ہے۔ پھر جو کچھ بھی تھا باجی کی حیثیت ''شادی شدہ'' کی تھی۔'' نصرت کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

اس نے بیگ سے ٹشو نکال کر آنکھیں صاف کیں اور قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی! پھر میں نے ایک دن دیکھا کہ باجی نے کئی پرانے کاغذ جلا کر پھینک دیئے۔ وہ ڈائری بھی لکھا کرتی تھیں، وہ بھی پھاڑ کر جلا دی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس دن باجی نے آپ کے حوالے سے اپنے دل میں موجود ہلکی ہلکی امید بھی کھرچ کر پھینک دی۔ شاید انہوں نے اپنے حالات پر ہمیشہ صابر شاکر رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن نصرت...... اس کے بعد وہ یوسف صاحب سے ناراض ہو کر اکیلی پاکستان آئی اور کئی ماہ اکیلی یہاں رہی تھی؟''

''وہ دوسرا معاملہ تھا تابش بھائی! گریس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا تھا...... اس نے یوسف بھائی کو بھی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر دو مہینے کے اندر اندر انہوں نے باجی کو علیحدہ گھر لے کر نہیں دیا تو وہ خود گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ یہ شرط بھی لگا رہی تھی کہ یوسف بھائی، باجی سے برائے نام رابطہ بھی نہیں رکھیں گے۔ جب معاملہ بہت بڑھا تو باجی نے اپنی کچھ جیولری بیچ کر ٹکٹ کے پیسے اکٹھے کئے اور یوسف بھائی کے نام ایک طویل خط لکھ کر خاموشی سے پاکستان آ گئیں۔''

''اور تم؟''

''میں ان دنوں یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔''

"پھر تم لوگ ثروت کے پیچھے یہاں کیسے آئے؟"

"میرے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ یوسف بھائی کے والد انکل فاروقی ہیں۔ وہ تیس چالیس سال جرمنی میں رہے ہیں لیکن اب ان کی خواہش ہے کہ یوسف بھائی یہاں پاکستان میں اپنا گھر بنوائیں اور وہ اپنی زندگی کے آخری سال اپنے وطن میں گزار سکیں۔ باجی کے خاموشی سے پاکستان آجانے کے بعد انکل فاروقی ازحد پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یوسف بھائی جلد از جلد پاکستان پہنچیں اور باجی کو تلاش کریں۔ نہ صرف تلاش کریں بلکہ یوسف بھائی اور گریس دونوں ان سے معاف بھی مانگیں۔"

"تو کیا یوسف آسانی سے پاکستان آنے پر راضی ہوگیا؟"

"آسانی سے تو نہیں تابش بھائی لیکن ظاہر ہے کہ کروڑوں کی جائیداد کا معاملہ ہے۔ انہیں انکل فاروقی کی بات ماننا پڑ رہی ہے۔ شروع میں یوسف بھائی نے مزاحمت کی...... انہوں نے فاروقی صاحب سے کہا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے ہمایوں کو پاکستان جانے پر آمادہ کریں مگر ہمایوں کی جاب کچھ اور طرح کی ہے۔ یوسف بھائی کے لئے یہ آسانی ہے کہ وہ پاکستان آکر بھی جرمن کمپنی میں اپنی جاب بحال رکھے ہوئے ہیں۔ وہ یہیں پاکستان میں کام کرکے بذریعہ نیٹ جرمنی کے مین آفس میں بھیج دیتے ہیں۔ زیادہ ضرورت ہو تو وہاں کا چکر لگا لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پاکستان آکر یوسف نے ثروت کو کیسے ڈھونڈا...... اور وہ معافی والی بات کیا ہوئی؟"

"یہ تو پتا نہیں کہ باجی کو کیسے ڈھونڈا...... بہرحال وہ یوسف بھائی کو مل گئیں۔ وہ یہاں اپنی ایک پرانی دوست کے پاس رہ رہی تھیں اور اسی کے دفتر میں ملازمت بھی کر رہی تھیں۔ جہاں تک معافی کا تعلق ہے، ضرورت پڑنے پر یوسف بھائی معافی تلافی بھی کر لیتے ہیں لیکن یہ سب کچھ وقت گزاری کے لئے ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، گریس نے بھی ثروت سے معافی مانگی ہوگی؟"

"اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نصرت نے فوراً کہا۔ "اس میں بہت زیادہ اکڑ ہے۔ ابھی دو دن پہلے بھی اس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا ہے۔ معمولی سی بات تھی۔ اس نے ٹی وی کی آواز بہت اونچی کر رکھی تھی۔ باجی نے بس آواز کم کرنے کو کہا......"

میں یہ سارا واقعہ ملازمہ حمیدن کی زبانی سن چکا تھا۔

میرے اور نصرت کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی۔ نصرت کو اس سلسلے میں بہت

تجسس تھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ مجھے اس معاملے میں نصرت سے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں ابھی اس شادی کے بارے میں بتا کر نصرت کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میرا ارادہ مستقل طور پر اس شادی کو چھپانے کا ہو۔

نصرت اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ثروت کو یوسف جیسے مطلب پرست اور حیلہ ساز شخص کی زندگی سے نکل جانا چاہئے۔ اس نے مجھ سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا۔

میں نے کہا۔ "نصرت! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا اور ثروت کا کیا رشتہ تھا۔ اگر اس سلسلے میں، میں ثروت سے ملوں گا یا کوئی بات کروں گا تو اس کا الٹا اثر ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں اپنے مطلب کے لئے اس کی ازدواجی زندگی کے مسئلوں کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تو پھر کیا کیا جائے تابش بھائی! انہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ان کے سامنے گہرا کنواں ہے۔ اگر وہ......"

"میری بات سنو نصرت۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ایک بڑی اچھی تجویز دیتا ہوں۔ اگر تم واقعی سمجھتی ہو کہ معاملات "پوائنٹ آف نو ریٹرن" تک پہنچ چکے ہیں اور یوسف سے علیحدگی ہی ثروت کے لئے آخری حل ہے...... تو پھر تم اس سلسلے میں احمد تھانوی صاحب سے مدد لو۔ وہ ایک بڑی متوازن روحانی شخصیت ہیں۔ تم ثروت کو ان سے ملواؤ۔ ساری بات کھول کر بیان کرو اور پھر ان سے مشورہ لو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ حالات کے مطابق بالکل ٹھیک مشورہ دیں گے۔ ان میں قائل کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جو مشورہ دیں، اس پر ثروت کو قائل بھی کر لیں۔"

نصرت گہری سوچ میں کھو گئی۔ پتا نہیں کیوں وہ کچھ مضمحل سی نظر آتی تھی۔ اس کے رنگ میں ایک پھیکا پن تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ صورتِ حال ان گھریلو پریشانیوں ہی کا نتیجہ ہے جن کا سامنا وہ اس وقت کر رہی ہے۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "اگر آپ سچ پوچھیں تابش بھائی تو آج آپ سے ہونے والی اس اچانک ملاقات نے میرے اندر بہت حوصلہ جگایا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ ناصر بھائی کے بعد میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ جو کچھ بھی جھیلنا ہے، مجھ اکیلی کو جھیلنا ہے مگر آج ایسا نہیں ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "تم اپنی ہر فکر، پریشانی مجھے دے دو۔ بالکل ریلیکسڈ ہو جاؤ۔ تمہارا یہ بھائی سب کچھ سنبھال لے گا۔ تم اپنی صحت کی طرف بھی توجہ دو۔ مجھے بہت تھکی ہوئی سی نظر آتی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ ''ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ پھر ناصر بھائی چلے گئے اور یہیں پر بس نہیں ہوئی۔ باجی پر جو گزر رہی ہے، وہ بھی آپ کو پتا چل گیا ہے۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی اس ہنستے بستے گھر کو۔''

''ہر رات کے بعد سویرا اور ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہوتی ہے نصرت۔ انسان ہمت نہ ہارے اور انتظار کرے تو سب ٹھیک ہوا جاتا ہے۔''

وہ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ ''تابش بھائی! آج آپ سے مل کر میں خوش ہوئی ہوں اور مجھے بہت ڈر بھی لگا ہے۔ ابھی اس اسنیک بار میں ہونے والی لڑائی نے مجھے بہت ڈرایا ہے۔ کہیں یہ معاملہ زیادہ سیریس تو نہیں ہو جائے گا۔ مم...... میرا مطلب ہے وہاں گولیاں چلی ہیں۔ آپ نے بھی گولی چلا کر ایک بندے کو زخمی کیا ہے۔ اگر......''

''اس بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں نصرت۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا یہ بھائی بہت بدل چکا ہے۔ اب ان غنڈوں جیسے کن مٹے اس کی جیب میں رہتے ہیں۔'' میں نے ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

میری اس مسکراہٹ نے اس کی آنکھوں میں اطمینان آمیز حوصلے کی چمک کو نمایاں کر دیا۔

O......❖......O

میری توقع کے عین مطابق عمران نے اسنیک بار میں ہونے والے پھڈے سے بخوبی نمٹ لیا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے وہاں ہونے والے نقصان کے ضمن میں کوئی رقم بھی مالک کو نہیں دی تھی۔ صرف ایک زخمی ہونے والے ویٹر کی اشک شوئی کے لئے اس نے اپنی خوشی سے دو ڈھائی ہزار روپے دیئے تھے۔ اس سارے واقعے میں ہمارے لئے مایوسی کا پہلو بس یہی تھا کہ سیٹھ سراج کا سراغ پھر لگتے لگتے رہ گیا تھا۔ دونوں حملہ آور گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ تاہم عمران کے کہنے پر جیلانی اپنے طور پر ان کا کھوج ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

اس صورتِ حال میں عمران نے میرے ساتھ طویل مشورہ کیا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ سراج کے لوگ ہمارے اردگرد موجود ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت خونی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم فرح، عاطف، بالو اور شاہین وغیرہ کی حفاظت کا سوچیں۔ بے شک ہم رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں آتے جاتے ہوئے بے حد احتیاط سے کام

لیتے تھے مگر کسی بھی وقت یہ احتیاط دھری کی دھری رہ سکتی تھی۔

سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں عمران کے راوی روڈ والے پرانے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور اسی گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں گے۔ اقبال بھی اب چھٹی گزار کر بالکل فٹ ہو چکا تھا اور سیٹھ سراج اینڈ کمپنی کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ ایک دن میں، عمران اور اقبال خاموشی سے راوی روڈ والے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ جیلانی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ حفاظت کی غرض سے رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں ہی موجود رہے گا۔

جس روز ہم شفٹ ہوئے، اسی روز نصرت نے ثروت کے ہمراہ پیر احمد تھانوی صاحب سے ملاقات بھی کی۔ یہ ایک تفصیلی ملاقات تھی۔ یقیناً ثروت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ملاقات نصرت نے میرے ایما پر کرائی ہے اور نہ ہی اس کے گمان میں یہ بات تھی کہ چند روز پہلے اتفاقاً میری اور نصرت کی ایک نتیجہ خیز ملاقات ہو چکی ہے۔

جس وقت نصرت اور ثروت ایک رکشے پر سوار ہو کر احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لئے آئیں، میں اور عمران بھی وہیں موجود تھے۔ تاہم ہم ان دونوں کے سامنے نہیں آئے۔ ثروت زرد پھولوں والی ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں...... جیسے بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کا ایک روشن کنارہ۔ وہ جب چلتی تھی تو ایک عجیب جاذبیت سی اس کے گرد ہالہ سا بنائے رکھتی تھی۔ وہ انتظار گاہ میں چلی گئیں۔ ہم اس کمرے کے پہلو والے کمرے میں چلے گئے جہاں...... تھانوی صاحب اپنے مریضوں اور عقیدت مندوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ ایک قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے تھے۔ ان کے عقب میں ایک بہت بڑی الماری تھی جس میں یونانی طب کی مختلف دوائیں پڑی رہتی تھیں۔ وہ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے تھے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ اتنا پختہ ہوتا تھا کہ وہاں سے اٹھنے سے پہلے دعا ان پر اثر کر جاتی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ثروت کی باری بھی آ گئی۔ نصرت باہر ہی رہی تھی۔ ثروت نے اکیلے میں احمد تھانوی صاحب سے ملاقات کی۔ ہم انہیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے مگر چونکہ دروازے کے بالکل قریب موجود تھے اس لئے مدھم آوازیں ہم تک ضرور پہنچ رہی تھیں۔ ثروت کے بیشتر حالات تو احمد تھانوی صاحب پہلے ہی جانتے تھے۔ ثروت نے کچھ مزید تفصیلات بتائیں۔ تاہم اس نے یہ بات احمد تھانوی صاحب پر ظاہر نہیں کی کہ وہ یوسف کی بیوی ہونے کے باوجود بیوی نہیں ہے۔ ساری باتیں سننے کے بعد احمد تھانوی صاحب نے

شرعی صورتِ حال بیان فرمائی۔ انہوں ء نے کہا۔ ''ہمارے دین میں طلاق...... ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور اس سے حتی الامکان بچنے کا حکم ہے...... بہرحال، یہ ایک جائز عمل ہے اور بعض صورتوں میں تو ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک نیک خصلت لڑکی بدقسمتی سے ایک ایسے شوہر کے پلے بندھ جاتی ہے جو بعدازاں عادی شرابی، جواری نکل آتا ہے...... تو ساری زندگی اس شخص کے ساتھ بربادی کرنے کے بجائے اور اپنے ہونے والے بچوں کا مستقبل بھی تاریک کرنے کے بجائے اس بی بی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ناپسندیدہ عمل کو اختیار کر لے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں بھی اگر کوئی کم فہم شخص اپنی بیٹی، بہن یا بچی سے یہ کہتا ہے کہ جس گھر میں اس کی ڈولی گئی ہے، اسی گھر سے اس کا جنازہ نکلنا چاہئے تو وہ بالکل غلط کہتا ہے۔''

ثروت نے دبی آواز میں کہا۔ ''حضرت! یہ حکم بھی تو ہے کہ اگر پہلی بیوی اپنے شوہر پر اپنا حق چھوڑ کر یا اس حق کو کم کر کے اس کے ساتھ رہنا چاہے تو ایسا کر سکتی ہے؟''

''بالکل، ایسا کہا گیا ہے لیکن عام طور پر ان عورتوں کے لئے ہے جو بڑی عمر کی ہوں، بال بچے دار ہوں یا اس قسم کی کوئی اور وجہ ہو۔ لیکن بیٹی! جو صورتِ حال تم بتا رہی ہو، وہ اور طرح کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ شک بھی ہو رہا ہے کہ تم طلاق کے حوالے سے کسی طرح کے وہم میں بھی جکڑی ہوئی ہو۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے کھل کر بیان کرو۔''

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید ثروت اشک بار ہوگئی تھی۔ جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔ کوئی اڑتا اڑتا سا لفظ ہی ہمارے کانوں تک پہنچ پا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے والدین اور پھر ناصر بھائی کی موت کا ذکر کر رہی تھی اور احمد تھانوی صاحب کو بتا رہی تھی کہ ان پے درپے اموات نے اس کا دل بہت ہلکا کر رکھا ہے۔

یہی وقت تھا جب اچانک قریبی کمرے میں چلانے کی مردانہ آوازیں ابھریں۔ یہ چودھرانی کا بیمار بیٹا نیازا تھا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر تھا پھر بھی کسی وقت اس کا دیوانہ پن عود کر آتا تھا۔ اب بھی ہلکے ہلکے بادل موجود تھے۔ شاید اسے کہیں بجلی کی چمک نظر آتی تھی یا تھوڑی بہت گرج سنائی دی تھی۔ وہ پکار رہا تھا۔ ''یا اللہ کرم...... یا اللہ کرم...... حضرت جی بچاؤ...... حضرت جی کہاں ہو......''

چودھرانی کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی......
''حضرت جی کہیں نہیں گئے۔ وہ یہیں ہیں۔ تم بس منہ میں پڑھتے رہو۔''

''کھڑکیاں بند کر دو۔ برآنڈے کی کھڑکیاں بھی بند کر دو۔'' نیازا چلایا۔

میں اور عمران نیازے کے کمرے کی طرف گئے۔ یہاں کا منظر عبرت ناک تھا۔ نیازا پلنگ سے اتر آیا تھا اور اپنے لحاف سمیت کمرے کے ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ وہ پورے کا پورا لحاف سے ڈھکا ہوا تھا اور لحاف کے اندر سے ہی واویلا کر رہا تھا۔ پورا لحاف لرز رہا تھا۔ چودھرانی نے لحاف سمیت نیازے کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ احمد تھانوی صاحب کا مرید خاص فرید بھی نیازے کو تسلی تشفی دینے لگا۔ کچھ دیر بعد نیازے کی بے چینی میں کمی آ گئی...... ہم واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ دروازے کی دوسری جانب ثروت اور احمد تھانوی صاحب میں گفتگو جاری تھی۔ احمد تھانوی صاحب قدرے بلند آواز میں بول رہے تھے۔ ان کے بیشتر الفاظ ہماری سماعت تک پہنچ رہے تھے...... وہ کہہ رہے تھے۔ ''سمجھو، وہم بس گھن کی طرح ہوتا ہے۔ یہ آوازیں جو تم ابھی سن رہی تھیں، یہ بھی ایک ''ضدی وہم'' کا شاخسانہ ہیں۔ اس بندے کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی اس کی جان لے لے گی۔ ذرا سے بادل آ جائیں تو خوف سے اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ یہ وہم اسی طرح بندے کے ذہن کو جکڑتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کو طاقت اور شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اللہ پر اور اس کی قدرت پر ہمارا یقین جتنا پختہ ہوگا، ہمارے اندر واہموں اور وسوسوں سے لڑنے کی قوت اتنی ہی بڑھ جائے گی......''

ثروت اور احمد تھانوی صاحب کے درمیان یہ گفتگو پانچ دس منٹ مزید جاری رہی پھر اگلے مریض کی باری آ گئی۔

ہم شام کے بعد تک وہیں رہے۔ ثروت اور نصرت جا چکی تھیں۔ دیگر لوگ بھی رخصت ہو چکے تھے۔ احمد تھانوی صاحب رات کا کھانا بہت جلدی کھا لیتے تھے۔ یعنی شام کے فوراً بعد انہوں نے مجھے اور عمران کو بھی کھانے میں شریک کیا۔ کھانا بالکل سادہ تھا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ احمد تھانوی صاحب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس لڑکی کے دل میں کوئی گہرا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا شوہر یوسف بس اپنے مطلب کے لئے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ یوسف کے گھر میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ پھر بھی وہ اس سے علیحدہ ہونے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ ایسا کر کے وہ اپنے لئے کسی بہت بڑی مصیبت کو دعوت دے لے گی۔''

''حضرت! اپنے اس خوف کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ شاید وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ اس کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔''

''کیا ایسا تو نہیں کہ یوسف نے درپردہ اسے کوئی خطرناک دھمکی دے رکھی ہو یا کسی اور طرف سے اسے دھمکایا جا رہا ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ ہو بھی سکتا ہے لیکن بظاہر مجھے اس طرح کا امکان نہیں لگ رہا۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں جو تھوڑا بہت بتا رہی ہے، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ دھیمے مزاج کا شخص ہے۔ اپنی سوکن کے حوالے سے بھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔''

''اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے حضرت؟''

احمد تھانوی صاحب نے قہوے کا گھونٹ لے کر اپنی سفید براق داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور ہولے سے بولے۔ ''کسی طرح اس خوف کا کھوج لگنا چاہئے جو اس کے اندر جگہ بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا کوئی بہت قریبی عزیز اسے اپنے اعتماد میں لے اور اس کا اصل مسئلہ معلوم کرے......''

عمران نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظر کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

○......❖......○

ثروت سے رابطہ کرنا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تاہم ایک پلس پوائنٹ یہ تھا کہ میں نصرت کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ میرے پاس اس کا موبائل نمبر بھی موجود تھا۔ میں دو تین بار رازداری کے ساتھ اس سے بات چیت بھی کر چکا تھا۔ میں نے اس سے ثروت کا موبائل فون نمبر لے لیا اور پھر ایک رات اس سے رابطہ کیا۔

میں نے تین بار کال کی۔ تیسری مرتبہ اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ ''ہیلو......کون؟'' اس کی پریشان آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! میں تابش بول رہا ہوں۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔ مجھے تم سے ایک بہت خاص بات کرنی ہے۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر ثروت کی گھمبیر آواز ابھری۔ ''آپ نے وعدہ کیا تھا کہ......آپ مجھ سے رابطہ نہیں کریں گے۔''

''میں اپنے وعدے پر بالکل قائم ہوں ثروت......لیکن ایک ایسی بات ہے جسے کئے بغیر چارہ نہیں۔ اگر میں یہ بات نہیں کروں گا تو تمہارا نقصان ہوگا اور یقین کرو ثروت...... میں تمہارا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟''

''اس بارے میں بھی تمہیں بتا دوں گا......بس ایک بار......ایک آخری بار مجھ سے مل لو اور یہ ملاقات میں اپنے لئے نہیں، تمہارے لئے کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بھروسا رکھنا ثروت...... تمہاری عزت مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رہی ہے اور اب بھی ہے۔''

وہ جیسے سخت الجھن میں تھی۔ چند سیکنڈ بعد کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''تابش! آپ کو جو کہنا ہے فون پر ہی کہہ لیں......''

''اگر ایسی بات ہوتی ثروت تو میں تمہیں کبھی زحمت ہی نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم شادی شدہ ہو۔ تمہاری بہت سی مجبوریاں ہیں......لیکن ہمارا ایک بار ملنا بہت ضروری ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں پھر کبھی تمہیں ایسی تکلیف نہیں دوں گا۔''

''یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تابش! پلیز آپ مجھے کسی امتحان میں نہ ڈالیں۔ آپ عورت کی مجبوریوں کی بات تو کر سکتے ہیں مگر ان مجبوریوں کو سمجھ ایک عورت ہی سکتی ہے۔ میرے شوہر کو کسی طور قبول نہیں ہوگا کہ میں انہیں بتائے بغیر کسی شخص سے ملوں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔''

میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ آخر میرا دل بھر آیا۔ مجھے بڑا مان تھا اس پر۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں دل کی گہرائیوں سے کوئی التجا بھی اس کے سامنے کروں گا...... وہ اسے رد نہیں کرے گی لیکن آج وہ رد کر رہی تھی۔ کتنی بدل گئی تھی وہ؟ کتنی سخت ہو چکی تھی۔ میرے بغیر ایک پل نہ گزارنے والی، میری ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جانے والی، میری ایک آواز پر دس بار ''جی'' کرنے والی آج میرے کشکول میں ایک ملاقات کی خیرات بھی نہیں ڈال رہی تھی...... حالانکہ وہ جانتی تھی، میں جو کچھ کہوں گا اس کے فائدے میں کہوں گا۔ میں اندر سے کراہ اٹھا۔ اپنی مجبوریوں کو جواز بنا کر کتنی جلدی اجنبی بنتی ہیں یہ عورتیں......کتنی سنگ دلی سے راہیں بدلتی ہیں......اور پھر مڑ کر بھی ان راہوں کی طرف نہیں دیکھتیں۔ میری آواز بھرا گئی اور میں نے فون بند کر دیا۔

ہم عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی تھے۔ یہ گنجان آبادی تھی۔ قریب کی تنگ سڑک پر موٹر سائیکلوں اور رکشاؤں وغیرہ کا ہلکا شور سنائی دیتا تھا۔ کبھی کسی خوانچے والے کی آواز ابھرتی تھی اور اس شور میں دور تک سرایت کر جاتی تھی۔ رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ عمران اور اقبال کافی دیر تک کارڈ کھیلنے کے بعد سو چکے تھے۔ بس میں جاگ رہا تھا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کہیں پڑوس کے کسی گھر میں ٹیپ ریکارڈر سے موسیقی کی لہریں ابھر رہی تھیں۔ سریلی آواز در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن......

اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا......

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ دل یک بارگی دھڑک اٹھا۔ یہ ثروت کا نمبر ہی تھا۔ ''ہیلو۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ثروت بول رہی ہوں۔''

''ترس آ گیا؟''

''لیکن آپ وعدہ کریں کہ...... یہ آخری بار ہوگی۔'' وہ نمناک آواز میں بولی۔ ''اس کے بعد چاہے کچھ بھی ہو جائے، آپ رابطہ نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے ثروت۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''اس کے بعد تمہیں ملنے پر مجبور نہیں کروں گا۔''

کچھ دیر تک خاموش رہی۔ تب ثروت نے پوچھا۔ ''کہاں ملنا ہے؟''

''جہاں تمہیں آسانی رہے۔''

''میرے لئے تو گھر میں رہنے سے زیادہ آسانی کہیں نہیں ہے آپ بتائیں۔''

''کینال روڈ کے ''کے ایف سی'' کے سامنے آ جانا۔ میں تمہیں وہاں سے پک کرلوں گا۔ اگر وہیں بیٹھنا ہوگا تو بھی ٹھیک ہے۔''

''وہیں بیٹھ جائیں گے۔'' ثروت نے کہا۔ ''میں تین بجے آ جاؤں گی اور...... زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔ مجھے پانچ بجے تک گھر واپس پہنچنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے ثروت۔'' میں نے کہا۔

''اگلے روز تین بجے سے پہلے ہی میں ریسٹورنٹ کے سامنے موجود تھا اور ثروت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پاس عمران والی مہران گاڑی تھی۔ میں اکیلا ہی آنا چاہتا تھا لیکن عمران اس پر ہرگز راضی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیٹھ سراج کے ہرکارے ہمارے اردگرد موجود ہیں، ان حالات میں وہ مجھے شہر کی سڑکوں پر تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ جیلانی والی کار میں میرے آس پاس موجود تھا۔ ہم موبائل پر کسی بھی وقت ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے تھے۔

تین بجے کے فوراً بعد ایک رکشا ریسٹورنٹ کے سامنے آ کر رکا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ثروت اس میں سے نکلی۔ حسبِ سابق وہ ایک طویل چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی دکھائی دیتی تھی۔ وہی بادلوں میں سے چاند کا روشن کنارہ۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی گاڑی کا دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''یہاں سے چلیں۔''

''خیریت تو ہے؟'' میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''بس چلیں آپ۔'' وہ دوبارہ بولی اور چہرے پر چادر کا نقاب کچھ اور اوپر کر لیا۔

میں نے گاڑی موڑی اور بڑی سڑک پر آ گیا۔ ثروت نے کہا۔ ''وہاں چچا اختر گاڑی سے اتر رہے تھے۔''

''یہ تو پھر اچھا کیا کہ نکل آئے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل میرا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے گاڑی ضرور دیکھی تھی لیکن اس میں سے کسی کو اترتے نہیں دیکھا تھا۔ ''اب کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' اس نے کہا اور معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

ایک دم میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ میں نے گاڑی کا رخ اپنے پرانے گھر کی طرف موڑ دیا۔ ہمارا یہ آبائی مکان پچھلے تقریباً چار سال سے خالی ہی پڑا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد فرح یا عاطف کی کبھی یہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس گھر کا رخ کر سکتے۔ ہاں، عاطف نے اتنا ضرور کیا تھا کہ عمران سے کہہ کر ایک ادھیڑ عمر بے اولاد میاں بیوی کو یہاں رہائش دلوا دی تھی...... سات آٹھ ماہ پہلے، بیوی فوت ہو گئی اور ادھیڑ عمر شخص یہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت عمران تو یہاں موجود نہیں تھا تاہم جیلانی نے کوشش کی تھی اور ادھیڑ عمر شخص کو یہاں روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ یوں ہمارا یہ گھر...... ہماری یادوں کا مرکز...... بے آباد ہونے کے باوجود پوری طرح بے آباد نہیں ہوا تھا۔

میں ان گلی کوچوں میں داخل ہوا تو یادوں کا ایک سیلاب سا امڈ آیا۔ میں نے پی کیپ پہن رکھی تھی...... سن گلاسز بھی لگا لئے۔ مجھے امید تھی کہ چلتی گاڑی میں سے کوئی فوراً ہی مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ آخری بار ان گلی کوچوں میں میرے قدم کب پڑے تھے؟ آخری بار میرے قدم تب پڑے تھے جب میں سکون بخش دوا الیگزاٹانل کھا کر گھر سے نکلا تھا۔ ایک طرف ثروت کی یادوں نے مجھے بری طرح گھیرا ہوا تھا، دوسری طرف میری چچی کی بھتیجی آرسہ نے مجھ پر جذبات اور جنس کا جال پھینکا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے دوپہر کو گیارہ بجے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور یہ عندیہ بھی دے رکھا تھا کہ اس فیصلہ کن ملاقات میں وہ اپنی گناہ ''خود سپردگی'' کے ضمن میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ میں گناہ کے اس ریشمی جال سے بچ کر نکلا تھا اور اس چلڈرن پارک کی طرف روانہ ہو گیا تھا جہاں سیٹھ سراج کی صورت میں میری زندگی کا بدترین المیہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب ماضی کی اس چمکیلی دوپہر میں میرے قدم اس تنگ سڑک پر پڑ رہے تھے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایک دو گھنٹے کے لئے

نہیں، کئی برس کے لئے ان گلی کوچوں سے جدا ہوا رہا ہوں...... چلڈرن پارک میں وہی کچھ ہوا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں۔ سیٹھ سراج کے بے رحم گماشتوں نے مجھے مار مار کرادھ موا کیا اور میں گھر لوٹنے کے بجائے کہیں کا کہیں نکل گیا۔

آج میں پھر اسی دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا جس کی دوسری جانب میرا ماضی دفن تھا۔ ''یہاں کون رہتا ہے آج کل؟'' ثروت نے بے حد اداس لہجے میں پوچھا۔

''ہیں ایک انکل۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

''میں نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے دو تین بار ہارن دیا تو گھر کا چھوٹا گیٹ کھل گیا اور پچپن ساٹھ سال کا ایک شخص باہر نکل آیا۔ اس کی کھچڑی داڑھی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کا نام حیات محمد تھا۔ چند دن پہلے جیلانی نے حیات کو فون پر بتا دیا تھا کہ اس گھر کا مالک گھر دیکھنے کے لئے آئے گا۔ حیات نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ یقیناً اس نے گھر کی دیوار پر میری تصویر دیکھی ہوگی۔ گھر کے کامن روم میں جو گروپ فوٹو تھا، اس میں بھی میں موجود تھا۔ حیات نے تھوڑی سی کوشش سے مجھے پہچان لیا اور فوراً گیٹ کھول دیا۔ میں کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری اور ثروت کی آنکھوں کے سامنے یادوں کا ایک جہان آباد ہو گیا۔ پچھلے چار ساڑھے چار سالوں میں گھر کے اندر بہت کم تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ حیات محمد اور اس کی مرحومہ بیوی نے بس ایک کمرا ہی اپنے استعمال کے لئے کھولا ہوا تھا۔ باقی کمرے مقفل رہتے تھے۔ ہاں، مہینے میں پانچ چھ بار ان کی صفائی ستھرائی حیات محمد اور اس کی بیوی ہی کیا کرتے تھے۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ فرح کی الماری، اس کے لکھنے کی میز...... عاطف کا کمرا۔ اس کا جہازی سائز ٹیپ ریکارڈر، دیواروں پر آویزاں ٹینس ریکٹ ماں جی کا کمرا، ان کا چوبی تخت جس پر جائے نماز بچھی تھی، قرآن مجید کے نسخے جو شیشے کی ایک الماری میں بڑی حفاظت سے رکھے تھے، بستر پر ان کا تہ کیا ہوا ایرانی کمبل اور پلنگ کے نیچے ان کی چپل اور جوتی۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ سب کچھ وہیں تھا لیکن ماں نہیں تھی۔ وہ آواز نہیں تھی جو بسم اللہ کہتی تھی اور وہ گود نہیں تھی جس میں، میں اپنا تھکا ہارا سر رکھتا تھا۔

ہم کمروں میں گھومتے رہے اور یادوں کو اپنے اندر سمیٹتے رہے۔ حیات محمد نے ہماری کیفیت دیکھ کر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا اور باہر لان میں بیٹھ گیا۔

ہم کچن میں آ گئے۔ کچن کی الماریوں کے خانوں میں سب کچھ ویسے کا ویسا دھرا تھا...... چھوٹے چھوٹے خوش نما ڈبے...... نمک، چینی، ہلدی، مرچیں، کالا زیرہ، سوکھا دھنیا...... ان

گنت پکوانوں کی خوشبوئیں میرے نتھنوں میں گھسنے لگیں۔ وہ سارے لذیذ پکوان جو ہماری ماں نے اس کچن میں کھڑے ہو کر ہمارے لئے بنائے تھے اور پھر ہمیں کھاتے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئی تھیں...... بہت سی گم شدہ آوازیں سماعت سے ٹکرائیں، چپاتیاں بنانے کی آواز...... مجھے لگا، میری ماں یہیں کہیں ہے۔ وہ ابھی کسی اوٹ سے نکلے گی اور ڈانٹ کر کہے گی۔ اتنی دیر گھر سے باہر رہے۔ میں نے کوئی پچاس بار فون کیا ہے۔ ایسے نواب زادے ہو کہ فون ہی نہیں اٹھاتے۔

میں نے آنسو پونچھے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ صرف ماں کی یادیں ہی نہیں تھیں، اَن گنت یادیں تھیں جو گوشے گوشے سے نکل کر دل و دماغ پر یلغار کر رہی تھیں۔

کھڑکی کے سامنے ہی سرخ گلاب کے وہ خوبصورت پودے تھے جو فرح نے بڑی چاہت سے لگائے تھے۔ ایک دفعہ ثروت ہمارے گھر آئی تو میں نے بہت سی کلیاں توڑ کر ثروت کو دیں پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ فرح مصنوعی غصہ دکھاتی اور مجھ سے لڑا کرتی کہ اگر میں نے باجی سے اتنا زیادہ اور یوں بار بار اظہارِ محبت کرنا ہے تو پھر میں اپنے لئے لان میں ایک درجن علیحدہ پودے لگا لوں۔ اور سامنے ہی وہ گول ستون تھا جس کی اوٹ سے میں رات کے وقت کچن میں جھانکتا تھا۔ کچن میں روشنی ہوتی تھی امی، فرح اور ثروت وہاں مصروف ہوتی تھیں اور صرف ثروت کو پتا ہوتا تھا کہ میں ستون کی تاریک اوٹ میں کھڑا ہوں اور اس کی ہر ہر حرکت دیکھ رہا ہوں۔

میں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''ثروت! وہ اوپر والی بالکونی دیکھ رہی ہو؟''

''ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پتا ہے، ایک کٹی پتنگ پکڑنے کی کوشش میں تم یہاں گر پڑی تھیں۔ میں تمہیں اٹھانے آیا تھا اور خود بھی پھسل گیا تھا...... اور گرا بھی تمہارے اوپر تھا۔ امی نے بہت ڈانٹا تھا کہ بیچاری کی کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی تو پھر......''

ثروت کی آبگینہ آنکھوں میں یادوں کی خوش نما چمک ابھری۔ یوں لگا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن پھر فوراً یہ چمک بجھ گئی۔ وہ رخ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ سنہرے ماضی کی جلترنگ جیسی گونج نے اس کے دل و دماغ میں بھی ارتعاش پیدا کیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ثروت کو یہاں لا کر بہت اچھا کیا ہے۔ یہ در و دیوار، یہ ماحول، یہ یادوں کا جھرمٹ یہ سب کچھ اسے متاثر کر رہا تھا۔ اس کی اندرونی کیفیت میں کچھ تبدیلی

واقع ہوئی تھی اور یہ تبدیلی اس بات کے لئے بہت مناسب تھی جو میں اس سے کرنا چاہ رہا تھا۔

ہم کامن روم میں آ کر بیٹھے تو حیات محمد نے کئی کھانے پینے کی اشیاء لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ جوس، نمکو، چپس، کیک اور کوک وغیرہ۔ یقیناً یہ وہ ابھی سامنے والے جنرل اسٹور سے لے کر آیا تھا۔ وہ کچن میں چائے بنانے چلا گیا تو ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔

چھوٹی سی تمہید باندھنے کے بعد میں نے کہا۔ ''ثروت! تمہیں پتا ہے کہ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہم اسی طرح جانتے ہیں جیسے اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم ایک ایسے شیشے کی طرح ہو میں جس کے آر پار آسانی سے دیکھ سکتا ہوں اور تمہیں پتا ہے کہ اس وقت میں کیا دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! جب پچھلے ہفتے میں نے تمہیں اس شاپنگ مال میں پہلی دفعہ دیکھا تو تمہیں دیکھنے کے چند ہی منٹ بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم کسی بڑی الجھن میں گرفتار ہو۔ کوئی ایسی پریشانی ہے تمہارے ساتھ جو تمہیں مسلسل ایک تیز آنچ دے رہی ہے۔''

''اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں تو پھر؟''

''تم نے جتنی بار بھی یہ بات کہی ہے ثروت...... مجھے تمہاری آنکھیں چہرے سے علیحدہ نظر آئی ہیں۔ اور تمہاری آنکھوں کی اس بے ساختہ ادا کو میں بہت اچھی طرح جانتا پہچانتا ہوں۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''تابش! آپ ان باتوں کو چھوڑیں۔ آپ بتائیں کہ مجھے کیا خاص بات بتانا چاہ رہے تھے؟''

''وہ یہی بات تھی ثروت! میں پچھلے چند دنوں میں تمہارے لئے بہت پریشان رہا ہوں اور میری نیت پر کسی طرح کا شک نہ کرنا۔ میں کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں سکتا جس کی وجہ سے تمہاری شادی شدہ زندگی اور تمہاری عزت پر ذرا سا بھی حرف آئے۔ لیکن مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میں تمہیں اس طرح کسی مصیبت میں دیکھوں اور منہ پھیر کر چلا جاؤں۔ ہمارے درمیان بس یہی ایک رشتہ تو نہیں تھا ثروت۔''

وہ بولی۔ ''ایک طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں سکتے جس کی وجہ سے میری عزت اور میری شادی شدہ زندگی پر کوئی حرف آئے اور دوسری طرف ایسا کر بھی رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ثروت؟''

''اگر میرے شوہر مجھے اس طرح آپ کے ساتھ اس گھر میں بیٹھے اور اس کمرے میں باتیں کرتے دیکھ لیں تو کیا وہ اسے برداشت کر لیں گے؟''

''تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو ثروت! کیا ہمارے درمیان کوئی اور تعلق نہیں ہو سکتا۔ کیا ہم نارمل انداز میں کوئی مسئلہ ڈسکس نہیں کر سکتے؟''

''بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے تابش۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''عورت بڑی کمزور شے کا نام ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔ آپ وہ چار سال پہلے کے واقعات بھولے تو نہیں ہوں گے۔''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ ''ثروت! پرانے زخموں کو چھیڑو گی تو خون رِسے گا۔ تب جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اور میرا بھی نہیں تھا۔ اس واقعے نے تو ہم دونوں کو ڈسا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، میں تمہارے ساتھ تھا ثروت۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جاتی پھر بھی میں تمہارا ساتھ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے تم سے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی اور اس مہلت میں، میں نے امی کو بھی راضی کر لیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا تھا لیکن تم خاموشی سے سب کچھ چھوڑ کر چلی گئیں۔ تم نے مجھ پر بھروسہ نہ کیا ثروت......'' میری آواز بھرا گئی۔

وہ خاموش رہی۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھے معاف کر دو ثروت تو میں کہوں گا کہ تم نے اس وقت کم ہمتی کا مظاہرہ کیا...... اور یہی کچھ تم اب بھی کر رہی ہو۔ ہاں ثروت! تم ایک بار پھر کم ہمتی دکھا رہی ہو۔ میں تمہارے حالات کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ تمہاری پُرسکون اور بہت خوش گوار ازدواجی زندگی کا سارا ماجرا مجھے پتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گھر میں تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ ''آپ کو جس نے بتایا ہے تابش، غلط بتایا ہے۔ اور اگر...... اگر یہ صحیح بھی ہوتا تو میں ہرگز نہ چاہتی کہ آپ میرے ذاتی معاملوں میں اس طرح دخل دیں۔'' اس کی آواز لرزنے لگی۔

''ثروت...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے...... میں تو......''

''پلیز تابش...... پلیز!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کے پاس مجھے بتانے کے لئے کچھ نہیں۔ آپ نے صرف مجھ سے ملنے کے لئے ایک

بات گھڑی تھی...... مجھے بہت افسوس ہے تابش...... میں جا رہی ہوں......"

وہ تیزی سے واپس مڑی۔ "ثروت! میری بات تو سنو۔" میں نے اسے کندھوں سے تھاما۔

وہ ایک دم لرز گئی۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ "چھوڑ دیں مجھے۔ جانے دیں...... جانے دیں۔"

"میری بات تو سن لو ثروت۔"

"نہیں۔" اس نے مجھے زور سے جھٹکا۔ میرے گریبان کا بٹن ٹوٹ گیا۔ میں جو سخت ترین ضربیں سہہ لیتا تھا، بدترین درد بھی سہار لیتا تھا، اس نازک لڑکی کے دیئے ہوئے جھٹکے سے اندر ہی اندر کراہ اٹھا۔ مجھے لگا جیسے میں مسمار ہو گیا ہوں۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ میرے بازو دو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح میرے اطراف میں جھول رہے تھے۔

اس نے اشک بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر مڑی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ حیات محمد بھی ہکا بکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ کھٹکے پر رکھا مگر اس کو کھولا نہیں۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے ماتھا دروازے (گیٹ) کی آہنی چادر سے ٹکا دیا اور اشک بہانے لگی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ باہر نہیں نکلے گی۔ میں دھیمے قدموں سے اس کے پاس پہنچا...... ثروت! پلیز ایسے مت کرو۔" میرا لہجہ دھیما اور دل فگار تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر میرے ساتھ کامن روم میں بیٹھی تھی۔ حیات محمد اسے پانی کا گلاس تھما کر چلا گیا تو وہ اپنی تر بتر پلکیں اٹھائے بغیر بولی۔ "مجھے معاف کر دیں تابش......"

"معافی تو مجھے مانگنی چاہئے۔ میں تمہیں زبردستی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے گداز لبوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن بات اس کے لبوں تک نہیں آئی۔ ہاں، آنسو اس کی بلوری آنکھوں تک ضرور آ گئے۔ اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اپنا چہرہ آنچل میں چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دل کا غبار تھوڑا کم ہوا تو بولی۔ "تابش! میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے کہ...... نصرت کو کچھ ہو جائے گا اور جو کچھ ہو گا اس کی ذمے دار میں ہوں...... بس میں ہوں گی۔"

"تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی...... تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"نصرت...... بیمار ہے تابش...... مصیبت میں ہے...... اور جو کچھ ہے میری وجہ سے

ہے۔"

"کیا ہے اسے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں لیکن جو کچھ ہے میری وجہ سے ہے۔ میں اس کی ذمے دار ہوں۔ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا بوجھ اس کے پیاروں پر ہی آتا ہے۔"

"تم نے کیا گناہ کیا ہے ثروت! تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم صرف وہم کر رہی ہو۔"

"گناہ نہیں کیا لیکن غلط سوچا تو تھا۔ ایسا خیال تو ذہن میں آیا تھا جو نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"کیا خیال ذہن میں آیا تھا؟" میں نے اپنائیت بھرے نرم لہجے میں پوچھا۔

وہ آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ کر اس میں اپنے آنسو جذب کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "میں نے یوسف کو چھوڑنے کا سوچا تھا، ان سے طلاق لینے کا سوچا تھا...... اور وہ سب کچھ سوچا جو مجھے نہیں سوچنا چاہئے تھا اور اس کی سزا مجھے فوراً ملی۔ میری نصرت......" ثروت کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

چند لمحے توقف کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ "نصرت کو کوئی تکلیف ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

"کس قسم کی تکلیف ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"اس کو جگر کی تکلیف ہے۔"

"لیکن ہے کیا؟"

"مجھے ٹھیک سے پتا نہیں اور نہ پتا کرنے کی ہمت ہے۔ لیکن وہ بہت بیمار ہے۔ دیکھنے میں زندہ نظر آتی ہے لیکن بیماری اس کے اندر تک اتری ہوئی ہے۔"

میں نے طویل سانس لی۔ میرے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے میں نے کہا۔ "ثروت! کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا آج کے دور میں علاج نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت نے بیماریاں بعد میں پیدا کیں، ان کے علاج پہلے بنائے۔ کیا تم نے اس کے کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرائے ہیں؟"

"ہاں...... ٹیسٹ بھی ہوئے تھے۔"

"پھر؟"

"میری کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی...... کہ ان کی رپورٹیں دیکھ سکوں۔ یہ رپورٹیں بس لفافوں میں بند پڑی رہ گئیں۔"

"یہ کیا بچپنا ہے ثروت! تم نے اس کے ٹیسٹ کرائے اور پھر رپورٹیں بھی نہیں دیکھیں

اور کہہ رہی ہو کہ اسے جگر کی تکلیف ہے۔"

وہ سسک کر بولی۔"مجھے پتا ہے کہ تکلیف ہے...... لیکن شاید میں اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی۔ میں سوچتی ہوں کہ جو کچھ ہے...... کم ہے یا زیادہ ہے، یا بہت زیادہ ہے، بس چھپا ہی رہے...... اور قدرت اسی طرح نصرت کو صحت دے دے۔ میں اس کا روحانی علاج کروا رہی ہوں...... رات دن دعائیں بھی کر رہی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اوپر والا یہ دعائیں ضرور سنے گا۔ وہ اب پہلے سے کافی بہتر نظر آتی ہے۔"

میں نے کہا۔"ثروت...... مجھے روحانی علاج سے ہرگز انکار نہیں لیکن دعا اور دوا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس دنیا کو اسی لئے دارالاسباب کہا جاتا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سبب مہیا کرتے ہیں...... پھر اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے۔ رزق، شفا، خوشی، کامیابی ایسی سب چیزوں کے لئے دعا اور کوشش دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"لیکن...... لیکن وہ تو قادر مطلق ہے نا۔ وہ تو سب کے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"اس کو معجزہ کہتے ہیں لیکن معجزے تو کبھی کبھی رُونما ہوتے ہیں۔ اگر وہ عام ہو جائیں تو پھر معجزے ہی نہ رہیں۔ ہمیں معجزوں کی آس ضرور رکھنی چاہئے لیکن ہر وقت انہی کے انتظار میں نہیں رہنا چاہئے۔ اب...... اب تمہاری یہ منطق بالکل میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم نے جگر وغیرہ کی کسی تکلیف کے لئے نصرت کے ٹیسٹ تو کرائے ہیں لیکن رپورٹوں کو کھول کر ہی نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے رابطہ کیا ہے......"

"بس...... میں خود کو کسی بڑے وہم میں ڈالنا نہیں چاہتی۔"

"بڑے وہم میں تو تم خود کو اب ڈال رہی ہو۔ ہو سکتا ہے ثروت کہ وہ رپورٹیں صحیح ہوں یا اتنی خراب نہ ہوں، جتنا تم انہیں سمجھ رہی ہو۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہے بھی تو پھر وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ایسی بیماریوں کے علاج کے لئے وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ثروت! تمہاری یہ بات بھی بالکل منطق کے بغیر ہے کہ تم نے اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور اس کے نتیجے میں نصرت بیمار ہو گئی۔ یہی واہمے اور "Illusions" ہوتے ہیں جو ہمیں آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا سے بہت دور لے جاتے ہیں۔"

"ہر کام کا پھل تو ہوتا ہے نا۔" وہ بدستور اشکبار تھی۔

"بالکل ہوتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا اور برے کا برا۔ لیکن تم نے ایسا کون سا برا کام کیا یا کرنے کا سوچا جس کے نتیجے میں نصرت پر کوئی بوجھ آیا۔ اگر تم نے بہ حالت مجبوری اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا تو یہ گناہ نہیں ہے۔ مذہب، معاشرہ، قانون سب تمہیں اس کا

حق دیتے ہیں......"

"لیکن...... یہ فیصلہ کرنا بھی تو آسان نہیں کہ کیا اس طرح کے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ میں ایسا سوچتی۔"

وہ اپنے مؤقف پر بہت مضبوط نظر آتی تھی...... میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"ثروت! یہ ایک لمبی بحث ہے اور شاید ہم اس قابل بھی نہیں کہ اس پر کوئی بہت معتبر رائے دے سکیں۔ اب جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ نصرت بیمار ہے...... زیادہ ہے یا کم ہے، یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اگر ہم اس بیماری کی طرف سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے رکھیں گے تو یہ مسئلہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ تھوڑی سی ہمت دکھا کر تمہیں کم از کم وہ رپورٹس تو دیکھنی چاہئیں۔ کتنا عرصہ ہوا ہے وہ ٹیسٹ کروائے ہوئے؟"

"ایک سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ان دنوں ہم جرمنی میں ہی تھے۔ نصرت کو تیز بخار اور ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی۔ میں نے اسے معمول کا بخار سمجھا لیکن جب وہ جلد ٹھیک نہیں ہوئی تو ایک جرمن معالج کو دکھایا۔ وہ ہومیو پیتھک ٹائپ کے تھے اور جڑی بوٹیوں کے عرق سے علاج کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اکیلے میں بتایا کہ مریضہ کا جگر بہت زیادہ خراب ہو چکا ہے۔ وہ بظاہر اتنی بیمار نظر نہیں آ رہی، جتنی اصل میں ہے اور انہیں یہ بھی شبہ ہے کہ یہ جگر کا کینسر ہے۔ ڈاکٹر کی اس بات نے میری دنیا اندھیر کر دی۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی لیکن پھر کسی نہ کسی طرح میں نے خود کو سنبھالا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جگر کا کینسر دنیا کے خطرناک ترین امراض میں سے ہے اور اس کے مریض شاذ و نادر ہی بچ پاتے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے، ہماری ممانی شفقت بھی دبئی میں اسی مرض کے ہاتھوں اپنی زندگی ہاری تھیں۔ ڈاکٹروں نے واحد حل یہ بتایا تھا کہ ان کے جگر کی پیوندکاری ہو گی لیکن اس سے بہت پہلے ہی ان کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔"

میں نے کہا۔"ہاں، مجھے وہ واقعات یاد ہیں۔"

ثروت نے گھمبیر لہجے میں بات جاری رکھی۔"میری سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ کیا کروں اس کے ساتھ ساتھ میرا دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ قدرت مجھے اتنے سخت امتحان میں نہیں ڈال سکتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ناصر بھائی کے بعد نصرت بھی موت کے رستے پر چل پڑے۔ میں نے نصرت کو کچھ نہیں بتایا۔ اسے یہی معلوم ہے کہ اسے عام قسم کا یرقان ہے جو علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ دو ہفتے بعد میں نصرت کو ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے ایک دو ابتدائی ٹیسٹ کرائے۔ اس کے بعد چند اہم ٹیسٹ لکھ کر دئے۔ یہ ڈاکٹر بھی ابتدائی ٹیسٹوں

کی رپورٹ سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ نئے ٹیسٹ کافی مہنگے بھی تھے۔ قریباً پانچ ہزار روپوں میں ہوئے...... ان دنوں میں دروازے بند کر کر کے روتی تھی اور کوئی غم دل کو آرے کی طرح کاٹتا رہتا تھا۔ انہی دنوں فرینکفرٹ کی ایک مسجد کے امام عبدالحمید صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے وہاں باقاعدہ مدرسہ بنایا ہوا تھا...... اور درس وغیرہ دیتے تھے۔ ان کی عمر چالیس سال کے قریب ہے...... بڑے پرہیزگار بندے ہیں۔ میں اکثر ان کو مدرسے کے لئے پیسے وغیرہ دیتی رہتی تھیں زکوٰۃ کے پیسے بھی ان کو ہی دیتی تھی۔ ان کو میری اس مصیبت کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دواؤں اور ڈاکٹروں وغیرہ کے چکر سے بچ جاؤں تو اچھا ہے۔ یہ لوگ تو رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔ ایک بیماری ٹھیک کرتے ہیں تو ساتھ دس اور لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ وظیفے بتائے، اس کے علاوہ ایک خاص قسم کا معدنی پانی دم کر کے دیا۔ یہ پانی اردن اور فلسطین کے کچھ چشموں سے لایا جاتا ہے اور لوگ اس پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ امام عبدالحمید صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے عجیب سا اطمینان حاصل ہوا۔ انہی دنوں نصرت کے ٹیسٹوں کی رپورٹس بھی آ گئی تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں رپورٹس دیکھوں گی اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے ملوں گی...... اب ان باتوں کو قریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ نصرت کا علاج اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح امام عبدالحمید صاحب نے کہا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بہتر بھی لگتی ہے لیکن کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ بیماری اس کے اندر ہے اور کسی وقت ابھر کر سامنے آ جائے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "ثروت! اپنی بیماری کا نصرت کو کہاں تک پتا ہے؟"

"اسے کچھ پتا نہیں۔" ثروت نے بڑے دکھی انداز میں سر ہلایا۔ "وہ بس اتنا ہی جانتی ہے کہ اس کے معدے، جگر میں تھوڑا بہت نقص ہے جس کی وجہ سے کسی وقت ہاتھ پاؤں پر سوجن آتی ہے یا بخار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مصیبت سے بے خبر ہر وقت میری پریشانیوں میں گھری رہتی ہے۔ یہاں شاہ جمال کے علاقے میں ایک اللہ والے ہیں...... پیر احمد تھانوی صاحب۔ تین دن پہلے مجھے ان کے پاس لے کر گئی ہوئی تھی۔ میرے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے اور میں اس کی صحت کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتی رہتی ہوں۔"

ثروت کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

میں چند دن پہلے نصرت سے مل چکا تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت ہونے کے باوجود بجھی بجھی سی تھیں۔ رنگت بھی زردی مائل تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا پورا وجود کسی اضمحلال کی زد میں ہے۔

میں نے ثروت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ یہ زیادتی تم اپنے ساتھ کر رہی ہو اور نصرت کے ساتھ بھی...... اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا ثروت۔ اگر تم میں وہ رپورٹس دیکھنے کا حوصلہ نہیں تو وہ مجھے دے دو۔ میں انہیں دیکھتا ہوں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو میں ہر چیز کا سامنا کروں گا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مصیبت دور نہیں ہوتی۔ اس کا ہمت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔"

ثروت شدید ترین تذبذب میں نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف اسے میرے بے لوث رویے اور جرأت مندانہ انداز سے کچھ حوصلہ بھی مل رہا تھا۔

آخر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے تابش! میں آپ کو وہ رپورٹس دکھا دیتی ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ برا سننے کا حوصلہ نہیں۔ آپ مجھے فوری طور پر ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ نہ اچھا، نہ برا۔"

"ٹھیک ہے ثروت! میں کچھ نہیں بتاؤں گا بلکہ میں نصرت کی پوری ذمے داری بھی لیتا ہوں۔ اگر مجھے ڈاکٹروں وغیرہ سے مشورہ کرنا پڑا تو خود ہی کروں گا۔ اور اگر نصرت کو علاج کی ضرورت ہوئی تو پھر بھی میں ہر طرح کے تعاون کو تیار ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے ثروت کہ حالات اتنے برے نہیں جتنے تم سمجھ لئے ہیں۔ تم نے ایک امکان کو ٹھوس حقیقت شکل دی ہے اور پھر اس "حقیقت" کے خوف کو اپنے اندر بڑھاتی چلی گئی ہو۔ مجھے نہیں لگتا کہ نصرت کی تکلیف اتنی سنگین ہو گی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یوں چل پھر نہ رہی ہوتی۔"

"جی؟" ثروت نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ثروت کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میں نصرت سے ملا ہوں، نہ ہی نصرت نے اسے بتایا تھا۔ میں نے جلدی سے بات بدلی۔ "تم نے خود ہی بتایا ہے نا کہ نصرت بظاہر ٹھیک ہے اور روزمرہ کے کام بھی کرتی ہے۔"

ثروت نے کہا۔ "میں آپ کو وہ رپورٹس کس طرح پہنچاؤں؟"

"جیسے تم مناسب سمجھو۔ یہیں آ کر دے جاؤ یا پھر ٹی سی ایس کر دو۔ میں تمہیں ایڈریس لکھوا دیتا ہوں۔"

"میں ٹی سی ایس کر دوں گی۔"

"لیکن فون پر مجھ سے رابطہ ضرور رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ میں کال کرتا رہوں اور تمہاری طرف سے جواب ہی نہ ہو۔"

وہ خاموش رہی۔ پھر ہولے سے بولی۔ "اگر بات کرنا ضروری ہو تو رات دس بجے کے

بعد کال کیجئے گا۔"

ہمارے درمیان دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ میری حوصلہ افزا باتوں سے ثروت کو کافی ڈھارس ملی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نصرت کی رپورٹس ضرور بھجوائے گی۔

میرا یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں، عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی موجود تھا۔ میں اور اقبال ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ عمران فون پر شاہین سے لڑائی کرنے میں مصروف تھا۔ اتنے میں دروازے پر بیل ہوئی۔ میں نے جا کر دیکھا۔ ثروت کی بھیجی ہوئی رپورٹس آ گئی تھیں۔

لفافہ میرے ہاتھ میں تھا اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اقبال اور عمران بھی اپنی اپنی مصروفیات چھوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ وہ دونوں بھی تمام تر صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ پچھلے تین چار دن کی پریشانی اب نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ یہ رپورٹس اچھی ہوں اور میں ابھی ثروت کو فون کر کے اسے خوش خبری سنا سکوں۔ ایسی سنگین نوعیت کی رپورٹس کو دیکھنا بھی کتنا اعصاب شکن عمل ہوتا ہے۔ میں نے لفافہ عمران کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ "تم کھولو۔"

وہ بولا۔ "یہ بھی تو ہم پرستی کی ایک قسم ہے۔"

بہر حال اس نے لفافہ کھولا۔ "فرینکفرٹ کی کوئی لیب تھی۔ بہر حال رپورٹس انگلش میں تھیں۔ سب سے اوپر نصرت کا نام لکھا تھا...... اور تاریخ درج تھی۔ نیچے دیگر Contents تھے۔ اے سے زیڈ تک سارے حرف کاغذوں پر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنے سیاق و سباق اور پس منظر کی وجہ سے یہ کبھی روشن پیشانیوں والے فرشتوں کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی زہریلے ناگ بن جاتے ہیں۔ نصرت کی میڈیکل رپورٹس پر نظر آنے والے حرف بھی زہریلے ناگوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ہمیں پہلی رپورٹ دیکھنے کے ساتھ ہی پتا چل گیا کہ نصرت کو جگر کا کینسر ہے اور یہ کافی پھیلا ہوا ہے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عمران اور اقبال بھی گم صم نظر آ رہے تھے۔ ہم نے دیگر رپورٹس بھی دیکھیں۔ ان میں سے کچھ خون اور پیشاب کے حوالے سے تھیں۔ ایک معدے کی گیسٹرو یالوجی کا رزلٹ تھا۔ ایک دوسری رپورٹ سے پتا چل رہا تھا کہ نصرت کے جگر کا تقریباً تین چوتھائی حصہ اور جگر تک پہنچنے والی دو نالیاں متاثر ہو چکی ہیں اور یہ نتیجے تقریباً ایک سال پہلے کے تھے۔ اب کیا پوزیشن ہے؟ یہ یقیناً ایک اور تشویش ناک سوال تھا۔

عمران نے اپنے ایک واقف کار ڈاکٹر کو فون کیا۔ ان ڈاکٹر صاحب نے جگر کے ایک

اسپیشلسٹ سرجن امتیاز علی سے عمران کی بات کرائی۔ عمران نے رپورٹس کے وہ حصے سرجن امتیاز کو پڑھ کر سنائے جن میں خاص میڈیکل اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں اور جن کو ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

امتیاز علی صاحب نے یہ حصے سننے کے بعد ہم سے لیبارٹری اور پیتھالوجسٹ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد گھمبیر لہجے میں بولے۔ "دیکھیں بھئی، اگر یہ رپورٹس درست ہیں اور ایک سال پرانی بھی ہیں اور اس دوران میں مریضہ کا خاطر خواہ علاج بھی نہیں ہوا تو پھر اس کے لئے کافی مشکلات ہیں۔ وہ کسی بھی وقت Collapse کر سکتی ہے۔ موجودہ صورتِ حال جاننے کے لئے آپ کو نئے ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور فوری طور پر کسی اچھے اسپتال سے رجوع کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں آپ پہلے ہی کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔ اگر یہ رپورٹس آپ کے پاس موجود تھیں تو پھر آپ کو ہرگز تاخیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

اب میں سرجن صاحب کو کیسے بتاتا کہ یہ رپورٹس تو ابھی تک لفافے میں بند پڑی تھیں، انہیں پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔

اگلے روز میں اور عمران نصرت کی انہی پرانی رپورٹوں کے ساتھ سرجن امتیاز علی سے ملے۔ انہوں نے مزید تفصیل سے رپورٹس کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے بتایا۔ "یہ کینسر رسولیوں کی شکل میں ہے۔ قریباً سات سینٹی میٹر کی تین چار رسولیاں ہیں۔ جگر کا بہت تھوڑا حصہ کام رہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے Staging کرنا ہوگی۔"

"اس سے کیا مراد ہے جناب؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم اندازہ لگائیں گے کہ بیماری اب کس مرحلے میں ہے۔ کیا وہ صرف جگر تک محدود ہے یا قریبی اعضا معدے اور پھیپھڑے وغیرہ بھی متاثر کر چکی ہے۔ اس کے لئے ہمیں مریضہ کا سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ کرنا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ہم لیپرو اسکوپی کے ذریعے جگر کا کوئی ٹشو بھی حاصل کریں اور اس کا معائنہ کریں۔"

"ان ٹیسٹوں پر اندازاً کتنا خرچ آئے گا؟" عمران نے پوچھا۔

"سرجن امتیاز علی نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "یہ سارا علاج بہت مہنگا ہے۔ اگر آپ سارے ضروری ٹیسٹ کرائیں تو میرے اندازے کے مطابق ان ٹیسٹوں پر ہی چھ سات لاکھ روپیا خرچ ہوگا۔ پھر کچھ چیزیں بیماری کی نوعیت پر بھی منحصر ہیں۔ کئی صورتوں میں علاج پاکستان میں ممکن ہی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر امتیاز سے ملاقات کے بعد ہم گھر واپس آئے اور تا دیر سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔

صورتِ حال ازحد تشویش ناک تھی۔ میری نگاہوں میں نصرت کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ بے چاری اپنی حالت سے بے خبر تھی۔ اپنی تکلیف کو معمولی تکلیف سمجھ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار احمد تھانوی صاحب سے ملی تو اس نے دیگر پریشانیوں کے علاوہ اپنے رشتے کی بات بھی کی اور تھانوی صاحب سے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے اچھے بر کی دعا کریں۔

رات کے دس بجے تو میں نے، عمران اور اقبال کے مشورے کے مطابق ثروت کو فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ اس سے چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں نے اس سے نصرت کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ”ثروت! میں نے ساری رپورٹیں دیکھ لی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو بھی دکھا دی ہیں۔ تم یقین رکھو، سب اچھا ہو جائے گا اور بہت جلدی ہو جائے گا۔ نصرت ایک دم فٹ ہو جائے گی۔“

”کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“

”نصرت کے ایک دو مزید ٹیسٹوں کی ضرورت ہے۔ عام سے ٹیسٹ ہیں۔ وہ چند گھنٹوں میں فارغ ہو جائے گی۔“

”کہاں...... جانا ہوگا؟“

”یہیں لاہور میں، جیل روڈ پر ایک کلینک ہے۔“

”کتنے پیسے لگیں گے؟“

”کچھ زیادہ نہیں ثروت...... آٹھ دس ہزار میں کام ہو جائے گا۔ ایک دوست سے بات کی ہے میں نے۔ وہ رعایت سے کام کروا دے گا۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”لیکن...... نصرت کو تو کل سے بخار ہے۔ کوئی چیز ہضم بھی نہیں کر رہی ہے۔“

”ایسا تکلیف کی وجہ سے ہے۔ علاج شروع ہوگا تو دنوں میں بہتر نظر آنے لگے گی۔“

ثروت شروع میں تو متذبذب نظر آئی لیکن پھر آمادہ ہو گئی۔ اس کا شوہر یوسف لاہور سے باہر تھا۔ طے ہوا کہ کل سہ پہر چار بجے وہ نصرت کو لے کر جیل روڈ کے پرائیویٹ کلینک میں پہنچ جائے گی۔

وہ اسی سوئفٹ کار میں آئی جس پر میں نے اسے پہلی بار گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا...... گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ دونوں بہنیں پچھلی نشست پر موجود تھیں۔ ثروت کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ نصرت واقعی لاغر نظر آ رہی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے اور نصرت نے ثروت کے سامنے بالکل ظاہر نہ کیا کہ ہم پہلے بھی

مل چکے ہیں۔ نصرت نے جذباتی انداز میں میرا حال احوال پوچھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بھی تھوڑی بہت اداکاری کرنا پڑی۔ میری اور اپنی ملاقات کے بارے میں ثروت اسے بتا ہی چکی تھی۔ اس جدید کلینک میں نصرت کے مختلف ٹیسٹ شروع ہوئے تو ثروت کے چہرے پر نظر آنے والی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ٹیسٹ عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ سی ٹی اسکین، ایم آر آئی اور لیپرواسکوپی وغیرہ کو عام ٹیسٹ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں نے ثروت سے کہا۔ ”آج کل یہی طریقہ کار ہے۔ ڈاکٹر صاحبان علاج شروع کرنے سے پہلے ہر طرح کی تسلی کر لیتے ہیں۔“

”میرے اندازے کے مطابق تو یہ کافی مہنگے ٹیسٹ ہوں گے۔“ ثروت منمنائی۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ سارا کام عمران اپنے کسی ریفرنس سے کروا رہا ہے۔“

ثروت کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ جان رہی تھی کہ صورتِ حال وہ نہیں جو اسے بتائی جا رہی ہے۔ لیکن وہ اس حوالے سے میرے ساتھ کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بس خشک لبوں پر زبان پھیرتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس کی ہر ہر ادا کو جانتا تھا۔ اس کی باڈی لینگوئج کو اتنی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے ٹیلی پیتھی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ وہ میرے اندر رہتی تھی۔ میری روح میں مدتوں سے بستی تھی اور وہ ان گھڑیوں میں بے حد پریشان تھی۔

نصرت کے ٹیسٹ وغیرہ مکمل ہونے میں قریباً پانچ گھنٹے لگ گئے۔ وہ خود بھی کافی الجھن میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں زردی سی اتری ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”تابش بھائی! آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کیا میں زیادہ بیمار ہوں؟“

میں نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”نصرت! اپنی حالت کا پتا مریض سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتا۔ کیا تم خود کو بہت زیادہ بیمار محسوس کرتی ہو؟“

”بس...... بھوک آج کل کم لگتی ہے اور دو چار دن سے بخار ہے۔“

”تو پھر وہم کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ معدے کا پرابلم ہے تمہیں، یا پھر جگر کی معمولی سوزش ہے۔ یہ لیب عمران کے ایک دوست کی ہے۔ اس لئے احتیاطاً سارے ٹیسٹ کروا لئے ہیں۔“

”کتنا خرچ ہوا ہے؟“ ثروت نے مجھ سے پوچھا۔

”بس سمجھو...... نہ ہونے کے برابر۔“

”نہیں، اس طرح نہیں ہوگا تابش! آپ بتائیں کتنے پیسے لگے ہیں۔“

میں نے نہیں بتایا لیکن جب ان دونوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے ان سے پچیس

ہزار روپے لے لئے۔اصل خرچہ ڈھائی لاکھ کے قریب تھا۔

ثروت اس ساری صورتِ حال سے مطمئن نظر نہیں آتی تھی، بہرحال خاموش تھی۔اس پرائیویٹ اسپتال کے ''فوڈ ایریا'' میں بیٹھ کر ہم نے قریباً ایک گھنٹا گفتگو کی۔دس پندرہ منٹ کے لئے عمران بھی اس گفتگو میں شریک ہوا۔عمران کی شخصیت اور اس کے مخلص و بے لوث انداز نے ثروت اور نصرت کو متاثر کیا۔عمران کے جانے کے بعد بھی میں ثروت اور نصرت سے باتیں کرتا رہا۔ثروت نے نصرت کو سب بتا دیا تھا کہ مجھ سے اس کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی لیکن نصرت نے مجھ سے ملاقات کے بارے میں ثروت کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ایسا اس نے میرے کہنے پر ہی کیا تھا۔بہرحال، ثروت کے ذہن میں ابھی تک یہ الجھن موجود تھی کہ میرے پاس اس کا موبائل فون نمبر کیسے پہنچا۔

وہاں فوڈ ایریا میں ہماری گفتگو زیادہ تر نصرت کی تکلیف اور اس کے علاج کے گرد ہی گھومتی رہی۔میں نے ثروت اور نصرت سے کہا کہ وہ بے شک روحانی علاج بھی جاری رکھیں مگر اس کے ساتھ اگر ڈاکٹر بھی کچھ دوائیں تجویز کرتا ہے تو نصرت انہیں بھی باقاعدگی سے استعمال کرے۔نصرت اس پر آمادہ تھی۔

ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں ہم نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی۔

......اگلے چند روز سخت کشمکش کے تھے۔نصرت کی کچھ رپورٹس کا نتیجہ کراچی سے بھی آنا تھا۔ثروت دن رات دعاؤں میں مصروف تھی۔وہ احمد تھانوی صاحب کے پاس بھی دو چکر لگا چکی تھی۔میں، عمران اور اقبال راوی روڈ والے مکان میں تھے۔گنجان آبادی میں گھرا ہوا یہ گھر ہماری دھینگا مشتیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا لیکن نصرت والی پریشانی کے سبب آج کل ہم سب سنجیدہ تھے۔ہاں، عمران کسی وقت ضرور شاہین سے چونچ لڑا لیتا تھا۔شاہین، رائے ونڈ روڈ والی شان دار کالونی میں فرح اور عاطف کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھی۔اب بھی فون پر عمران اور شاہین میں کشمکش جاری تھی۔عمران اسے بتا رہا تھا کہ اسے ایک فلم میں اسٹنٹ مین کا کام ملا ہے۔ساتھ ساتھ وہ سیکنڈ ہیرو کا کردار بھی کرے گا۔یہ فلم ریما پروڈیوس کر رہی ہے اور اس کی ہیروئن بھی وہی ہے۔

شاہین نے جواباً اسے چڑانے کے لئے کہا۔''مجھے بھی اکشے کمار کا فون آیا تھا۔اس نے انڈیا میں ہمارا شو دیکھا تھا۔وہ سرکس کے موضوع پر فلم بنا رہا ہے۔مجھے اپنے ساتھ ہیروئن لینے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔''

''لیکن اکشے تو پیسے والا بندہ ہے۔اسے گھٹیا اور زہریلی شراب پینے کی کیا ضرورت

تھی؟''

''کیا مطلب؟'' شاہین کی آواز فون سے اسپیکر پر ابھری۔

''بھئی زہریلی شراب پینے سے ہی تو لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ظاہر ہے وہ اندھا ہوا ہے تو اس نے تمہیں ہیروئن کاسٹ کرنے کا سوچا ہے نا۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے، ریما اور نرگس کی آنکھیں سلامت ہیں جو وہ تم پر سو جان سے فدا ہوئی پڑی ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے پاس اب ایسی باتوں کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے۔میں ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہوں بالکل جیسے رنبیر کپور انڈیا میں ہے۔ہم دونوں کے شیڈول آج کل بڑے ٹائٹ ہیں۔باقی فلم میں میرے کاسٹ ہونے کی اطلاع بالکل سچی ہے۔اگر یقین نہیں تو کل کے اخبارات میں نیوز دیکھ لینا۔''

شاہین نے کہا۔''اگر ایسا ہے بھی تو......تم مجھے کیا بتانا چاہتے ہو؟''

''دیکھو جو درمیانی عمر کا ''لڑکندہ'' میں نے تمہارے لئے دیکھا ہے، لاکھوں میں ایک ہے۔نیوز چینل میں ملازم ہے۔تم دولت میں کھیلو گی اور رعب دبدبہ علیحدہ۔پلیز، میرا خیال دل سے نکال دو۔ہمارے ستارے کبھی نہیں ملیں گے۔''

وہ جل کر بولی۔''اللہ نہ کرے ہمارے ستارے ملیں۔اس سے تو اچھا ہوگا کہ میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں۔''

''دقیانوسی باتیں مت کرو۔آج کل کنوئیں کہاں ہوتے ہیں۔ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں ٹرین کے نیچے سر رکھ کر یا خود پر پیٹرول چھڑک کر یا بجلی کا جھٹکا کھا کر مر جاؤں گی۔'' اس نے ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''ویسے یہ سارے طریقے بھی کافی محال ہیں۔یہ چیزیں اب ملتی ہی کہاں ہیں۔''

''جس نے مرنا ہو وہ کوئی نہ کوئی رستہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔''

''اسٹیج ڈراموں میں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مرجانا پر کسی غریب کے کام نہ آنا۔اچھے لوگ اپنے اعضا عطیہ کر جاتے ہیں......تم تو پوری کی پوری عطیہ ہو۔یہ خوب صورتی، یہ شباب، یہ چمک دمک......ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرو گی تو یہ سخت قسم کا کفرانِ نعمت ہوگا۔اگلی دنیا میں جاتے ساتھ ہی تمہاری مرمت شروع ہو جائے گی۔فلمسٹار زینت امان کا ایک مشہور فرانسیسی شعر ہے۔اس کا ترجمہ فراق گورکھ پوری نے کچھ اس طرح کیا ہے، اب تو گھبرا کے کہوت ہیں کہ مر جاویں گے......مر کے بھی شانتی نہ پائی تو کدھر جاویں گے۔

شاہین! میں تو اب بھی تم سے یہی کہتا ہوں کہ وہ لڑ کندہ......"

اس نے فون بند کر دیا۔ عمران کے چہرے پر شریر مسکراہٹ تھی۔

اقبال نے آنکھیں اوپر چڑھا کر کہا۔ "یا اللہ...... یہ کیسے کیسے انکشاف ہو رہے ہیں۔ فلمسٹار زینت امان شعر کہتی تھی اور ان کا ترجمہ بھی ہوتا تھا۔"

عمران بولا۔ "تمہیں اعتراض کس پر ہے، زینت امان پر یا ترجمے پر؟"

"ہمیں تم پر اعتراض ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ خدا کا خوف کرو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو...... اور آتے ساتھ ہی اسے گھر سے بے گھر بھی کر دیا ہے۔ اب اسے ستانے پر تلے ہوئے ہو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ چلو، اس کی محبت کا اقرار نہ کرو مگر اس طرح اس کی توہین تو نہ کرو۔"

"اس وقت تو بالکل شاہین کے بڑے بھائی لگے ہو تم۔" وہ مسکرایا۔

"چلو بڑا بھائی ہی سمجھ لو لیکن اگر میں نے عقل کی بات کی ہے تو اس پر غور کرو۔"

اسی دوران میں عمران کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس کے چہرے پر پھر شرارت کی چمک نمودار ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پھر شاہین کا فون آیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کا دوست ڈاکٹر فہد تھا۔ اس نے عمران کو بتایا کہ نصرت کی رپورٹس آ گئی ہیں...... اور یہ بھی بتایا کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں۔

وہ جو ماحول میں تھوڑی سی خوش گواری آئی تھی، اک دم کافور ہو گئی۔ میں اور عمران ڈاکٹر فہد کے کلینک پہنچے اور وہاں سے سرجن ڈاکٹر امتیاز علی کے پاس پہنچ گئے۔ امتیاز صاحب نے ساری رپورٹس اور پرنٹ آؤٹ وغیرہ دیکھنے کے بعد چشمہ اتار کر ایک طرف رکھا اور بولے۔

"اب سب کچھ سامنے ہے اور ایک مکمل تصویر بن رہی ہے...... اور یہ تصویر اچھی نہیں ہے۔"

ہم سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے سی ٹی اسکین کا ایک پرنٹ ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "جگر تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ پچھلے ایک سال کی تاخیر نے بیماری کو بہت پھیلا دیا ہے۔ یہ دیکھیں...... یہ سارا ایریا متاثر ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ متاثرہ حصے کو فریز کرنے سے یا پھر یہاں جراحی کے عمل سے کچھ فائدہ ہو جائے گا۔"

"تو پھر جناب؟"

انہوں نے طویل سانس لی۔ وہی سانس جو کوئی گھمبیر بات کہنے سے پہلے اعصاب کو کمپوز کرنے کے لئے لی جاتی ہے۔ نشست سے ٹیک لگا کر بولے۔ "اگر کوئی چانس نظر آتا ہے تو وہ ٹرانسپلانٹیشن میں ہی ہے...... جگر کی تبدیلی...... اور یہ کوئی معمولی طریقۂ کار نہیں ہے۔

یہ ہر لحاظ سے مشکل ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے، جگر بیکار ہو چکا ہے؟"

"قریباً ہو چکا ہے۔ بہت تھوڑا حصہ کام کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مریضہ کی ظاہری حالت اس کی اندرونی حالت سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن یہ زیادہ دیر بہتر نہیں رہے گی۔ اچانک ہی بریک ڈاؤن ہوگا۔ ایسے بریک ڈاؤن میں دو چار دنوں میں ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے......"

"اوہ گاڈ۔" عمران نے ہونٹ سکیڑے۔

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑنے لگی۔ جواں سال نصرت کا چہرہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

امتیاز صاحب نے کہا۔ "اس بدترین صورتِ حال میں اگر کوئی اچھا پہلو ڈھونڈا جا سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے۔ بیماری ابھی جگر سے باہر نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے اردگرد کے ٹشوز اور Blood Vessels کو ٹچ کیا ہے۔ یہ صورتِ حال جگر کی ٹرانسپلانٹیشن کے لئے بہترین سمجھی جاتی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اس کام پر کیا کاسٹ آ سکتی ہے؟"

امتیاز صاحب بولے۔ "یہ آپریشن انڈیا میں ہو تو رہے ہیں اور وہاں کاسٹ بھی نسبتاً کم ہے لیکن وہاں باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور وہاں پہنچنے کا "پروسیجر" بھی لمبا ہے جبکہ مریضہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر کسی مغربی ملک میں یہ آپریشن ہو سکے تو مناسب ہے۔ لیکن وہاں اخراجات بہت ہوں گے اور اس سے بھی اہم یہ بات ہے کہ جگر کا عطیہ مل جائے۔"

"کیا اس کے لئے پورا جگر درکار ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دو طرح کے آپریشن ہوتے ہیں۔ ایک جگر کی پیوندکاری کہہ سکتے ہیں، دوسرے کو جگر کی تبدیلی۔ یہ تو جگر کی حالت پر منحصر ہوتا ہے کہ کون سا آپریشن ہوگا......"

وہاں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ خاصی پریشان کن اور گھمبیر تھی۔ ایک بہت بڑا امتحان تھا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ نصرت کی زندگی خطرے میں تھی۔

ہم گھر واپس آئے تو چونک گئے۔ اندر کوئی مہمان موجود تھا اور اقبال سے مصروفِ گفتگو تھا۔ یہ ثروت تھی۔ وہ بذریعہ رکشا یہاں پہنچی تھی اور برقع میں آئی تھی۔ اس گھر کا ایڈریس اسے میں نے ہی بتایا تھا۔

"تم کب آئیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس ابھی پانچ منٹ پہلے پہنچی ہوں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے؟ اقبال صاحب کہہ رہے تھے کہ کچھ بتا کر نہیں گئے۔"

"فرح کی طرف گئے تھے پھر راستے میں ایک دوست کے پاس ٹھہر گئے۔" میں نے بہانہ بنایا۔ "اور تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

"یہاں بھاٹی گیٹ میں ایک خیراتی اسپتال ہے، وہاں کچھ پیسے دینے آئی تھی۔ سوچا آپ کی طرف سے بھی ہو جاؤں۔"

"نصرت اب کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے، بخار تو اترا ہوا ہے لیکن بھوک بالکل نہیں لگ رہی۔ بڑی مشکل سے ایک دو لقمے کھلاتی ہوں۔" اس نے ذرا توقف کیا اور پھر بولی۔ "آپ کہہ رہے تھے کہ جمعرات تک سب رپورٹیں آ جائیں گی۔"

"ہاں میرا خیال ہے، آج شام یا کل دوپہر تک پہنچ جائیں گی۔"

"زیادہ فکر کی بات تو نہیں ہے نا؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں ثروت! تکلیف تو ہے لیکن اگر ہم ہمت سے کام لیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اقبال چائے بنانے چلا گیا۔ میں اور عمران کمرے میں رہ گئے۔ ثروت نے اپنے برقع کے اندر سے ایک سبز شاپر نکالا اور کانپتے ہاتھ سے میری طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے شاپر تھامتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میری کچھ جیولری ہے تابش! ناصر بھائی نے بنوا کر دی تھی۔ آپ اسے اپنے پاس رکھیں۔ نصرت کے علاج کا خرچہ اس سے کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا اچھا علاج ہو اور وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔"

میں نے زیورات لوٹاتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس کی ضرورت نہیں ثروت! اگر ہوئی تو پھر میں بتا دوں گا......"

وہ مصر رہی کہ میں زیورات اپنے پاس رکھوں۔ میرے مسلسل انکار کے باوجود وہ نہیں مانی۔ وہ بہت دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ اس نے ہمارا دل رکھنے کے لئے بس چائے کے بھی ایک دو گھونٹ ہی لئے۔ اس نے کہا کہ نصرت کی دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ اسے جلدی واپس جانا ہے۔ اقبال اس کے لئے رکشا لے آیا۔ وہ چلی گئی۔

وہ جو جیولری دے کر گئی تھی، ساری کی ساری طلائی تھی۔ مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت چھ سات لاکھ سے کم نہیں تھی۔ لیکن جو مصیبت آئی تھی، وہ ثروت کے اندازے سے بہت بڑی تھی۔ نصرت کے علاج کے حوالے سے تو یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرے جیسی تھی۔

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔

"عمران! ہم ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔ میرے دل میں آ رہا ہے کہ میں اپنا مکان بیچ دوں۔ تم کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرو۔"

وہ بولا۔ "اتنی تیزی مت دکھاؤ۔ بریک پر تھوڑا سا پاؤں رکھو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ویسے بھی وہ مکان تمہارے اکیلے کا نہیں ہے۔ عاطف اور فرح بھی اس میں حصے دار ہیں اور شاید تمہاری ایک پھوپی جان کو بھی کچھ حصہ دینے کے بارے میں تمہارے والد وصیت کر کے گئے ہوئے ہیں۔"

"یار! میں بعد میں دے دوں گا ان لوگوں کو حصہ لیکن اس وقت تو ایک انسانی زندگی کا معاملہ ہے۔"

"جب چیز اس طرح بیچی جاتی ہے تو لوگ کوڑیوں کے بھاؤ خریدنا چاہتے ہیں۔ تم اتنی جلدی مت دکھاؤ۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

میں کمرے میں بند ہو کر دیر تک سوچتا رہا۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ لیور کی ٹرانسپلانٹیشن کوئی معمولی آپریشن نہیں تھا۔ انڈیا میں بھی اس کے مکمل علاج پر پچاس لاکھ کے قریب خرچہ آ رہا تھا۔ کسی مغربی ملک میں تو یہ دوگنا سے بھی زیادہ ہو جانا تھا......عمران کی مالی حالت کا مجھے پتا تھا۔ وہ ایک پرندے جیسی زندگی گزارتا تھا۔ آج جو کچھ ہے، وہ خرچ کر ڈالو......کل کی فکر نہ کرو۔ پیسا اس کے پاس آتا تو تھا لیکن ٹکتا نہیں تھا......آج کل بھی نصرت کے ٹیسٹوں کا بل دینے کے بعد وہ تقریباً قلاش تھا۔

اگلے روز میں، عمران کو بتائے بغیر خاموشی سے اپنے آبائی گھر پہنچا۔ وہاں سے مکان کی رجسٹری لی۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ کرائی اور علاقے کے ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس پہنچ گیا۔ اس شخص نے مجھے فوراً پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں کچھ بھولے بسرے منظر اور کچھ سوال ابھر آئے۔ ان مناظر اور ان سوالوں کا تعلق یقیناً اسی تاریک دن سے تھا جب مجھے ایک قریبی پارک میں سراج کے غنڈوں نے لہولہان کیا تھا اور میں چہرہ چھپا کر ہر شناسا نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اس نے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ''تم...... میرا مطلب ہے...... آپ...... وہی......''

''ہاں...... تم نے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں وہی ہوں...... میں نے ایک سیٹھ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا اور اس نے مار مار کر میرا حشر خراب کر دیا تھا...... بہت سے لوگوں نے تماشا دیکھا تھا۔ شاید تم بھی ان میں شامل ہو گے۔ اب پلیز...... مزید کوئی سوال نہ کرنا...... یہ میرے مکان کے کاغذات ہیں۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔''

پراپرٹی ڈیلر نے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر بند کر لیا۔

میں نے اسے مکان کی فروخت کر کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور واپس آ گیا۔

ایک عجیب سی پریشانی نے مجھے گھیر رکھا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ عمران پریشان ہے۔ اس کی یہی ادا تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی۔ وہ دوسرے کی پریشانی کو اپنی پریشانی بنا لیتا تھا اور پھر تن من دھن سے اسے رفع کرنے کی کوششوں میں لگ جاتا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو جان محمد صاحب آئے ہوئے تھے۔ عمران ان سے گفتگو میں مصروف تھا۔ عمران رات کو بھی اسسٹنٹ منیجر عباس کے ساتھ دیر تک ٹیلی فون پر بات کرتا رہا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ شاید وہ ایک بار پھر کسی خطرناک ''سرکس شو'' کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ میرے ذہن میں اسٹار سرکس کے وہ اسپیشل شو گھومنے لگے جن میں عمران اور اس کے ساتھی نہایت خطرناک کرتب دکھاتے تھے۔ بغیر حفاظتی جال کے جھولوں پر بازی گری، آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی زندہ ہدف پر چاقو زنی، اپنے پہلو یا پھر کنپٹی پر ریوالور وغیرہ رکھ کر گولی چلنے یا نہ چلنے والا رسک۔ اور ایسے بہت سے دیگر کام...... عمران ایسی خطرناک حرکات کو کبھی کبھی پیسا کمانے کے لئے بھی استعمال کرتا تھا۔

بہرحال، میرا یہ شک...... شک ہی رہا۔ مجھے اس بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں مذکورہ پراپرٹی ڈیلر سے ملا۔ اس نے مجھے یہ مایوس کن خبر سنائی کہ میرے مکان کی فوری فروخت ممکن نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے مکان کا رقبہ ان رقبوں میں شامل ہے جس کا ریکارڈ کچھ عرصہ پہلے جل کر ضائع ہو گیا تھا۔ اب میرے مکان کی ''فرد'' نہیں نکل سکتی اور فروخت کے لئے فرد کا ہونا بہت ضروری ہے۔

''اب کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''نئے سرے سے کاغذات کا ریکارڈ بنوانا ہوگا۔''

''اس میں کتنا وقت لگے گا؟''

''اگر آپ خود بنوائیں گے تو کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر دے دلا کر کام کرائیں گے تو بھی ڈھائی تین مہینے تو کہیں نہیں گئے۔ اخبار میں اشتہار وغیرہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ بھی قانونی کارروائی ہوتی ہے۔ شاید آپ کو ڈی پی او کے سامنے بھی پیش ہونا پڑے۔''

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

رات کو میں گھر واپس گیا تو میری توقع کے خلاف عمران بازار کے کسی تھڑے پر محلے داروں سے گپ شپ نہیں کر رہا تھا بلکہ کمرے میں خاموش بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کی گھمبیر خاموشی کے بعد عمران نے کہا۔ ''تم اپنا موبائل، گھر چھوڑ گئے تھے۔ ابھی ثروت کا فون آیا تھا۔''

''خیریت ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''نصرت کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ رات سے اسے تیز بخار ہے۔ پیٹ میں دائیں طرف درد بھی ہوتا ہے۔''

''ثروت کیا کہہ رہی تھی؟''

''اس کا خیال ہے کہ شاید کھانے پینے میں کچھ بد پرہیزی ہوئی ہے لیکن اصل بات وہی ہے جس کا ہمیں پتا ہے۔ بیماری تیز سے اسے جکڑ رہی ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمران بھی خاموش رہا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ گھر سے باہر بازار سے معمول کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ رکشے کا شور...... خوانچے والے کی صدا، بچوں کی چہکار۔ میوزک سینٹر سے بلند ہونے والے نغمے کی آواز موسم حسیں ہے لیکن تم سا حسیں نہیں ہے...... میری نظر سے پوچھو، تم سا کہیں نہیں ہے...... لیکن موسموں کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ انسان خوش ہو تو اسے چلچلاتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ غمگین اور پریشان ہو تو چاندنی بھی جھلسانے لگتی ہے۔

اچانک عمران کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جان محمد صاحب تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''عمران! کوئی تم سے ملنے آیا ہے، یہاں میرے دفتر میں۔''

''کون؟'' عمران نے پوچھا۔

''لو خود ہی بات کرو۔'' جان صاحب کی آواز موبائل کے اسپیکر میں سے ابھری۔

چند سیکنڈ بعد کوئی انگلش میں بولا۔ ''ہیلو ایمران! کیسے ہو؟ کہاں چھپے بیٹھے ہو برادر۔''

میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ بھاری بھرکم آواز مسٹر ریان ولیم کے علاوہ اور کسی کی نہیں

تھی۔ عمران بولا۔ "گڈ ایوننگ مسٹر ریان! آپ کب آئے؟"

"میں نے کہا تو تھا کہ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ تم سے ملنے کے لئے...... میں اور مسٹر رچی بہت بے چین تھے۔"

"یعنی مسٹر رچی بھی آئے ہیں؟"

"بالکل، وہ بھی موجود ہیں۔ انہیں بھی تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تم کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو یہاں؟"

"آپ دونوں اس وقت ہیں کہاں؟"

"جان محمد کے آفس میں۔ اگر تمہیں مشکل ہے تو ہم خود آجاتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ کیا میں...... ابھی آجاؤں؟"

"بالکل ابھی...... یہاں ایک دلچسپ معاملہ تمہارا انتظار کر رہا ہے......" ریان ولیم نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی، میں لباس تبدیل کر کے تیس چالیس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔"

قریباً گھنٹے بعد ہم جان محمد صاحب کے دفتر واقع میکلوڈ روڈ پر موجود تھے۔ گوشت کے پہاڑ مسٹر ریان ولیم نے بڑی گرم جوشی سے عمران کا استقبال کیا۔ پروفیسر رچی بھی ہم دونوں سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے۔ پروفیسر رچی کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ سرخ و سپید تھا اور نفیس سی عینک لگا رکھی تھی۔

چائے کی میز پر ہماری گفتگو شروع ہوئی۔ پہلے تو ان حیران کن واقعات کا ذکر ہوتا رہا جو چند ہفتے پہلے پیش آئے تھے۔ سوال و جواب کا وہ بے نظیر مقابلہ جس کی انعامی رقم ایک سو بیس کروڑ کے قریب تھی۔ اس انعامی مقابلے میں عمران اور ہیری کا ہارنا لیکن پھر اس ہار میں سے سلامتی اور جیت کا پہلو نکل آنا۔ ایک طرف تقریباً ایک سو بیس کروڑ روپے مالیت کے شاندار "فلیکس 900 سی" طیارے کا تباہ ہو جانا اور دوسری طرف ہیری کا لاٹری کے ذریعے ایک معقول رقم جیت جانا۔ یہ سارے واقعات زیادہ پرانے نہیں تھے اور ابھی تک ہمارے ذہنوں میں تازہ تھے۔

پروفیسر رچی تو پہلے ہی عمران کا گرویدہ تھا، اب ریان ولیم بھی نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے عمران کی ذہانت اور "لک" پر ایک وجدانی قسم کا بھروسا...... ہو چکا ہے۔ اس نے عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ایمران! میں اور رچی ایک بہت اہم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں اور پتا نہیں کیوں ہمیں یقین ہے کہ یہ کام تم بہت آسانی سے کر سکتے ہو۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے کسی لائق سمجھتے ہیں۔" عمران نے رسمی انداز میں کہا۔

پروفیسر رچی اور مسٹر ریان کی نظروں کا تبادلہ ہوا۔ پھر ریان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ایمران! یہاں ہمارا واسطہ ایک عجیب سے کریکٹر سے پڑا ہوا ہے۔ ایک ایسا بندہ جسے ہینڈل کرنا ہمارے لئے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ایک ایسا پیچیدہ بندہ ہے جو لالچ میں آرہا ہے، نہ پیار سے رام ہو رہا ہے، نہ سختی سے۔"

پروفیسر رچی نے اپنی گھنی بھوری مونچھوں کے نیچے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آنجہانی ہٹلر نے کہا تھا، جارحیت کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے۔ جو کام پیار محبت کے ساتھ برسوں میں نہیں ہو سکتا، وہ میں طاقت کے استعمال سے چند گھنٹوں میں بخوبی کر سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہٹلر بھی ہوتا تو یہاں آکر ناکام ہو جاتا۔"

"کوئی بہت سخت جان بندہ ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں...... اس کے الٹ ہے۔" مسٹر ریان نے جواب دیا۔ "سمجھو کہ سرکنڈے میں جان پھنسی ہوئی ہے۔ بالکل دبلا پتلا۔ عمر اسی سال سے اوپر ہے۔ بیماریوں نے گھیرا ہوا ہے۔"

جان محمد صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ "وہ جو کہتے ہیں نا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔"

"لیکن جناب! ہم اس سے حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک اہم سوال ہے مگر فی الحال اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے یا کہہ لو کہ مکمل جواب نہیں ہے۔" مسٹر ریان ولیم نے کہا۔

"آپ کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے؟" عمران نے سوال کیا۔

مسٹر ریان ولیم نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "کچھ لوگ ہم سے یہ کام معاوضے پر کروا رہے ہیں ایمران۔ خاصا معقول معاوضہ دے رہے ہیں۔ ہمیں ابھی تک صرف اتنا ہی پتا ہے کہ کوئی بہت خاص چیز ہے جو کسی غلطی سے یا پھر اتفاقاً اس سنکی بڈھے کے قبضے میں آگئی ہے۔ وہ یہ "چیز" واپس کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس پر بہت سختی بھی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے تمہیں بتایا نا کہ وہ کئی طرح کی بیماریوں کا شکار ہے۔ تین دفعہ تو اس کا بائی پاس ہی ہو چکا ہے۔ کسی بھی جسمانی صدمے کی وجہ سے اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ سکتی ہے۔ شاید تمہیں تھوڑا بہت اندازہ ہو کہ ایسے لوگ جو بالکل قریب المرگ ہوتے ہیں، اپنی زندگی موت کی طرف

سے خاصے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ یہ بڈھا بھی ان میں سے ایک ہے۔"

عمران نے کہا۔" جناب! آپ کی بات ٹھیک ہے کہ ایسے کچھ لوگ اپنی زندگی کی طرف سے بے پروا ہو جاتے ہیں مگر ان کو کسی بات پر مجبور کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے قریبی عزیز...... ان کے پوتے پوتیاں، ان کی ان محبتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

ریان ولیم نے کہا۔" یہاں اس معاملے میں یہی تو مصیبت ہے، یہ بالکل لنڈورا شخص ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ بیوی پچیس تیس سال پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ دو بیٹے تھے، وہ برسوں پہلے "اباجی" کی سخت مزاجی کی وجہ سے ان کو چھوڑ کر بیرون ملک جا چکے ہیں اور وہیں پر آباد ہیں۔ ان سے بزرگوار کا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہے۔ ایک بیٹی تھی، اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ بھی کوئی بیس برس پہلے فوت ہو چکی ہے۔ اب جناب اکیلے ہیں اور اپنے پانچ ایکڑ کے فارم ہاؤس میں تن تنہا رہتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی تھوڑی بہت دلچسپی ہے تو وہ پرندوں اور جانوروں میں ہے۔ انہوں نے فارم ہاؤس میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بنا رکھا ہے۔ اس چڑیا گھر کی دیکھ بھال کے لئے کچھ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ اپنی دیکھ بھال کے لئے ایک ڈاکٹر ہے اور دو تین ملازمائیں ہیں۔ خاصے امیر کبیر ہیں۔ چاہیں تو نئے ماڈل کی دو تین گاڑیاں رکھ سکتے ہیں مگر ایک ستر ماڈل کی شیورلیٹ رکھی ہوئی ہے اور اگر کہیں آنا جانا ہو تو اسی پر سفر کرتے ہیں۔"

عمران نے ریان ولیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔" جناب! آپ کے ذہن میں یہ بات کیوں آئی ہے کہ میں اس شخص کو ہینڈل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں؟"

ریان ولیم نے طویل کش لے کر سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور کہا۔"اس کی دو وجوہات ہیں ایمران۔ پہلی وجہ تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ میں تمہاری "لک" پر بہت بھروسا کرنے لگا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جس کام میں ہاتھ ڈالو گے، اس کا کوئی اچھا نتیجہ ہی نکلے گا اور دوسری وجہ تمہیں رچی بتائے گا۔ بتاؤ رچی۔" ریان نے پروفیسر رچی کی طرف دیکھا۔

رچی نے اپنے سرخ و سپید چہرے پر نفیس عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔"ایمران! جیسا کہ تمہیں مسٹر ریان نے بتایا ہے...... اس سنکی بوڑھے کا ایک ہی شوق ہے اور وہ ہیں جانور۔ وہ دن رات ان میں گم رہتا ہے۔ اگر ملک کا صدر یا وزیراعظم بھی اس کے فارم ہاؤس پر چلا جائے تو وہ اس کو اتنی اہمیت نہیں دے گا جتنی اس عام شخص کو دے گا جو کسی جانور کی کسی

خاص بیماری کے بارے میں اسے کچھ بتا سکتا ہو۔ وہ جانوروں سے پیار کرتا ہے اور ان لوگوں کو بھی اہمیت دیتا ہے جو جانوروں سے پیار کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے میرا ذہن تمہاری طرف گیا ہے ایمران...... تم جانوروں سے بہت جلد ناتا جوڑ لیتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ خاص صلاحیت اس سنکی کو ضرور متاثر کرے گی بلکہ حیران بھی کرے گی۔ تم ضرور اس کے قریب جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔" جناب! آپ نے ابھی تک اس بزرگ کا نام نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ رہتے کہاں ہیں؟"

مسٹر ریان نے کہا۔" یہاں لاہور کے قریب ہی کوئی قصبہ ہے، شاید شیکاؤ پورہ۔"

""شیکاؤ پورہ نہیں...... شیخوپورہ۔" جان محمد صاحب نے تصحیح کی۔" اور بابا جی کا نام سہراب جلالی ہے۔ بڑے مشکل سے بندے ہیں۔ اب عمر رسیدہ ہونے کے بعد مزید مشکل ہو گئے ہیں۔ میں نے بھی تھوڑا بہت ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔ کچھ عرصہ انگریز کی فوج میں بھی رہ چکے ہیں۔ یہ پاکستان، ہندوستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ ملازمت کے دوران میں ایک انگریز کرنل کا جبڑا توڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے۔ ہم نے جلالی صاحب سے اپنے سرکس کے لئے ریچھ کا ایک بچہ حاصل کیا تھا۔ تب ان سے واسطہ پڑا اور ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ بڑے سیلانی قسم کے بندے ہیں۔"

عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔" ریان صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ اگر ہمیں کوئی غیر قانونی یا ناجائز کام نہیں کرنا پڑے گا تو ہم حاضر ہیں لیکن ہمیں تھوڑا بہت اندازہ تو ہو جائے کہ ہمیں کرنا کیا ہو گا؟"

"سب سے پہلے تو اس گھر میں داخل ہونا ہے اور دیکھنا ہے کہ وہاں کس قسم کی سرگرمی ہے۔ اگر اگلے چھ سات روز میں یہ پہلا مرحلہ طے ہو گیا تو پھر تمہیں مزید ہدایات دے دی جائیں گی۔ باقی رہی کام کے جائز یا ناجائز ہونے کی بات تو یقین رکھو کہ یہ سو فیصد جائز کام ہے۔ وہ خبطی بڈھا ایک ایسی چیز پر قبضہ جمائے ہوئے ہے جو ہرگز اس کی نہیں ہے اور جس کا اس کے پاس رہنا اس کے اپنے لئے بھی خطرناک ہے۔ انڈر ورلڈ کے کئی لوگ ایسے ہیں جو اس شے کی خاطر اس کے جانی دشمن ہو سکتے ہیں۔"

اس انوکھے اور پُراسرار موضوع پر ریان ولیم اور پروفیسر رچی سے ہماری گفتگو قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ ریان ولیم کہنے کو تو یہی کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ناجائز کام کروانا نہیں چاہ رہا لیکن اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ یہ کام ناجائز بھی ہو سکتا تھا، غیر قانونی اور خطرناک

بھی۔

ہماری بات اختتام پذیر ہوئی تو ریان ولیم نے ایک چیک کاٹ کر عمران کے حوالے کیا۔

''یہ کیا ہے جناب؟'' عمران نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارا حصہ۔''

''کس چیز میں؟''

''اسی کوئز شو کے انعام میں جس میں تم نے حصہ لیا تھا۔'' ریان مسکرایا۔

''لیکن وہ تو ہم ہار گئے تھے۔''

''مگر ہمیں بنیادی انعام کی تھوڑی سی رقم تو ملی تھی۔ اس رقم سے جو لاٹری خریدی گئی، اس نے ہیری کو قریباً 8 ملین ڈالرز دلا دیئے۔ یہ سب قسمت کی کرشمہ سازی ہے۔ اس رقم میں سے یقیناً تمہارا بھی تھوڑا بہت حصہ بنتا ہے۔''

عمران انکار کرتا رہا لیکن ریان نے چیک زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے چیک پر ایک ترچھی سی نظر ڈالی۔ یہ پچاس لاکھ روپے کا تھا......

اس چیک کے بعد ریان ولیم نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے ایک اور چیک کاٹا۔ یہ پانچ لاکھ روپے کا تھا۔ ریان ولیم نے کہا۔ ''یہ اس کام کے لئے تمہارے ابتدائی اخراجات کے لئے ہے۔''

اس کے انداز سے اشارہ مل رہا تھا کہ اگر عمران کسی طرح ریان اور پروفیسر رچی کی توقعات کے مطابق کام کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ خاصی بڑی رقم حاصل کر سکے گا۔

اگلے دو تین روز میں کچھ واقعات تیزی سے رُونما ہوئے۔ یہاں وہی محاورہ صادق آ رہا تھا کہ قدرت جب دیتی ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ چند ہفتے پہلے کی کارکردگی کی بنیاد پر ایک معقول رقم عمران کے ہاتھ آ گئی تھی...... بلکہ آگے کے لئے بھی اچھے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ''تابش! یہ پچاس لاکھ روپے نصرت کا علاج شروع کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند ہفتوں میں مزید انتظام ہو جائے گا۔ تم ثروت سے بات کرو اور پروگرام طے کر لو۔''

''لیکن عمران! میں یہ رقم نہیں لے سکتا اور شاید ثروت بھی خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکے۔''

''میں مکا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دوں گا۔ تکلفات میں مت پڑو۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے۔ تم ابھی بات کرو ثروت سے۔''

''لیکن میں کس حیثیت سے اسے یہ رقم دوں اور وہ کس حیثیت سے قبول کرے گی؟ وہ اپنے شوہر کو کیا بتائے گی اس بارے میں؟''

''اس کا کوئی حل تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگا۔''

''لیکن عمران...... یہ رقم......''

''دیکھو تابی! زیادہ ''تکلف حسین خاں'' مت بنو۔ اگر زیادہ بات ہے تو اسے ادھار سمجھ لو۔ جب تمہارا مکان فروخت ہوگا، مجھے لوٹا دینا۔''

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اس نے حسبِ عادت اپنی ہتھیلی سے میرا منہ ڈھانپ دیا اور تب تک نہیں چھوڑا جب تک میں ڈھیلا نہیں پڑ گیا۔

رات کو میں دیر تک سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں ایک ہی طریقہ آ رہا تھا۔ میں اپنے چچا احمد کو اس کام کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ وہ آج کل ''ویانا'' میں رہائش پذیر تھے۔ آرسہ ان کی بیوی سلطانہ کی بھتیجی تھی۔ یہ آرسہ وہی کزن تھی جو مجھے شادی کے لئے گھیرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ جب ثروت مجھ سے جدا ہو کر بھائی ناصر کے ساتھ جرمنی چلی گئی تو آرسہ نے کئی طرح سے مجھ پر جال پھینکنے کی کوشش کی۔ اب قریباً ڈھائی سال پہلے آرسہ کی شادی ہو چکی تھی۔ چچا احمد اور چچی سلطانہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ دو سال پہلے ویانا چلے گئے تھے۔

اگلے روز میں نے ثروت کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ راوی روڈ والے گھر پر آ جائے مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ ثروت خاصی ذہین تھی۔ بے شک میں نے اسے نصرت کی حالت کے بارے میں کھل کر کچھ نہیں بتایا تھا مگر وہ جان چکی تھی کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں اور شاید وہ خدشے بھی درست ثابت ہوئے ہیں جو نصرت کے بارے میں شروع میں ظاہر کئے گئے تھے۔

وہ سہ پہر کے وقت آئی۔ میں اس سے اکیلے میں اور تفصیلاً بات کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا عمران اور اقبال اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے چلے گئے تھے۔ ثروت نے کبھی برقع نہیں پہنا تھا لیکن آج کل وہ اپنی آمدورفت کو چھپانے کے لئے برقع استعمال کر رہی تھی۔ ہر لباس کی طرح برقع بھی اس کے جسم پر بہت جچتا تھا۔ حالانکہ وہ زینت کے لئے نہیں پردے کے لئے تھا۔ نقاب میں سے بس اس کی خوب صورت آنکھیں ہی نظر آتی تھیں اور یہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ آج کل دکھ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

میں نے کہا۔ ’’ثروت! آنکھیں بند کرنے سے حقیقت اوجھل نہیں ہو جاتی۔ اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جب بندہ ایک بار حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتا ہے تو پھر بڑے بڑے مسئلوں کا حل بھی نکل آتا ہے۔ ہمیں اب یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نصرت بیمار ہے......اور خاصی بیمار ہے......‘‘

ثروت نے ایک سرد آہ بھری اور دل کڑا کر کے پوچھا۔ ’’رپورٹس کیا کہتی ہیں؟‘‘

’’جگر کا کینسر۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرتے رہے......

میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔ ’’ثروت! ہم نصرت کا علاج کروا رہے ہیں اور تم دیکھنا وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔‘‘

’’کیا دوائیوں سے علاج ہو جائے گا؟‘‘ اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔

’’نہیں ثروت! اس کے لئے سرجری کی ضرورت پڑے گی اور یہ سرجری باہر کے ملک میں ہو تو زیادہ اچھا ہے۔‘‘

’’لل......لیکن اس پر تو بہت زیادہ خرچہ آئے گا۔‘‘

’’خرچے کی فکر نہ کرو۔ جس طرح فرح میری چھوٹی بہن ہے، اسی طرح نصرت بھی ہے۔ ہم اس کی بیماری سے لڑیں گے اور اللہ نے چاہا تو جیت کر دکھائیں گے۔‘‘

’’لیکن یہ کس طرح سے ہو گا تابش! میں یوسف کو کیا بتاؤں گی۔ میں تو پہلے ہی بہت ڈر رہی ہوں۔ میں یوسف کو بتائے بغیر آپ سے مل رہی ہوں۔ انہیں پتا چل گیا تو پتا نہیں وہ کیا سوچیں گے۔‘‘

’’میں اس سارے معاملے میں نہیں آؤں گا ثروت...... سب کچھ کسی اور طرح سے ہو گا۔ میں نے طریقہ سوچ لیا ہے۔‘‘

’’کیسا طریقہ؟‘‘

’’چچا احمد اور چچی جان آج کل آسٹریا میں ہیں۔ شاید ویانا میں ہی رہ رہے ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ہم نصرت کو علاج کے لئے بھی ویانا ہی لے جائیں گے۔ میں چچا احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری پوری پوری مدد کریں گے۔ ویسے بھی وہ تم دونوں بہنوں سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ یہی ظاہر کریں گے کہ وہی نصرت کو علاج کے لئے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ اور وہی اخراجات میں بھی تعاون کریں گے۔ بس یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب کچھ ارینج کر لوں گا۔‘‘

ثروت نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں اور جیسے چونک کر میری طرف دیکھا۔

’’ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ اس نے پلکیں جھکا لیں۔

اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی مجھ میں رُونما ہونے والی بتدیلیوں پر حیران ہے۔ میں جو ماضی قریب میں ہر طرح سے ایک ناتواں اور دبا ہوا شخص تھا، اب مشکل حالات کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا تھا اور میرے لب و لہجے کا اعتماد ثابت کرتا تھا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔

مجھے یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ میرا اعتماد ثروت کو بھی اعتماد بخش رہا ہے۔ وہ جو نصرت کی بیماری کے متعلق بات کرنے سے بھی خوف زدہ رہتی تھی، اب بات کر رہی تھی۔ مجھ سے مختلف سوالات پوچھ رہی تھی۔ میں نے بجلی کی کیتلی کے ذریعے اسے چائے بنا کر دی۔ میرے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے اس کی نازک انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ اس مختصر لمس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا اور میرے ذہن میں یادوں کے اَن گنت دریچے وا ہو گئے۔ جب ہم قریب تھے، یک جان دو قالب کی طرح...... شب و روز میں ایک جادو تھا۔ موسم حسین تھے۔ کانوں میں ہر وقت نغمے گونجتے تھے اور دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی لے پر رقص کرتی تھیں۔

میں نے سوچا...... کیا ثروت کو بھی وہ سب کچھ یاد ہے؟

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یاد نہ ہو؟ انسان کتنا بھی بدل جائے، رسم و رواج، مذہب اور معاشرے کے بندھن اُسے کتنا بھی جکڑ لیں، دل و دماغ میں نقش ہو جانے والی سنہری یادوں کو کھرچا تو نہیں جا سکتا۔ ذرا سی ہوا چلے تو ماہ و سال کے در کھل جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ جنہیں کوئی گریز، کوئی وجہ روک نہیں سکتی۔

رات کو فون پر چچا احمد سے میری طویل بات ہوئی۔ میں نے انہیں ساری صورتِ حال بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں......

نصرت کی بیماری کے معاملات نے چچا احمد کو بھی بہت پریشان کیا۔ وہ آبدیدہ ہو گئے۔ وہ ویانا کی کسی الیکٹرک کمپنی میں درمیانے درجے کی ملازمت کرتے تھے۔ چار پانچ افراد کی فیملی تھی۔ بس گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں نے چچا احمد کو ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں بھی تھوڑا بہت بتایا اور انہیں آگاہ کیا کہ نصرت کے علاج کا کام ہمیں کس طرح کرنا ہو گا۔ اس سارے کام میں میرا نام نہیں آنا تھا۔ چچا احمد کو خود ہی ثروت سے رابطہ کرنا تھا اور پھر نصرت

کے علاج معالجے کی بات آگے چلانا تھی......

ایک دن بعد چچا احمد سے میری ایک اور ٹیلی فونک گفتگو ہوئی۔ اس میں مزید تفصیلات طے کی گئیں۔ میں نے قریباً پچاس لاکھ روپے ویانا میں چچا احمد کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا انتظام بھی کر دیا۔

ایک طرف یہ کام ہو رہا تھا، دوسری طرف عمران مسٹر ریان ولیم کی ہدایت کے مطابق شیخوپورہ کے قریب سہراب جلالی کے فارم ہاؤس میں پہنچ چکا تھا۔ وہ وہاں باورچی کے روپ میں داخل ہوا تھا اور اس طرح مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ جہاں اور بہت سے کام کر لیتا ہے، وہاں کھانا پکانا بھی جانتا ہے۔ رات کو اس نے جلالی کے فارم ہاؤس سے ہی مجھے فون کیا۔ ”جگر! اب آ جاؤ تم بھی۔ مجھ سے اکیلے یہ سارا کام نہیں سنبھالا جا رہا۔ پیاز کاٹ کاٹ کر میں نابینا ہونے والا ہوں۔“

”ایسے کام تو مجھ سے بھی نہیں ہوں گے۔“

”لیکن کچھ ایسے کام بھی ہیں جو تم کر لو گے۔ بس اب آ جاؤ فٹافٹ۔ میں نے جلالی صاحب سے کہہ رکھا ہے کہ میرا اسسٹنٹ بھی ایک دو دن میں آنے والا ہے۔ پرسوں یہاں ایک دعوت بھی ہے۔ میں تو پیاز چھیل چھیل کر مینا کماری بن جاؤں گا۔“

”مینا کماری کیوں؟“

”بھئی میں رونے دھونے کی بات کر رہا ہوں۔ باقی یہاں کے حالات واقعی گڑبڑ ہیں۔ اندر خانے کچھ نہ کچھ ہے۔ ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں جان کر میری کھوپڑی فیل ہو گئی ہے۔ تم آؤ گے تو کچھ مشورہ بھی ہو جائے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں، ایک ایک اور دو گیارہ۔“

”کس قسم کی باتیں ہیں؟“

”بس کچھ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔ لگتا ہے کہ یہاں کوئی فلم چل رہی ہے۔ تو پھر کب پہنچ رہے ہو تم؟“

”میں چاہتا ہوں کہ ثروت اور نصرت یہاں سے علاج کے لئے روانہ ہو جائیں تو پھر آؤں۔“

”جگر! وہ کام تو اب ہو ہی جانا ہے۔ ابھی جیلانی کا فون آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آٹھ دس روز تک ویزا لگ جائے گا۔ اب وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم بس آنے والی بات کرو۔“

”ٹھیک ہے، کل شام تک پہنچ جاؤں گا...... لیکن آنا کس حیثیت سے ہے؟“

”تمہیں بتایا تو تھا، تم میرے معاون ہو۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بڑے ہندوستانی صنعت کار نے لاہور میں ہمارے ہاتھ کا کھانا کھایا اور ہمیں اپنے ساتھ انڈیا لے گیا۔ انڈیا میں ہم دونوں کئی کھاتے پیتے گھرانوں میں خدمات انجام دے چکے ہیں جن میں مشہور فلمی ستارے بھی شامل ہیں۔ مثلاً راج کپور، سمیتا پاٹیل، امجد خان، دیویا بھارتی۔“

”جن ستاروں کے تم نے نام لئے ہیں، وہ سارے کے سارے دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔“

”تو یار! انہوں نے ہمارے کھانوں کی وجہ سے تو کوچ نہیں کیا ہے۔ اور اگر کیا بھی ہے تو اس میں اچھائی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ ہمارے پکائے ہوئے کھانے اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ بندہ ان پر اپنی جان لٹا دیتا ہے۔“

”اچھا زیادہ زبان مت چلاؤ۔ مجھے وہاں کس نام سے پہنچنا ہے اور تمہیں کس نام سے بلانا ہے؟“

”تم اپنے اصلی نام سے ہی آؤ گے اور مجھے جس طرح کی عزت چاہے دے لینا۔ استاد جی کہہ لینا، ماسٹر جی، جناب، سر، وغیرہ وغیرہ۔“

...... وہ ایک شفق رنگ شام تھی جب میں ایک دیہاتی تانگے سے اترا اور فارم ہاؤس کے عین دروازے کی طرف بڑھا۔ میں عام سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اس وسیع فارم ہاؤس کو ایک دس فٹ اونچی پختہ دیوار سے محفوظ کیا گیا تھا۔ دیوار سے اوپر خاردار تار بھی تھے۔ گیٹ پر دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ انہیں میری آمد کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا لہٰذا مجھے گیٹ سے گزرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک محافظ نے پکار کر کہا۔ ”فتح محمد! ان بھائی صاحب کو باورچی خانے میں عمران صاحب کے پاس پہنچا دو۔“

فتح محمد گھنی مونچھوں اور گہری رنگت والا ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ ہونٹ سگریٹ نوشی کے سبب سیاہ تر تھے۔ اس کے کندھے سے پستول کا سیاہ ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے پرکھنے والی نظروں سے دیکھا پھر ایک لفظ کہے بغیر میرے آگے آگے چل دیا۔ فارم کی زمین کے بیچوں بیچ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت تھی۔ دیواروں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ عمارت کا رقبہ قریباً دو کنال ہوگا۔ عمارت تک ایک طویل ڈرائیو وے جاتا تھا۔ اس کی دونوں طرف کیاریاں تھیں اور سفیدے کے درخت تھے۔

سورج کا سرخ تھال ان درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ دائیں طرف ٹیڈی بکریوں کا ایک بہت بڑا باڑا نظر آ رہا تھا۔ بائیں طرف ایک فش فارم تھا جس کے کنارے پر خشک گوبر وغیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم ڈرائیو وے پر چلتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔ اس پیدل سفر کے دوران میں نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا رہا کہ کچھ نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ پورچ میں جلالی صاحب کی پرانی شیورلیٹ ایک نئی شان کے ساتھ موجود تھی۔ جلد ہی میں کوٹھی کے وسیع باورچی خانے میں عمران کے ساتھ موجود تھا۔

فتح محمد ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔

''تم بڑے وقت پر آئے ہو تابی...... یہاں زبردست مار کٹائی ہونے والی ہے۔''

''کس کے ساتھ؟''

''میرے ساتھ۔''

''کیا مطلب؟''

اس نے کھڑکی میں دور کھڑے ایک ہٹے کٹے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک کوتاہ قامت شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے انداز اور حرکات وسکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ ''یہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں کا بڑا ویٹرنری ڈاکٹر۔ اس نے یہاں کے سارے جانوروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔''

''لیکن یہ تم سے کیوں جھگڑے گا؟''

''بس اس کی دُم پر میرا پاؤں آ گیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں مرچیں بھری گئی ہیں۔''

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے وسیع باورچی خانے پر ایک نظر ڈالی۔ تین، چار دیگچوں میں کھانا پک رہا تھا۔ عمران بڑی مہارت سے باری باری ان میں چمچہ چلا رہا تھا۔ خوشبو مزے دار تھی اور اس بات کا پتا دیتی تھی کہ وہ اس کام میں اناڑی نہیں ہے۔ باورچی خانے میں تمام جدید اور مہنگی سہولتیں موجود تھیں۔ ایک طرف ماضی کی مشہور فلم اسٹار جین فونڈا کی ایک بڑی تصویر لگی تھی۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں فلم اسٹار ''کک'' کا لباس پہنے کچھ پکانے میں مصروف تھی۔ ایک الماری میں کوکنگ سے متعلق بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔

''لو جی، وہ پھڈے باز اسی طرف آ رہا ہے۔'' عمران نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

درمیانی عمر کا ہٹا کٹا شخص غصے میں تپا ہوا باورچی خانے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا انداز تشویش ناک تھا۔

عمران نے دو چولہے بند کئے اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ مار کھانے کے لئے یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! دیکھو یہاں اتنی خوب صورت فلم اسٹار کی تصور لگی ہوئی ہے۔ کیسی Live تصویر ہے۔ لگتا ہے وہ باقاعدہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ اتنی حسین عورت کے سامنے بے عزت ہونے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔''

وہ نکلا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مار کھانے کی باتیں جان بوجھ کر کر رہا ہے۔ ایک ویٹرنری ڈاکٹر بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہیں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو، تم صرف خانساماں ہو اور وہ بھی اسسٹنٹ خانساماں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند سیکنڈ بعد ہٹا کٹا شخص دندناتا ہوا باورچی خانے میں داخل ہوا۔ پھر ہمیں ساتھ والے کمرے میں دیکھ کر ہماری طرف چلا آیا۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال ہو گی۔ ناک چوڑی اور پھولی ہوئی تھی۔ ماتھے پر کٹ کا پرانا نشان اس کی تندمزاجی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

وہ عمران کو دیکھ کر پھنکارا۔ ''میں نے کل کیا کہا تھا تم سے؟ کیا کہا تھا؟ میں نے بکواس کی تھی کہ میرے کام میں دخل مت دو۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! وہ اتنی [illegible]گی بلی...... وہ مر رہی تھی اور آپ لاہور گئے ہوئے تھے۔ مجھے لگا کہ اس کے اندر کچھ نہ گیا تو وہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔''

''وہ مر جاتی۔ ساری بلیاں مر جاتیں لیکن تم حرامزادے کون ہوتے ہو میرے معاملوں میں ٹانگ اڑانے والے۔ کون سی ڈگری ہے تمہارے پاس؟ کیا کوالیفکیشن ہے تمہاری؟ کس باغ کی مولی ہو؟''

اس نے عمران کو زور سے دھکا دیا۔ عمران دیوار سے ٹکرایا پھر غصے میں بولا۔ ''دیکھو ڈاکٹر راشد! زبان سے بات کرو، ہاتھ مت چلاؤ۔ ورنہ......''

اس نے ہاتھ گھما کر عمران کو تھپڑ مارا۔ ''ورنہ کیا...... ورنہ کیا...... کیا کر لے گا تُو...... کتے کے بچے...... دو ٹکے کے باورچی...... میں دانت توڑ دوں گا تیرے۔'' وہ عمران پر پل پڑا۔

عمران گر گیا۔ اس نے لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

میں نے عمران کو چھڑانے کی ادھوری سی کوشش کی۔ اس کوشش میں مجھے بھی ایک دو گھونسے پڑے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عمران کی کوئی پلاننگ ہے۔

عمران پر غصہ اتارنے کے بعد ڈاکٹر راشد پھنکارتا اور گالیاں بکتا ہوا واپس چلا گیا۔

عمران کی ایک باچھ سے خون رِسنے لگا تھا۔ رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔

عمران واپس باورچی خانے میں آ گیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کسی صابر شاکر بیوی کی طرح پھر سے کھانا پکانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ پچھلے چار پانچ دنوں میں اس ڈاکٹر راشد سے کافی یاد اللہ ہو گئی ہے تمہاری۔''

''تمہیں پتا ہے، اڑیل بندوں سے یاد اللہ ہو ہی جاتی ہے میری۔ یہاں جلالی صاحب کے چڑیا گھر میں ایک بڑی قیمتی ایرانی بلی ہے۔ دس پندرہ دن میں اس نے بچے بھی دینے ہیں۔ وہ بیمار ہے۔ دو ہفتے سے کچھ بھی کھا پی نہیں رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی ''ٹریٹ منٹ'' اس پر الٹا اثر کر رہی تھی۔ میں نے بلی کو پیار محبت سے سمجھایا۔ اسے گانا سنایا...... کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے...... بلی کا دل پسیج گیا۔ اس نے آج میرے ہاتھوں سے قریباً ایک پاؤ دودھ پیا ہے۔ بس اسی بات سے ڈاکٹر صاحب کو تپ چڑھ گئی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں ''کارِ سرکار'' میں مداخلت کر رہا ہوں۔''

''لیکن اس اچھے کام کے لئے تمہیں اس ڈنگر ڈاکٹر سے مار کھانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بس یہ معرفت کی باتیں ہیں۔'' اس نے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے باورچی خانے کے چوبی اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''فون پر تم نے بتایا تھا کہ یہاں، فارم ہاؤس میں کچھ الٹی سیدھی باتیں ہو رہی ہیں۔''

''یار! تم بڑے گھامڑ ہو۔ ابھی جو کچھ تم نے دیکھا ہے، کیا وہ الٹا سیدھا نہیں ہے؟ ایک سانڈ نما ڈاکٹر نے تمہارے سامنے تمہارے یار کو مارا پیٹا ہے اور دندناتا ہوا واپس چلا گیا ہے۔ اور کیا یہ الٹا سیدھا نہیں ہے کہ تمہاری شکل میں ایک ایسا شخص یہاں باورچی کی خدمات انجام دینے آیا ہے جسے انڈا تلنا بھی نہیں آتا۔ اور اگر اس کے علاوہ بھی کچھ الٹا سیدھا دیکھنا چاہتے ہو تو وہ بھی دیکھ لینا۔ ابھی رات ہونے والی ہے۔''

''کیا مطلب، رات ہونے والی ہے؟''

''یار! اکثر الٹی سیدھی باتیں رات ہی کو تو ہوتی ہیں۔'' اس نے آنکھ میچی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اس نے ایک نیپکن کی گدی بنائی اور اسے چولہے پر گرم کر کے اپنے رخسار کی چوٹ کی ٹکور کرنے لگا۔

میں عمر رسیدہ سہراب جلالی کو دیکھنا چاہتا تھا مگر رات گئے تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تاہم میں نے جلالی کے پرائیویٹ چڑیا گھر کا ایک حصہ ضرور دیکھا۔ وہ یقیناً جانوروں میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ان کی رہائش اور خوراک وغیرہ کا بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً اس کام پر لاکھوں خرچ ہو رہے تھے۔ اس نے بعض جانوروں کی ملکیت کے لئے باقاعدہ لائسنس لے رکھے تھے۔ کئی قسم کے ہرن، سانپ، ریچھ اور زیبرے وغیرہ اس کی کولیکشن کا حصہ تھے۔ حال ہی میں اس نے تیندوے کا ایک جوڑا بھی حاصل کیا تھا۔ ابھی وہ عارضی قیام گاہ میں تھا۔ اب اس جوڑے کے لئے ایک شایانِ شان رہائش گاہ تیار ہو رہی تھی۔ اس رہائش گاہ کے عقب میں نایاب اور کم یاب پرندوں کے بہت سے پنجرے تھے۔

عمران کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ جانوروں کا ایک ڈاکٹر چوبیس گھنٹے یہاں فارم میں رہتا ہے۔ اس کے ساتھ دو اسسٹنٹ بھی ہیں۔ سینئر ڈاکٹر راشد ایک دن چھوڑ کر یہاں وزٹ کرتا ہے۔ سہراب جلالی کے دو ذاتی معالج ہیں۔ دونوں نوجوان ڈاکٹرز ہیں۔ اس کے علاوہ فارم ہاؤس میں ملازمین کا ایک دستہ ہے جس کے ارکان کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ مرد ملازم فارم ہاؤس میں خدمات انجام دیتے ہیں جبکہ ملازمائیں کوٹھی کے اندر ہوتی ہیں۔

رات سکون سے گزری۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سہراب جلالی سے میری پہلی ملاقات اگلے روز صبح سویرے ہی ہو گئی۔ عمران بڑی چابکدستی سے ناشتا تیار کر رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھا۔ جیسے انڈا پھینٹنا، ٹماٹر اور پیاز کاٹنا، آئل گرم کرنا۔ اچانک ایک چھوٹے سے ٹیڈی کتے کی باریک آواز سنائی دی۔ کتا تیزی سے کچن کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت اسٹریپ تھا۔ یہ اسٹریپ جس شخص کے ہاتھ میں تھا، وہ سہراب جلالی تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس کا وزن بمشکل پچاس کلوگرام رہا ہوگا۔ اس نے نیکر پہن رکھی تھی جس میں سے اس کی سوکھی سڑی ٹانگیں، دو چوبی بیساکھیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ چہرہ جھریوں بھرا، مونچھیں سفید اور گھنی، آنکھیں گدلی تھیں۔ اپنے نیم گنجے سر کو اس نے پی کیپ سے چھپا رکھا تھا۔ عمران نے

مجھے بتایا تھا کہ جلالی کا دل ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ اس کے سینے میں دل کی رفتار برقرار رکھنے کے لئے ''پیس میکر'' لگا ہوا ہے۔ اس پیس میکر کے علاوہ بھی جلالی کی ''بے مثال صحت'' کی کچھ نشانیاں اس کے لاغر جسم پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی ایک کلائی پر انجکشن وغیرہ لگانے کے لئے ''کینولا'' لگا ہوا تھا۔ جسم سے کسی فاسد مادے کے اخراج کے لئے لگائی جانے والی تھیلی بھی کمر سے جھول رہی تھی۔

ان ساری صعوبتوں کے باوجود وہ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے عمران کے رخسار کی چوٹ پر ہی پڑی۔ ''یہ کیا ہے بھئی؟'' اس نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔

''بس جی...... کل کھڑکی کا پٹ لگ گیا تھا......''

جلالی بولا۔ ''کھڑکی کا پٹ لگنے سے ایسی چوٹ تو نہیں آتی۔ یہ تو لگتا ہے کہ کسی نے گھونسا مارا ہے۔ نیچے ٹھوڑی پر بھی نیل نظر آ رہا ہے۔''

''نن...... نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''ڈاکٹر راشد سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا؟''

''نہیں جی۔ ان سے جھگڑا کیوں ہوگا؟''

''وہ اپنے کام میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا اور تم تین دن سے ایرانی بلی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو۔'' جلالی کا لہجہ تھوڑا سا سخت تھا۔

''غلطی ہوگئی تھی جی...... اب ایسا نہیں کروں گا۔''

''کیوں نہیں کرو گے تم ایسا؟ تم ایسا کرو گے بلکہ آج سے چاروں ایرانی بلیوں کی خوراک کی ذمے داری تمہاری ہے۔''

''مم...... میں سمجھا نہیں جی۔''

''تمہیں پتا ہے، میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ ایرانی بلیوں کا وزن مسلسل کم ہو رہا ہے۔ انہیں کھانا پلانا تمہاری ذمے داری ہے۔''

''لیکن...... جناب...... ڈاکٹر راشد صاحب؟''

''ڈاکٹر راشد ملازم ہے، مالک نہیں ہے۔ مالک میں ہوں۔ اور تم وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور اس کو تم سے معافی بھی مانگنی پڑے گی۔''

''معافی...... ابات کی جی؟''

''زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ میں جانتا ہوں یہاں کل جو کچھ ہوا ہے۔ اور اب اپنی چونچ بند کرو۔ وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔''

عمران نے اثبات، میں سر ہلایا۔ جلالی نے جیسے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر بولا۔ ''اور یہ کون ہے؟''

''تابش نام ہے جی اس کا۔ میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ یہ میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔''

جلالی نے ایک مرتبہ پھر مجھے گھورا اور پھر سر ہلا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے، اسے یہاں کے اصول قاعدے اچھی طرح سمجھا دو۔''

''جو حکم جناب۔'' عمران نے ادب سے سر جھکایا۔ میں نے بھی گردن کو خم دیا۔ سہراب جلالی نے ٹیڈی کتے کے اسٹریپ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ شتابی سے واپس مڑا...... سہراب جلالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

سہراب جلالی کے جانے کے بعد عمران نے دائیں بائیں دیکھا پھر جلالی کی نقل اتارتے ہوئے اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ آنکھوں پر خیالی چشمے کو درست کیا...... نیکر کے ''گیلوز'' کو اوپر کی طرف کھینچا اور بولا۔ ''برخوردار! دوپہر کا کھانا ٹھیک بارہ بجے اور رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے کھایا جاتا ہے۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ کم۔ سونے کا وقت دس بجے ہے۔ دس بجے تک ساری روشنیاں بجھ جانی چاہئیں۔ سگریٹ نوشی ایک دم ممنوع ہے...... بلکہ ہر طرح کی تمباکو نوشی۔ کوئی ملازم یا اس کا کوئی ملاقاتی ایسا کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے سزا کے طور پر فارم کے دو چکر دوڑ کر لگانے پڑیں گے اور تنخواہ کا چوتھائی حصہ کاٹ لیا جائے گا۔ ٹی وی دیکھنا بھی منع ہے...... موسیقی دھیمی آواز میں سنی جا سکتی ہے لیکن وہ بھی پرانی۔ ''ویڈیو'' پر پرانی انگلش اور اردو فلمیں دیکھی جا سکتی ہیں...... اسّی کی دہائی سے بعد کی فلمیں دیکھنے پر بھی خاطر خواہ جرمانہ ہوگا...... اور تم...... تم ایسے مسکرا کیوں رہے ہو؟ میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو؟ مذاق سمجھ رہے ہو؟''

اس نے غصے میں آ کر کچن کی میز پر زور سے مکا مارا۔ جلالی کے انداز میں عینک کو درست کیا اور پھنکارا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے...... دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... تمہاری تنخواہ تمہارے ایڈریس پر بھیج دی جائے گی۔ گیٹ آؤٹ۔'' اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ جلالی کے انداز میں اپنی ذاتی ڈاکٹر کو آواز دیتے ہوئے بولا۔ ''مہناز...... گولی لاؤ...... سانس ٹھیک کرنے والی گولی لاؤ۔''

''یہ ڈراما بند کرو۔ میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ جلالی صاحب کس ٹائپ کی چیز ہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب کو کل والے واقعے کا پتا کیسے چلا؟ یہاں بھی حکم جی کے دربار کی

طرح کوئی جادو وغیرہ تو نہیں چلتا؟'' میرا اشارہ کل ہونے والی مار پٹائی کی طرف تھا۔

''جادو تو ہر جگہ چلتے ہیں پیارے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ جدید جادو ہیں۔ انٹرنیٹ بھی ایک جادو ہے۔ یہ سیٹلائٹس بھی جادو ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر باسی کے گھر کا صحن تک دیکھ سکتے ہیں......''

''یہاں کون سا جادو ہے...... انٹرنیٹ یا سیٹلائٹ؟''

''یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں۔''

''بہت خوب! مجھے لال کوٹھیاں یاد آ گئیں۔ وہاں بھی تو میڈم صفورا نے خفیہ نگرانی کا نظام قائم کیا ہوا ہے...... لیکن...... ایک بات کی وضاحت فرما دو۔''

''ارشاد۔''

میں نے کچن میں دائیں بائیں دیکھا پھر ہولے سے کہا۔ ''اگر یہاں خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں تو پھر ابھی تم نے جلالی صاحب کی جو بھونڈی نقل اتاری ہے اور ان کے اسٹائل کی مٹی پلید کی ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''اتنی کچی گولیاں میں نے نہیں کھیلی ہوئیں...... بلکہ میں نے تو سرے سے گولیاں ہی نہیں کھیلیں...... کیمرے ہر جگہ نہیں ہیں۔ بس خاص خاص جگہوں پر ہیں......''

''یعنی کل جس کمرے میں ڈاکٹر راشد نے تمہیں تھپڑ اور ٹھڈے وغیرہ مارے وہاں کیمرا نصب تھا؟''

''عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ کل جب عمران نے ڈاکٹر راشد کو غصے کی حالت میں کچن کی طرف آتے دیکھا تھا تو یہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں کیوں چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا...... یار، یہاں پری چہرہ جین فونڈا کی تصویر لگی ہوئی ہے، یہاں مار کھاتے اچھا لگوں گا۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کے پیچھے اکثر کوئی وجہ ہوتی تھی۔

شام کے ٹھیک چار بجے جب میں اور عمران کچن میں چائے کی تیاری کر رہے تھے، میں نے ڈرائنگ روم میں سہرب جلالی کو دیکھا۔ وہ گداز صوفے میں دھنس کر بیٹھے ہوئے تھے اور صوفے کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ ڈاکٹر راشد سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ان کا انداز سمجھانے بجھانے والا تھا۔ آج وہ بڑے تحمل سے بات کرتے نظر آ رہے تھے۔ گرانڈیل ڈاکٹر راشد اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ موضوع گفتگو یقیناً کل والا واقعہ ہی تھا۔ شاید جلالی صاحب، ڈاکٹر راشد کو آمادہ کر رہے تھے

کہ وہ اپنی جارحیت پر عمران سے معذرت کر لے۔

جب ملازم ان دونوں کو چائے سرو کر کے آیا، تب تک سب ٹھیک تھا۔ پھر پتا نہیں کیسے اچانک جلالی صاحب ہتھے سے اکھڑ گئے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آواز سنی۔ ڈرائنگ روم میں جھانکا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے چٹاخ سے ایک زوردار تھپڑ ڈاکٹر راشد کے منہ پر مارا پھر ایک چھتری پکڑ لی۔ وہ بڑی تیزی سے اسے پیٹنے لگے۔ وہ ہکا بکا تھا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن جلالی صاحب اسے موقع ہی کہاں دے رہے تھے...... وہ الٹے پاؤں چلتا چلتا پشت کے بل گرا۔ جلالی صاحب نے اسے ٹھوکریں ماریں۔ ڈاکٹر کبھی شدید غصہ دکھاتا تھا، کبھی معذرت کا انداز اختیار کرتا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔ ''نکل جاؤ یہاں سے۔ اور یہ کپڑے بھی اتارو۔ یہ وردی میری دی ہوئی ہے...... اتارو یہ وردی بھی۔''

جلالی صاحب نے ڈاکٹر راشد کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اس کی شرٹ اتارنے کی کوشش کی۔ جلالی صاحب کا مطمع نظر سمجھ کر گارڈز ڈاکٹر راشد کی طرف لپکے۔ جلالی صاحب ڈاکٹر راشد کو مار رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کے کپڑے اتارنے کا حکم بھی دے رہے تھے۔ دو منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر راشد کے جسم پر چڈی اور بنیان کے سوا اور کچھ نہ رہا۔

جلالی صاحب دہاڑے...... ''دو منٹ کے بعد تمہیں فارم کے اندر نظر نہیں آنا چاہئے۔ ورنہ کتے چھوڑ دوں گا......''

ہم نے ڈاکٹر راشد کو بڑی بے توقیری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے اور راہِ فرار اختیار کرتے دیکھا۔ جلالی صاحب کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ایک طرف سے نوجوان لیڈی ڈاکٹر مہناز اپنے سفید کوٹ میں دوڑتی ہوئی آئی۔ ایک ملازم وہیل چیئر لایا۔ جلالی صاحب بے دم ہو کر اس پر بیٹھ گئے۔ یہ قریباً ویسا ہی نقشہ تھا جو آج سویرے عمران نے مذاق مذاق میں کھینچا تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر فوراً انہیں ایک گولی کھانے کے لئے دی۔

وہ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون ہونے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔ جلالی صاحب کا پارا بدستور چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل فون نکالا اور اپنے سیکرٹری ندیم سے کہا کہ وہ ڈاکٹر عقیل کا نمبر ملائے۔ ڈاکٹر مہناز اپنا خوب صورت ہاتھ جلالی صاحب کے سینے پر چلا رہی تھی اور انہیں آمادہ کر رہی تھی کہ وہ ابھی کسی سے بات نہ کریں۔ لیکن جلالی صاحب کی تیوریاں بتا رہی تھیں کہ وہ اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں۔

سیکرٹری ندیم نے نمبر ملایا تو انہوں نے فون پر گرجتے ہوئے کہا۔ اسے باریک آواز

میں گرجنا کہا جا سکتا تھا۔ ''ڈاکٹر عقیل! کہاں ہو تم؟......ٹھیک ہے......ٹھیک ہے۔ فوراً لاہور واپس آؤ......اور شیخوپورہ پہنچو۔ میں تمہیں ابھی اسی وقت اس بدمعاش راشد کی جگہ پر اپائنٹ کر رہا ہوں......ابھی اسی وقت......نہیں......نہیں......یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم ابھی شیخوپورہ پہنچو۔ یہ حکم ہے میرا۔''

جلالی کے مزاج کا یہ رخ دیکھنے کے بعد ان کی شخصیت کے بارے میں کافی کچھ پتا چل رہا تھا۔ جو ایک دوسری بات معلوم ہو رہی تھی، وہ یہ تھی کہ جلالی صاحب خوب صورتی کو پسند کرتے تھے۔ ان کی دونوں ذاتی معالج نوجوان اور خوب صورت تھیں۔ خاص طور سے مہناز۔ وہ ہمہ وقت ان کے ساتھ نظر آتی تھی۔ جلالی صاحب کی عمر اور صحت تو ایسی ہرگز نہیں تھی کہ وہ ایک مرد کی حیثیت سے خواتین کی خلوت سے روایتی فائدہ اٹھا سکتے۔ تاہم جس طرح خوبصورت پھولوں کی موجودگی طبع میں خوشگواری پیدا کرتی ہے، اسی طرح عین ممکن تھا کہ خوب صورت خواتین کی موجودگی سے جلالی صاحب کے دل و دماغ پر اچھے اثرات پڑتے ہوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ فارم ہاؤس میں موجود بیشتر ملازمائیں جوان اور خوش شکل تھیں یا کم از کم قبول صورت تھیں۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ایک شاندار ہنڈا اکارڈ پورچ میں آ کر رکی۔ اس میں سے اترنے والی ایک جواں سال خاتون تھی۔ عمر چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ شہد رنگ خوب صورت بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک درمیانے قد کاٹھ کا سفید فام بھی اس کے ساتھ تھا۔ خاتون کے ہاتھ میں اسٹیل کا بنا ہوا ایک نہایت نفیس و دیدہ زیب پنجرہ تھا۔ اس پنجرے میں بالکل چھوٹے سائز کی دو رنگین چڑیاں تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خاتون اور اس کا ساتھی چڑیوں کا یہ جوڑا جلالی صاحب کے لئے بطور تحفہ لائے ہیں۔

جلالی صاحب سے ان دونوں مہمانوں کا وقت طے تھا، اس لئے وہ سیدھے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا، جواں سال عورت بڑی عاجزی اور لگاوٹ سے جلالی صاحب سے باتیں کر رہی تھی۔ جلالی صاحب نے نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ان کے سوکھے سڑے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگاتی تھی۔ نایاب چڑیوں والا پنجرہ شیشے کی تپائی پر رکھا تھا۔

میں کچن میں پہنچا۔ میں عمران کو ان مہمانوں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر وہ بڑے انہماک سے ایک دیگچے میں چمچہ چلانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کچن کیبنٹ کے اندر

رکھا ہوا ریڈیو بھی سن رہا تھا۔ میں نے سمجھا شاید وہ ''ایف ایم'' سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھنا چاہا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ''شی'' کی آواز نکالی۔

اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیو نہیں سن رہا۔ یہ کوئی نئی طرز کا ڈکٹافون تھا۔ ڈکٹافون کا ریسیور بڑی صفائی سے ایک ڈیکوریشن پیس میں چھپایا گیا تھا۔ یہ ڈیکوریشن پیس کچن کیبنٹ کے اندر پڑا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا تو ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو کی آوازیں وضاحت سے مجھ تک پہنچنے لگیں۔

عورت کی دلکش آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''بس جی، وہ خود بھی اپنی غلطی مان رہا ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ آپ کا سامنا کر سکے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو وہ خود بھی آپ کے پاس حاضر ہو جائے گا۔''

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں اس کے آنے کی۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا...... اگر وہ آئے گا تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ اور ایک بات تم دونوں بھی اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ پیار محبت جتا کر اور نرم رویہ دکھا کر مجھے کسی غلط کام پر آمادہ کر لو گے تو یہ خیال بھی دل سے نکال دو۔ وہ باکس تمہارا نہیں اور نہ میرا ہے۔ ہم میں سے کسی کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ میرے پاس بھی وہ بس امانت کے طور پر ہے۔ اس کا اصل مالک مل جائے گا تو میں اسے ایک منٹ بھی اپنے پاس رکھنا بہت بڑا گناہ سمجھوں گا۔''

''پلیز سر......پلیز، اب اس کا ذکر مت چھیڑیں۔ وہ چیپٹر کلوز ہو گیا ہے۔ میں تو آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر یہاں آئی ہوں۔ یقین کریں آپ کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی شاندار لائبریری میں بہت سا وقت گزارا ہے۔''

''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے لائبریری سے کتابیں چوری کرنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔'' جلالی صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

جواں سال عورت نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھی نوجوان کا قہقہہ بھی اس میں شامل تھا۔

نوجوان نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''انکل! خدا کرے باکس کا مالک مل جائے۔ آپ اس کے لئے پورا پورا انتظار کریں۔ دو مہینے، چار مہینے، چھ مہینے لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر وہ چیز آپ کے لئے تو بالکل بیکار ہوگی لیکن ہمارے لئے کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود آپ اس بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے، وہ ہمیں دل و جان سے قبول ہوگا۔ اور

اگر......''

''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' جلالی نے نوجوان کی بات کاٹتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

''مائیکل جناب۔''

''مائیکل صاحب! کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے کہ میں اُلو کا پٹھا ہوں......؟''

''جج......جی......میں سمجھا نہیں۔''

''میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔ کھڑے ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں کھڑے ہو جاؤ۔''

جواں سال عورت نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز جلالی کی پُر جلال آواز میں دب گئی۔ وہ چلائے۔ ''تم بھی کھڑی ہو جاؤ۔ نیچے رکھو یہ چائے کا کپ...... نیچے رکھو۔''

جلالی کی تلون مزاجی ایک بار پھر کام دکھا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی صورتِ حال ڈرامائی ہو گئی تھی۔ جلالی کی کڑکتی آواز سنائی دی۔ ''تم لوگ کیا سمجھتے ہو؟ جو کام مجھ پر سختی کرنے سے نہیں ہو سکا، وہ مجھے بہلا پھسلا کر اور بے وقوف بنا کر کروا لو گے......؟ تمہارے جیسے لونڈے لونڈیوں کو اپنے ازار بند سے باندھ کر رکھتا ہوں میں...... میں نے تم سے کہا تھا کہ اس بارے میں کوئی بات نہیں ہو گی۔ اب پھر وہی بکواس کر رہے ہو تم؟''

جلالی صاحب کی آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ جواں سال خاتون گھبرا کر بولی۔

''جلالی صاحب! مائیکل کا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ تو......''

''بند کرو بکواس۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے......فوراً نکلو'' غالباً جلالی صاحب نے جواں سال خاتون کو دھکا دیا تھا۔

نوجوان بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مسٹر جلالی! ہم تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے لیکن تم خود مشکل کو دعوت دے رہے ہو۔ اس طرح سے نہیں چلے گا......''

''آ گئے ہو نا اپنی اصلیت پر۔ تم گینگسٹر ہو، حرامزادے ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا، جان سے مار دوں گا۔''

''اپنے بڑھاپے پر رحم کھا جلالی۔ مرنا مشکل ہو جائے گا تیرا......''

''تو کر دو مشکل۔ الٹا لٹکا دو اپنے اس باپ کو...... لیکن اس باپ نے تمہیں کچھ بتا کر نہیں دینا۔ آخری دم تک نہیں۔'' جلالی صاحب اتنے زور سے بولے تھے کہ انہیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ صورتِ حال دھاکا خیز ہوتی جا رہی تھی۔

عمران نے ڈکٹا فون کا ریسیور آف کر کے کچن کیبنٹ کا پٹ بند کیا اور مجھے لے کر

ڈرائنگ روم کی طرف آیا۔ تب تک جلالی صاحب جواں سال عورت اور اس کے سخت گیر ساتھی کو دھکے مار کر ڈرائنگ روم سے باہر نکال چکے تھے۔ ہمارے سامنے ہی رنگین چڑیوں والا قیمتی پنجرہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر گرا اور پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔ جلالی صاحب گرجے......''آئی سے گیٹ آؤٹ......جسٹ ناؤ......یو باسٹرڈ......یو راسکل۔''

پھر ہم نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا۔ جلالی صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور جھکتے جھکتے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا رنگ زردی مائل ہو رہا تھا۔ ''ڈاکٹر مہناز!'' کسی نے زور سے پکار کر کہا۔

اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ ڈاکٹر مہناز بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ اس نے جلدی سے جلالی صاحب کو صوفے پر لٹا لیا۔ ان کی زبان کے نیچے ایک اسپرے کیا۔ پھر ایک انجکشن بھرنے لگی۔ جلالی صاحب نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر مہناز نے جلدی جلدی ان کی وین میں دوا انجیکٹ کی۔

میں نے دیکھا، جواں سال عورت کا چہرہ پریشانی اور گھبراہٹ کی آماجگاہ تھا۔ وہ اپنے ساتھی سفید فام نوجوان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے غصہ تھا کہ اس کی تلخ کلامی کی وجہ سے جلالی کا پارا چڑھا تھا اور اب وہ سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے۔ جواں سال عورت نے آگے بڑھ کر جلالی کی حالت کا اندازہ لگانا چاہا۔ ڈاکٹر مہناز طیش سے بولی۔ ''پلیز! آپ لوگ باہر چلے جائیں...... آپ ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو پتا بھی ہے سب کچھ۔''

جواں سال عورت باہر آ گئی اور بے قراری سے ہاتھ ملنے لگی۔ مہناز کی ہدایت پر ڈاکٹر لائبہ موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ غالباً اپنے کسی سینئر سے ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹر مہناز ہی کی ہدایت پر سیکرٹری ندیم بھاگا بھاگا ہوا گیا اور آکسیجن کا سلنڈر اور ماسک وغیرہ لے آیا...... جلالی صاحب کو فوراً آکسیجن چڑھا دی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں نے جلالی صاحب کو Hospitalize کرنے کا بیشتر انتظام گھر پر کر رکھا تھا۔

اس ساری افراتفری کے دوران میں ہی جواں سال عورت اور اس کا ساتھی، فارم ہاؤس سے کھسک گئے۔ میں نے ان کی نئی ہنڈا اکارڈ کو بیرونی گیٹ کی طرف جاتے دیکھا...... جلالی صاحب مسلسل آنکھیں بند کئے لیٹے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑبڑا بھی

رہے تھے۔ ان کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ ڈاکٹر مہناز انہیں طبی امداد دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون رہنے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔ لیکن ''جلالی'' تو ماننے والے شخص کا نام ہی نہیں تھا۔ آخر ڈاکٹر مہناز نے انہیں ایک اور انجکشن دے دیا۔ غالباً یہ انہیں پُرسکون کرنے کے لئے تھا۔

میں اور عمران کچن میں واپس آ گئے۔ ''یہ کیا گورکھ دھندا ہے یار! یہ کس باکس کی بات ہو رہی ہے یہاں؟''

''یہی معلوم کرنے کے لئے تو ہم یہاں ہیں۔''

''پھر بھی کچھ نہ کچھ تو اندازہ لگایا ہو گا تم نے...... آخر جیمز بانڈ کے ہم زاد ہو تم۔ یہاں تم نے ڈرائنگ روم میں باقاعدہ ڈکٹا فون چسپاں کیا ہوا ہے۔''

خلافِ توقع عمران سنجیدہ رہا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چیز کا باکس ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، خاصا قیمتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں رقم وغیرہ ہو یا کوئی قیمتی دھات، یا پھر نوادر قسم کی چیز۔ یہ باکس اتفاقاً ہی جلالی کے ہاتھ لگا ہے اور انہوں نے اسے کسی کی امانت کے طور پر سنبھال لیا ہے۔ جلالی صاحب سنکی شخص ہیں۔ ایسے لوگوں کے ذہن میں ایک بار جو بات بیٹھ جائے، وہ آسانی سے نکلتی نہیں۔ وہ اب اس باکس کو ایک امانت کا درجہ دے چکے ہیں اور اس سے پیچھے ہٹنے کو ہرگز تیار نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شروع میں انہوں نے اس باکس کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی ہو لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اس کو کہیں چھپا دیا۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ خاصی محفوظ جگہ ہے اور اس کا پتا جلالی صاحب کے سوا کسی کو نہیں۔ اب جلالی صاحب سے اس باکس کو برآمد کروانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مشہور جاپانی فلاسفر میر تقی میر نے اپنی ''انگریزی کتاب'' محمد خان جونیجو والے باب میں لکھا ہے۔ کبھی کبھی انسان کی کمزوری ہی اس کی طاقت بن جاتی ہے...... یہاں حضرت جلالی صاحب کی ناتوانی ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار بنی ہوئی ہے۔ درحقیقت جلالی صاحب پاکستان میں دوسرے نمبر کے اڑیل اور ضدی شخص ہیں۔''

''اور پہلے نمبر پر کون ہے؟''

''میں بتاؤں گا تو تم مجھ سے مارشل آرٹ شروع کر دو گے۔ یہ موضوع پھر کبھی سہی۔''

وہ شرارت سے بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''چند دن پہلے جلالی صاحب نے اپنی ان صلاحیتوں کو پوری طرح ثابت بھی کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، کم از کم دو خطرناک پارٹیاں ایسی ہیں جو اس باکس کے پیچھے ہیں۔ ان میں سے ایک پارٹی تو وہی ہے جس کے دو ''معزز'' ممبران ابھی تھوڑی دیر پہلے جلالی صاحب سے مل کر گئے ہیں۔ کچھ دن پہلے یہ لوگ جلالی صاحب کو اپنا انتہائی خطرناک روپ بھی دکھا چکے ہیں۔ انہوں نے جلالی صاحب کے گھر میں ہی ان پر سختی کی بلکہ باقاعدہ تشدد کیا۔ جلالی صاحب کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اپنی زندگی موت کی طرف سے بھی وہ تقریباً تقریباً بے پروا ہو چکے ہیں۔ وہ اس بدمعاشی کے خلاف ڈٹ گئے۔ تشدد کے دوران میں جب ان کی حالت خراب ہوئی تو تشدد کرنے والے خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے بجا طور پر سوچا کہ اگر بابا جی کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تو وہ باکس ہمیشہ کے لئے ''گمشدہ'' ہوسکتا ہے۔ وہ لوگ اس کوٹھی اور فارم ہاؤس کا چپا چپا چھان چکے ہیں۔ بابا جی سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو بھی نچوڑ چکے ہیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔''

''اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اب باکس میں ہے کیا بلا؟ اور شاید اس سے بھی اہم یہ کہ وہ بابا جی یعنی جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟''

عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر مہناز اس سلسلے میں ہماری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتی ہے مگر وہ بھی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت پہلے ہی یہ فارم ہاؤس چھوڑ چکی ہوتی۔ یہ جلالی صاحب سے اس کا لگاؤ ہے جس نے اب تک اسے یہاں روکا ہوا ہے۔''

''لگاؤ سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' کیا وہ انہیں ایک بزرگ کی حیثیت دیتی ہے؟''

''نہیں یار خود کو بزرگ کہنے والے کا تو جلالی صاحب منہ توڑ دیتے ہیں۔ یہ وہی ''لگاؤ'' ہے جو میر تقی میر کے شعروں میں ہوتا ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''فضول بول بول کر تمہارا دماغ چکرا گیا ہے۔ ابھی تم فرما رہے تھے کہ میر تقی میر ایک مشہور جاپانی فلاسفر کا نام ہے۔''

''میر تقی میر کے ننھیالی جاپان میں تھے اور ہر شاعر پارٹ ٹائم فلسفی بھی ہوتا ہے۔ تم بال کی کھال مت اتارا کرو۔ بس یہ بتاؤ کہ تم کسی طرح ڈاکٹر مہناز سے کچھ سن گن لے سکتے ہو یا نہیں؟''

''سن گن لینے والے کام تم مجھ سے بہتر کر لیتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہاں گڑبڑ ہے۔ پرسوں باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحبہ سے ذرا نوک جھوک ہو

گئی تھی۔ وہ میری طرف سے ذرا بدگمان سی ہیں، تم کوشش کرو تو شاید بات بن جائے۔"

"کیا کیا تھا تم۔نے؟"

"بس وہی یار! زبان میں کھجلی سی ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا بول دیا۔ ان کو برا لگ گیا۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"یہ کھجلی کسی دن تمہیں بے طرح پٹوائے گی۔ ہر لڑکی کو شاہین سمجھنا چھوڑ دو۔"

"اچھا چچا جان! لیکن اب کیا کرو گے؟ مہناز سے بات کرنے کے لئے کوئی طریقہ ڈھونڈو۔"

...... مجھے مہناز سے بات کرنے کا موقع اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ مل گیا۔ ٹھیک سات بجے ناشتا کرنے کے بعد جلالی صاحب اپنی چہیتی شیورلیٹ گاڑی میں لاہور چلے گئے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ عمران (باورچی) بھی ان کے ساتھ تھا۔ جلالی صاحب بہترین سبزی کے علاوہ بہترین دیسی مرغی کے گوشت کے بھی شوقین تھے۔ ان چیزوں کے انتخاب کے لئے وہ اپنی بیماری کے باوجود لاہور کی ٹولینٹن مارکیٹ تک جاتے تھے اور باورچی بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ میں اکیلا تھا۔ ذہن ثروت کی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ نصرت کے بیماری کے حالات بھی پریشان کر رہے تھے۔ وہ ثروت کے ساتھ چچا احمد کے پاس آسٹریا پہنچ رہی تھی مگر علاج شروع ہونے تک ابھی کئی مرحلے باقی تھے۔ اتنے میں ملازم وحید نے آ کر بتایا کہ مہمان آئے ہیں۔ دو کپ چائے کی ضرورت ہے۔

شکر کا مقام تھا کہ انہیں "ٹی بیگ" والی چائے کی ضرورت تھی ورنہ میں کوئی ایسی خاص چائے بنانے کے قابل نہیں تھا۔ "کون آیا ہے؟" میں نے رسمی انداز میں وحید سے پوچھا۔

"ڈاکٹر مہناز کی والدہ ہیں۔"

کچھ دیر بعد وحید چائے لے کر چلا گیا تو میری رگِ تجسس پھڑکی۔ ڈاکٹر مہناز اور اس کی والدہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں تھیں اور یہی وہ جگہ تھی جہاں عمران نے سینٹر ٹیبل کے نیچے ایک نہایت حساس مائیکروفون نصب کر رکھا تھا۔ میں نے کچن میں رکھے ڈیکوریشن پیس کے ساتھ تھوڑی سی کوشش کی اور ریسیور کو آن کرنے میں کامیاب رہا۔ ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں چائے کے برتن کھڑکھڑانے کی آوازیں بھی تھیں۔ میں نے ڈیکوریشن پیس کو کچن کیبنٹ کے اندر رکھا اور آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کر لیا۔ ایک بڑی عمر کی عورت کی آواز ابھری۔ "مہناز! سمجھنے کی کوشش کرو یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کسی بھی وقت دوبارہ مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟ میرا اور کون ہے تمہارے

واہ؟"

پتہ بھی ہے امی! میں ان حالات میں جلالی صاحب کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ انہیں میری ضرورت ہے۔"

"لیکن مہناز! یہ ضرورت کوئی اور ڈاکٹر بھی پوری کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر لائبہ یہاں موجود ہے۔ وہ اپنی مدد کے لئے کسی اور سینئر ڈاکٹر یا لیڈی ڈاکٹر کو یہاں بلا سکتی ہے۔"

"مگر امی! جس طرح میں ان کی طبیعت کو سمجھتی ہوں، کوئی اور نہیں سمجھے گا۔ اسے سمجھنے میں کافی وقت لگے گا۔"

بڑی عمر کی عورت کی تپی ہوئی آواز ابھری۔ "کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ ٹھیک ہیں جو کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک "انوالو" ہو چکی ہو...... کچھ رحم کرو ہم پر مہناز...... کیوں ہمارا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ ہر جگہ تمہیں اپنے ساتھ چپکائے رکھتا ہے۔ وہ تمہارے......"

"پلیز امی...... پلیز...... خاموش ہو جائیں۔ میری اور اپنی توہین مت کریں۔ کیا مرد عورت کا بس ایک ہی تعلق ہوتا ہے...... ایک ہی رشتہ ہوتا ہے......؟"

"میں کب کہتی ہوں ایک ہی ہوتا ہے۔ بہت سے ہوتے ہیں لیکن اس رشتے کو کیا نام دو گی؟" مہناز کی والدہ بھی بپھری ہوئی تھی۔

"ضروری نہیں کہ ہر رشتے کو نام ہی دیا جائے...... اس کو کسی خود ساختہ خانے میں ہی "فٹ" کیا جائے۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں، ان کی عزت کرتی ہوں...... اور وہ محبت اور عزت کے قابل ہیں بھی۔ وہ ایک الگ طرح کے انسان ہیں۔ ان میں ایسی خوبیاں ہیں جو عام لوگوں میں نہیں ہوتیں......"

"یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سی عینک لگاتی ہو تم یہ خوبیاں دیکھتے ہوئے۔ ہمیں تو اس کھوسٹ میں رنگ برنگی بیماریوں، اکڑفوں اور غصے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔"

"پلیز امی...... ان کے بارے میں ایسا مت بولیں۔ پلیز۔" پھر ڈاکٹر مہناز شاید رونے لگی تھی۔

اس کی والدہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھ مہناز! اگر تُو نے میری بات نہیں مانی نا...... تو پھر مجھے امی بھی مت کہنا۔ سمجھ لینا...... کہ مر گئی ہے تمہاری امی...... وہ بھی تمہارے باپ کے پاس چلی گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ اب نہیں آؤں گی......" وہ بات

کرتے کرتے مائیکروفون سے دور چلی گئی تھی لہٰذا اس کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ میں نے پلٹ کچن کی ایک کھڑکی کھولی۔ مجھے چھوٹے ڈرائنگ روم میں سے ایک درمیانی عمر کی صحت مند عورت نکلتی نظر آئی۔ اس نے براؤن چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ غصے میں دکھائی دیتی تھی۔ تب ڈاکٹر مہناز دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر عورت کو روکنا چاہا...... لیکن اس نے مہناز کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا اور کچھ کہتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

مہناز ہچکیوں سے روتی ہوئی جلدی سے ڈرائنگ روم کی طرف واپس چلی گئی۔ عورت پورچ میں کھڑی ایک گرے رنگ کی سوئفٹ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ کار میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا، وہ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ عورت بھی مسلسل رو رہی ہے۔

میں کچھ دیر بعد چائے کے برتن لینے کے بہانے چھوٹے ڈرائنگ روم میں گیا تو ڈاکٹر مہناز کی آنکھیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کے بالوں کی دو لٹیں سرخی مائل چہرے پر جھول رہی تھیں۔ ایک سوگوار سی دلکشی نے اس کے نقوش کو ڈھانپا ہوا تھا۔

''کسی چیز کی ضرورت ڈاکٹر صاحبہ؟'' میں نے آنکھیں ملائے بغیر پوچھا۔

''تابش! ایک گلاس پانی لے آؤ...... مجھے گولی کھانی ہے۔''

''لیکن...... آپ نے تو ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ خالی پیٹ گولی؟''

''اوہ۔'' ڈاکٹر مہناز نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اچھی ڈاکٹر ہوں۔''

''کچھ لے آؤں؟''

''چلو، ڈبل روٹی کے دو پیس سینک لاؤ اور پانی۔''

میں دو تین منٹ میں پیس سینک کر لے آیا۔ میں نے پلیٹ میز پر رکھی تو وہ غور سے میرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاہٹ کے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک سوال پوچھوں؟''

''ہاں کہو؟''

''مجھے یہاں آئے ہوئے بس دو چار دن ہی ہوئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کچھ گڑبڑ ہے۔ سارے ملازم کچھ ڈرے ڈرے سے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ بات بھی نہیں کرتے؟''

''بس اس جگہ کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ یہاں بڑا سکون تھا، ہر چیز ایک روٹین کے

مطابق تھی۔ پھول، پرندے، خوب صورت جانور، موسیقی، مزیدار کھانے سب کچھ تھا یہاں...... لیکن اب سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ کسی اَن دیکھے سے خوف نے ہر چیز کو جکڑ لیا ہے۔''

''خوف کی کوئی وجہ تو ہوتی ہے ڈاکٹر صاحبہ؟''

''کوئی ایک وجہ تو نہیں ہے۔'' ڈاکٹر مہناز نے گول مول سا جواب دیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ابھی آپ نے کہا ہے کہ یہاں بہت سی اچھی چیزیں تھیں۔ پرندے، پھول اور مزیدار کھانے وغیرہ۔ آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہمارے پکائے ہوئے کھانے مزیدار نہیں ہوتے۔''

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''سچ پوچھو تو یہی مطلب ہے۔ پہلے دونوں باورچی بہت اچھے تھے۔''

''لیکن وہ چھوڑ کیوں گئے؟''

''اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔'' مہناز کا جواب پھر گول مول تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا ڈرائیور بھی نیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مالی بھی موجود نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ یہاں کے حالات کی وجہ سے ملازمتیں چھوڑ گئے ہوں؟''

یکا یک ڈاکٹر مہناز کو احساس ہوا کہ وہ میرے ساتھ ایک غلط موضوع چھیڑ بیٹھی ہے۔ میں ملازم کی حیثیت سے یہاں نیا نیا آیا تھا۔ وہ بولی۔ ''تم لوگوں نے جلالی صاحب کو بتایا ہے کہ تم اس سے پہلے انڈیا میں کام کرتے رہے ہو لیکن مجھے تم دونوں کے ہاتھوں میں کوئی خاص انڈین ذائقہ نظر نہیں آیا۔ اور سچ پوچھو تو......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی؟'' میں نے کہا۔

''سچ پوچھو تو مجھے تمہارا یہ استاد باورچی لگتا ہی نہیں۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔''

میں اندر سے چونک گیا مگر تاثرات کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا کھانوں کے ذائقے میں کمی کی وجہ سے آپ کو ایسا لگ رہا ہے؟''

''یہ بات بھی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ باورچی اور خانسامے اس طرح کے نہیں ہوتے۔ یہ گہرا شخص لگتا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ کام کرتے شاید زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔''

"نہیں جی...... چھ سات سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"تم نے کچھ محسوس نہیں کیا؟"

"نہیں جی۔" میں نے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے کہا۔ "ویسے...... میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں بھی استاد عمران ہی کی طرح لگتا ہوں؟"

اس نے اپنی دھلی دھلائی آنکھوں سے مجھے سرتاپا دیکھا اور بولی۔ "سچ بات یہ ہے کہ باورچی تو تم بھی نہیں لگتے۔ یا پھر یہ ہے کہ ماڈرن لوگوں کے ساتھ کام کر کر کے تم ذرا ماڈرن ہو چکے ہو۔ مجھے تمہارے ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ ان کی کھال بہت سخت ہے۔ جیسے مشقت......"

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے دروازے کی نچلی درز میں سائے کی حرکت سی نظر آئی۔ یوں لگا کہ کوئی دروازے کے بالکل پاس موجود ہے۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈاکٹر مہناز کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستگی سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے کھول دیا۔ ایک تنومند شخص شاید "کی ہول" سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہکا بکا رہ گیا۔ غالباً اس نے دروازے سے ٹیک بھی لگا رکھی تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور لڑکھڑا کر ایک قدم اندر آیا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھا۔ میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا مگر اس نے مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے قمیص کے نیچے سے سیاہ پسٹل نکالا اور پھنکارا۔ "خبردار! گولی مار دوں گا۔"

اس کے گول چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوکھلاہٹ میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر مہناز کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔ میں بھی جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اس شخص نے ڈرائنگ روم کے دروازے کو اندر سے لاک کیا لیکن وہ ایک چیز بھول گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر مہناز کے کافی پاس آ گیا۔ ڈاکٹر خوف کے پہلے شدید حملے سے سنبھل چکی تھی۔ اس نے دلیری دکھائی اور تیزی کے ساتھ ماربل کے گل دان سے تنومند شخص کے ہاتھ پر چھوٹ لگائی۔ گل دان ٹوٹ گیا اور پسٹل بھی حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اتنی مہلت میرے لئے کافی تھی۔ میں نے حملہ آور کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ وہ صوفے پر گرا اور اسے الٹاتا ہوا قالین پر لڑھک گیا۔ میں اس پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی بریک لگانے پڑے۔ اس شخص کے ہاتھ میں قریباً ایک فٹ لمبے پھل والا خوفناک چھرا دکھائی دیا۔ وہ برق کی طرح مجھ پر آیا۔ اس نے پہلا وار گردن پر کیا۔ میں نے سرعت سے پیچھے ہٹ کر یہ جان لیوا وار

بچایا۔ دوسرا وار پیٹ پر تھا۔ میں یہ وار بچانے میں بھی کامیاب رہا۔ میری کڑی مشقیں کام آ رہی تھیں، ورنہ میں ایسے بے رحم "لڑاکوں" کے مقابلے کی سکت کہاں رکھتا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر مہناز دروازہ کھولنے کے لئے لپکی مگر قالین کے کنارے سے الجھ کر الٹے پڑے صوفے پر گری۔ حملہ آور کے قاتل چھرے کا تیسرا وار بچانے کے بعد مجھے جوابی حملے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس کی ناف میں ٹانگ رسید کی۔ وہ ڈکرایا اور تکلیف کی شدت سے جھکا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑا۔ اسے نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور دیوار سے دے مارا۔ یہ بڑا شدید تصادم تھا بلکہ میری توقع سے بھی شدید تھا۔ تنومند حملہ آور کا سر یقیناً پھٹ گیا تھا۔ وہ اوندھے منہ قالین پر گرا۔ چھرا اس کے ہاتھ سے نکل کر میز کے نیچے چلا گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر زوردار ٹھوکر رسید کرنے کے لئے پاؤں کو پیچھے کی طرف حرکت دی لیکن یہ حرکت وہیں رک گئی۔ حملہ آور کی آنکھیں بند تھیں۔ مجھے لگا وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔

اسی دوران میں دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر لائبہ کی آواز آئی۔ "ڈاکٹر مہناز! کیا ہے؟ کون ہے اندر؟"

میرے اشارے پر ڈاکٹر مہناز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر لائبہ اندر آئی تو میں نے دروازہ جلدی سے دوبارہ لاک کر دیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر نوجوان ڈاکٹر لائبہ کا رنگ بھی سفید پڑ گیا۔ صوفے پر گرنے سے ڈاکٹر مہناز کے بازو پر چوٹ آئی تھی اور اس کی پھول دار قمیص کا گریبان الٹے ہوئے صوفے کے پائے سے الجھ کر پھٹ گیا تھا۔ اس کا چمکیلا جسم خطرناک حد تک نظر آ رہا تھا۔ اس نے اوڑھنی سے اپنے جسم کو ڈھانپا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور حملہ آور کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی ناک اور دائیں کان سے خون رسنے لگا تھا۔ یہ تشویش ناک علامت تھی۔

اس کے جسم نے ایک خفیف سی جھرجھری لی اور ساکت ہو گیا۔ مجھے لگا وہ مر گیا ہے۔ صرف تین چار سیکنڈ بعد ڈاکٹر مہناز نے بھی دہشت زدہ انداز میں تصدیق کر دی۔ حملہ آور کی ایک کنپٹی پر نہایت سنگین چوٹ آئی تھی۔ "اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا؟" ڈاکٹر مہناز لرزاں آواز میں بولی۔ لائبہ بھی تھرتھر کانپ رہی تھی۔

"کون تھا یہ؟" میں نے ان دونوں سے پوچھا۔

"فارم کی ٹریکٹر ٹرالیاں چلانے والوں میں سے ہے۔ آٹھ دس دن پہلے ہی ملازم ہوا تھا۔" ڈاکٹر مہناز نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"اب کیا ہو گا؟" ڈاکٹر لائبہ روہانسی ہو کر بولی۔

’’کچھ نہیں ہوگا۔ اس شخص نے ہماری جان لینے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ یہ ملازم کے بھیس میں کوئی خطرناک مخبر تھا۔ یکن...... لیکن ابھی ہم نے اس خبر کو عام نہیں ہونے دینا۔‘‘ میں نے اعتماد سے کہا۔

ڈاکٹر مہناز ٹھٹکی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اب اس کے لئے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا کہ میں صرف ایک باورچی ہوں۔

میں نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اتفاقاً اردگرد کوئی اور ملازم موجود نہیں تھا۔ نہ ہی ڈاکٹر لائبہ کے علاوہ یہاں کسی کو ڈرائنگ روم میں ہونے والی دھینگا مشتی کی خبر ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کا صوفہ الٹا ضرور تھا مگر اس کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صوفے کو سیدھا کر کے رکھا۔ باقی بے ترتیبی کو بھی درست کیا۔ پھر ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہوا کر کہا۔ ’’آپ اپنی اوڑھنی کو درست کر کے اپنے کمرے میں جائیں اور یہ قمیص بدل لیں۔ کسی کو ابھی کچھ نہیں بتانا۔ ہمارا مؤقف ہے کہ یہ بندہ ڈرائنگ روم کے سامنے والی سیڑھیوں سے گر کر مرا ہے۔ وہاں اوپر کسی نے پانی پھینکا ہوا تھا۔ یہ تیزی سے آیا اور لڑھک گیا...... آپ دونوں میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟‘‘

ڈاکٹر مہناز اور لائبہ جیسے ہپناٹائز ہو چکی تھیں۔ دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلا دی۔ میں نے حملہ آور کا پسٹل اور چھرا دونوں کپڑے میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لئے۔ میں نے ڈاکٹر مہناز سے ایک بار پھر کہا کہ وہ حملہ آور کو چیک کرے۔ قریباً ایک منٹ بعد ڈاکٹر مہناز اور لائبہ دونوں نے تصدیق کی کہ وہ ’’ایکسپائر‘‘ ہو چکا ہے۔

’’ٹھیک ہے، آپ دونوں جائیں۔ میں اس کی باڈی کو سیڑھیوں کے پاس رکھ دیتا ہوں۔ ایک بار پھر گزارش ہے کہ آپ ابھی اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ نہ جھوٹ بولیں، نہ سچ بولیں......‘‘

ڈاکٹر مہناز بدستور مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ ’’کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ دونوں کون ہیں؟‘‘

’’میں وعدہ کرتا ہوں، میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو اور جلالی صاحب کو ہم سے فائدہ ہی پہنچے گا، نقصان نہیں......‘‘

’’کہیں تم...... خفیہ پولیس سے تو......‘‘ ڈاکٹر لائبہ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’میں نے کہا ہے نا۔ موقع ملتے ہی میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال صرف یہ گزارش ہے کہ مجھے دوست سمجھیں اور چند گھنٹے کے لئے مکمل خاموشی اختیار کریں۔‘‘

دونوں ڈاکٹرز حواس باختہ تھیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر لائبہ۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں تو میں نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ متوفی کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے موبائل فون کے علاوہ ڈھائی تین ہزار کی نقدی، ٹریکٹر کی چابیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں برآمد ہوئیں۔ میں نے صرف موبائل فون نکالا۔ باقی ساری چیزیں دوبارہ اس کی جیبوں میں رکھ دیں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر میں نے دھیان سے دائیں بائیں دیکھا۔ موقع اچھا تھا۔ میں نے لاش کو گھسیٹا اور سیڑھیوں کے آخری زینے کے سامنے ڈال دیا...... اس کے بعد میں نے کچن تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

قریباً پانچ چھ منٹ مکمل خاموشی سے گزرے۔ بس فارم ہاؤس کے چڑیا گھر کی طرف سے بندروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں یا طوطے ٹیں ٹیں کرتے رہے...... کوٹھی کے اندر کسی کمرے میں دھیمی آواز سے ’’ٹی وی‘‘ بول رہا تھا۔ اچانک ایک ملازمہ سیڑھیوں کے قریب زور سے چلائی۔ اس کی آواز پوری کوٹھی میں گونجی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کہرام سا مچ گیا۔

O......❖......O

فارم ہاؤس میں اگلے آٹھ دس گھنٹے ہنگامہ خیز تھے۔ ڈاکٹر مہناز میری توقعات پر سو فیصد پوری اتری تھی۔ اس نے اور اس کے کہنے پر ڈاکٹر لائبہ نے بھی اپنی زبان بالکل بند رکھی تھی۔ اس ''حادثے'' نے وقتی طور پر جلالی صاحب کو بھی خاصا پریشان کیا۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ ہلاک ہونے والے اس مختار نامی شخص کے سر کے علاوہ کہیں کوئی اور زخم نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اس کے کپڑے پھٹے تھے، نہ ہی کسی طرح کی زمینی شہادت تھی۔ فارم ہاؤس میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ شخص ایک خطرناک قاتل ہے اور اپنے ایک خطرناک کرتوت کی وجہ سے موت کے گھاٹ اترا ہے۔ اس کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی ڈرائیور ہے۔ محنتی ہے اور ایک قریبی مزار پر حاضری بھی دیتا ہے۔ کسی کو اس کے مہلک پسٹل کا پتا تھا اور نہ ایک فٹ لمبے چھرے کا۔ اس کا پورا نام مختار ملک تھا۔

عمران کی واپسی کے آدھ گھنٹے بعد ہی میں نے اسے اس واقعے کی پوری تفصیل بتا دی تھی۔ عمران کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ فارم ہاؤس میں حملہ آور کا کوئی اور ساتھی بھی موجود ہو سکتا ہے۔

''ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''گھبراؤ مت۔ اللہ بخشے ''مختار ملک'' کا بھرا ہوا پسٹل میرے پاس ہے...... اور اب مجھے ٹریگر دبانا بھی بڑی اچھی طرح آ گیا ہے۔ کہو تو تمہارے پاؤں کی طرف دبا کر دکھاؤں؟''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''بڑے پرزے نکل رہے ہیں تمہارے؟''

''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''ایک تو جارج گورا نے تمہارے ہاتھوں مار کھا کر میرا مستقبل تاریک کر دیا ہے۔'' اس

نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ہمارا اندازہ تھا کہ مختار کا تعلق لاہور سے تھا اور یہ بھی قیافہ تھا کہ چار پانچ بجے تک اس کے ورثا لاش وصول کرنے کے لئے پہنچ جائیں گے مگر شام کے بعد تک بھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمیں جلالی صاحب کے سیکرٹری ندیم کے ذریعے پتا چلا کہ مختار کو جس شخص کی ضمانت اور سفارش پر نوکری دی گئی تھی، وہ کوئٹہ میں ہے...... اور فوری طور پر یہاں نہیں آ سکتا۔ مختار کی بیوی اور بھائی سے رابطہ ہو گیا ہے۔ ان کی خواہش پر میت کو بذریعہ گاڑی لاہور پہنچایا جا رہا ہے۔ ان اطلاعات سے بظاہر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید پوسٹ مارٹم وغیرہ کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے۔ فارم ہاؤس میں بھی اس واقعے کو حادثاتی ہی سمجھا جا رہا تھا۔ اگر کسی کو کوئی شبہ تھا بھی تو اس نے زبانی اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں، میں نے ایک چیز نوٹ کی۔ کچھ ملازم اس واقعے کو پُراسرار رنگ بھی دے رہے تھے۔ دیہی علاقوں میں ایسے توہمات عام پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایک ملازم کو یہ کہتے سنا کہ ان سیڑھیوں پر پہلے بھی ایک حادثہ رُونما ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جلالی صاحب کا ایک مہمان تیورا کر نیچے گرا تھا اور سر پر چوٹ لگنے سے اپنی یادداشت مکمل طور پر کھو بیٹھا تھا۔

رات نو بجے کے قریب ایک پرائیویٹ ایمبولینس پر مختار کی لاش لاہور کے لئے روانہ کر دی گئی۔ جلالی صاحب کا سیکرٹری ندیم اور ملازم خاص فتح محمد ایمبولینس کے ساتھ گئے۔

لاش کی روانگی کے بعد کوٹھی میں قدرے سکون ہو گیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے سیل فون سے ریان ولیم سے بھی بات چیت کی اور انہیں فارم ہاؤس کی صورتِ حال سے آگاہ کر کے نئی ہدایات طلب کیں۔

عمران سے مشورہ کر کے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے چائے تیار کی اور چائے دینے کے بہانے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یقیناً جاگ رہی تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ سے ضروری بات کرنی ہے...... اگر آپ چھت پر آ سکیں۔''

اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''

میں چھت پر چلا گیا۔ صاف ستھری وسیع چھت پر خوبصورت اور آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف فوم کا بیڈ پڑا تھا۔ اوس اور ہلکی پھوار سے بچانے کے لئے اس پر ایک چھپر کٹ تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خوش گوار خنکی تھی۔ جھونکوں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو نتھنوں

سے ٹکرا رہی تھی۔ ٹریکٹر چلنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک پھیل رہی تھی۔ چھت پر بھی پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ان کیاریوں کے درمیان چہل قدمی کے لئے ایک طویل روش تھی۔ دودودھیا بلب اس وسیع چھت کو نیم روشن کر رہے تھے۔ میں چہل قدمی کے انداز میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی ایک شال اوڑھے وہاں پہنچ گئی۔ صبح والے سنگین واقعے کے اثرات ابھی تک اس پر عیاں تھے۔

ہم دونوں پاس پاس کھڑے ہو گئے۔ ''یہ سب کیا ہے تابش! آپ دونوں کون ہیں؟'' وہ تقریباً روہانسی آواز میں بولی۔ وہ مجھ سے واضح طور پر مرعوب بھی نظر آتی تھی۔

''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا لیکن آپ کو بھی کچھ بتانا پڑے گا۔ ہمارے درمیان یہ دوطرفہ انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تو یقین کریں کہ ہم سب کے لئے بہت اچھا ہوگا۔ جلالی صاحب بھی اس بحران سے صاف نکل آئیں گے جس نے ان کا جینا مشکل کر رکھا ہے۔''

''لیکن مجھے پتا تو چلے کہ میں دراصل کس سے بات کر رہی ہوں۔ ابھی تک تو سب کچھ اندھیرے میں ہے۔ جس طرح مجھے مختار ڈرائیور کے بارے میں پتا نہیں تھا کہ وہ اصل میں کون ہے، اس طرح آپ دونوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کوئی شخص بھی اپنے اصل چہرے کے ساتھ نہیں ہے۔''

...... اگلے دس پندرہ منٹ میں میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان تفصیل سے بات ہوئی۔ اس گفتگو میں ہمارے درمیان اجنبیت کی کئی دیواریں گر گئیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو یہ باور کرا دیا کہ ہم یہاں صرف جلالی صاحب کی مدد کے لئے آئے ہیں۔ ہمیں اس باکس سے کوئی غرض نہیں جو جلالی صاحب کے پاس ہے اور جس کے پیچھے کچھ خطرناک لوگ دیوانے ہو رہے ہیں۔

مہناز کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں یہاں بھیجنے والا کون ہے؟

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! وقت آنے پر میں اس کا جواب بھی پوری وضاحت سے آپ کو دے دوں گا۔ فی الحال آپ مجھے اس حوالے سے خاموش رہنے کی اجازت دے دیں۔ آپ کی الجھن کم کرنے کے لئے میں آپ کو صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ ہمیں یہاں بھیجنے والے جلالی صاحب کے نہایت مخلص دوست بلکہ پرستار ہیں۔ کسی وجہ سے وہ فی الوقت سامنے آنا نہیں چاہ رہے۔''

پتا نہیں کہ میری باتوں پر ڈاکٹر مہناز نے کتنے فیصد بھروسا کیا۔ تاہم اس کی چھٹی حس

کافی توانا لگتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شاید مردم شناسی کا قدرتی وصف بھی اس کے اندر موجود تھا۔ اس نے میرے کچھ اہم سوالوں کے جواب دیئے جس سے صورتِ حال کی نہایت دھندلی تصویر قدرے وضاحت سے دکھائی دینے لگی۔

میرا سب سے اہم سوال اس باکس کے متعلق ہی تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟''

مہناز نے صاف گوئی کے انداز میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''نہیں تابش صاحب! اس بارے میں جلالی صاحب نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں نے دو بار پوچھا تھا۔ اب تیسری بار پوچھنے کی ہمت نہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتے ہیں۔ غصے میں آنے سے ان کی طبیعت تیزی سے بگڑتی ہے اور پھر سب کچھ مجھے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔''

''آپ کا اپنا اندازہ کیا ہے؟''

''ظاہر ہے کہ وہ کوئی بہت قیمتی چیز ہی ہے۔ نقدی یا پھر جم اسٹون یا قیمتی دھات وغیرہ۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق باکس کا سائز زیادہ بڑا نہیں اور نہ وہ زیادہ وزنی ہے۔ ورنہ اسے چھپانے یا کہیں لے جانے کے لئے جلالی صاحب کو کسی کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ اور اب تک جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں جلالی صاحب نے ندیم اور فتح محمد سمیت کسی کی مدد بھی نہیں لی ہے۔''

''کیا وہ کسی وقت گاڑی میں خود بھی ڈرائیو کر لیتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''انہیں نہیں کرنی چاہئے لیکن وہ موڈی بندے ہیں۔ انہیں کوئی کسی کام سے روک نہیں سکتا۔''

''آپ بھی نہیں؟'' میں نے ذرا معنی خیز انداز میں پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''نہیں، جب ان کی مرضی نہ ہو تو وہ میری بھی نہیں سنتے۔ حالانکہ طبیعت بگڑنے پر مجھے ہی آوازیں دی جاتی ہیں۔''

''اگر وہ کسی وقت خود بھی گاڑی ڈرائیو کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ باکس فارم ہاؤس کے اندر ہی موجود ہو۔''

''بالکل...... یہ ضروری نہیں۔''

''ڈاکٹر مہناز! ایک اہم سوال ہے۔ اگر ممکن ہو تو پلیز، اس کا جواب ضرور دیجئے...... یہ باکس جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟''

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر تھوڑی دیر کے لئے ہچکچاہٹ نظر آئی۔ پھر اس نے اس

ہچکچاہٹ پر قابو پایا اور بولی۔ ”یہاں پاس ہی ایک نہر ہے۔ جلالی صاحب کبھی کبھی چاندنی رات میں نہر کنارے جانا پسند کرتے ہیں۔ اس رات بھی وہ گاڑی پر وہاں گئے۔ ڈرائیور ریاض ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ......“ وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”میں بھی تھی۔ ہم کوئی دو گھنٹے وہاں رہے۔ پھر بادل آگئے اور چاندنی ختم ہوگئی۔ ہم واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک کھلی چھت والی ایک جیپ بڑی تیزی سے آئی۔ وہ کچے راستے پر ہمارے سامنے سے گزری اور آگے نکل گئی۔ ڈرائیور ریاض نے اس میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گرتے دیکھی۔ کوئی آدھ منٹ بعد ایک اور گاڑی کی آواز آئی۔ یہ ایک ٹویوٹا 86 ماڈل تھی۔ وہ بھی اندھا دھند آ رہی تھی اور کچے راستے پر بری طرح اچھل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ ڈرائیور ریاض نے جلالی صاحب کو بتایا کہ آگے جانے والی جیپ میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گری ہے۔ میں تو گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہی۔ ریاض اور جلالی صاحب آگے جنتر کی جھاڑیوں میں گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا، وہ اندھیرے میں واپس آ رہے تھے۔ ریاض کے ہاتھ میں ایک بڑا تھیلا سا تھا جس میں کوئی چوکور شے تھی۔ انہوں نے ڈکی کھولی اور تھیلا وہاں رکھ دیا۔ اس کے فوراً بعد ہم فارم ہاؤس واپس آگئے...... راستے میں جلالی صاحب نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ یہ لکڑی کا ایک باکس ہے جسے لوہے کی پتریاں لگا کر سیل بند کیا گیا ہے......“

میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔ ”جلالی صاحب کا کیا خیال تھا...... یہ باکس جیپ میں سے اتفاقاً گرا یا خود گرایا گیا تھا؟“

”دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بہرحال، یہ بات تو بالکل صاف تھی کہ پچھلی گاڑی جیپ کا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈرائیور ریاض کا اندازہ تھا کہ اگلی گاڑی میں صرف ایک یا دو بندے تھے جبکہ ٹویوٹا کار میں زیادہ افراد تھے۔“

”اس کے بعد جلالی صاحب نے آپ سے باکس کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں نے دو بار اس حوالے سے بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ تیسری بار پوچھنے کی مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہاں، اس بات کا اندازہ مجھے دو چار دن کے بعد ہی ہو گیا تھا کہ وہ کوئی بہت خاص قسم کا باکس ہے۔ جلالی صاحب بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ پھر یہ پریشانی اس وقت مزید بڑھ گئی جب فارم ہاؤس میں کچھ اجنبی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ پہلے دو مقامی بندے آئے، ان کے ساتھ ایک سفید پوش بھی تھا اور میرے خیال میں وہ مقامی پولیس کا کوئی بندہ تھا۔ اگلے روز

ایک بہت بڑی لگژری جیپ میں ایک سیاست داں ٹائپ شخص آیا۔ اس کے ساتھ دو سوٹڈ بوٹڈ بندے تھے اور وہ نوجوان عورت بھی تھی جو کل جلالی صاحب کے لئے رنگین چڑیوں کا تحفہ لائی ہے اور ذلیل ہو کر واپس گئی ہے۔ دو دن بعد پھر دو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان لوگوں نے قریباً تین گھنٹے تک بڑے ڈرائنگ روم میں جلالی صاحب اور ندیم سے بات چیت کی۔ ان میں سادہ کپڑوں والا وہی پولیس افسر بھی شامل تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ جان چکے تھے کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے...... اب وہ انہیں باکس کی واپسی پر آمادہ کر رہے تھے۔ لیکن جلالی صاحب نے انکار کر دیا تھا اور اپنے انکار پر اڑ گئے تھے۔“

”ڈاکٹر! ان لوگوں کو معلوم کیسے ہوا کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے؟“

”میں صرف قیافہ ہی لگا سکتی ہوں...... اور قیافہ یہ ہے کہ جس جگہ باکس گرا، یا گرایا گیا وہ بالکل کچی زمین تھی۔ وہاں کچھ نشانات رہ گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باکس کے ساتھ کوئی اور چھوٹی موٹی چیز بھی وہاں گری ہو جس کی وجہ سے تلاش کرنے والوں کو کوئی سراغ ملا ہو۔ اس جگہ کے قریب ہی شیورلیٹ گاڑی کے پہیوں کے نشان ملے ہوں گے جو فارم ہاؤس تک آئے ہوں گے......“

”آپ بتا رہی تھیں کہ سادہ کپڑوں والے پولیس افسر اور دیگر دو بندوں نے قریباً تین گھنٹے تک جلالی صاحب سے بات چیت کی...... اس کے بعد کیا ہوا؟“

ڈاکٹر مہناز کی شربتی آنکھوں میں دکھ آمیز خوف کے سائے لہرائے۔ وہ بولی۔ ”اس کے بعد یہاں فارم ہاؤس میں سب سے بری رات آئی۔ کچھ مسلح لوگوں نے پورے فارم ہاؤس کو یرغمال بنا لیا۔ پہلے جلالی صاحب سے بدتمیزی کی گئی پھر ان کی عمر اور بیماری کی پروا کئے بغیر ان پر بے رحمی سے تشدد کیا گیا۔ سب مرد عورت ملازمین کو دو کمروں میں بند کر دیا گیا اور ان کے ساتھ بھی بدتمیزی کی انتہا کر دی گئی......“

بات کرتے کرتے اچانک ڈاکٹر مہناز کو خاموش ہونا پڑا۔ میں بھی چونک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ شاید ایک بار پھر کوئی ہمارے آس پاس موجود تھا۔ میں اس قسم کی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھا۔ مختار ملک کا پسٹل ابھی تک میری قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ میں پسٹل کی موجودگی کو کنفرم کرنے کے بعد جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ ڈاکٹر مہناز مسلسل چونکی ہوئی نظروں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے مطمئن نظر آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ”تابش! میرے خیال میں جلالی صاحب ہیں۔ مجھے ڈھونڈتے ہوئے اوپر آ رہے

ہیں۔ آپ اس کونے میں چلے جائیں اور جب جلالی صاحب اوپر آ جائیں تو آپ احتیاط سے سیڑھیاں اتر جائیں۔‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پانچ دس سیکنڈ بعد قدموں کی چاپ واضح ہوگئی۔ کوئی سُست روی سے اوپر آ رہا تھا۔ وہ جلالی صاحب ہی تھے۔ چھت پر نمودار ہوتے ہی انہوں نے آواز دی۔ ’’مہناز...... کہاں ہو مہناز؟‘‘

مہناز تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ اس نے انہیں کندھوں سے تھاما۔ ’’سر! آپ اوپر کیوں آ گئے؟ آپ کو سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہئیں۔‘‘

وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولے۔ ’’تم نے بتانا تو تھا کہ چھت پر ہوا خوری کرنے جا رہی ہوں۔‘‘

’’میں نے سمجھا آپ سو رہے ہیں۔‘‘

’’پریشانی میں اتنی جلدی نیند کہاں آتی ہے۔‘‘ وہ ڈگمگا رہے تھے۔ مہناز انہیں سہارا دیتی ہوئی چھپرکٹ تلے لے آئی۔ وہ فوم کے بیڈ پر لیٹ گئے۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا......

میں زینوں پر آ گیا لیکن نیچے اترنے کے بجائے وہیں کھڑا رہا۔ جلالی صاحب اپنا بایاں بازو دائیں ہاتھ سے دبا رہے تھے۔ ’’درد ہو رہا ہے؟‘‘ مہناز نے پوچھا۔

’’تھوڑا تھوڑا۔‘‘

’’آپ سیدھے لیٹ جائیں۔ آپ کو اس طرح سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہئے تھیں۔‘‘ مہناز نے کہا۔ وہ چست انداز میں بھاگتی ہوئی نیچے گئی اور میڈیکل باکس لے آئی۔ اس نے بی پی آپریٹس سے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ انہیں کھانے کے لئے ایک گولی دی اور بیڈ پر دوزانو بیٹھ کر ان کا بازو دبانے لگی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جلالی صاحب اپنے دوسرے ہاتھ سے مسلسل مہناز کے بالوں اور رُخساروں کو سہلا رہے ہیں۔ یہ ایک میکانکی سی حرکت تھی۔ اس کو کوئی معنی دینے مشکل تھے۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھے، ان سے کسی شدید جذباتی کیفیت کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہیں دوزانو بیٹھے بیٹھے مہناز نے اپنا سر جلالی صاحب کے سینے پر ڈال دیا۔ جلالی صاحب نے اپنا بازو مہناز کے کندھوں پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے۔ اس سے اگلا منظر اس سے بھی تعجب خیز تھا۔ مہناز اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے اپنے بالوں کو سمیٹا اور سیڑھیوں کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر دیا۔ میں نے کوشش کی اور چند سیکنڈ بعد چوبی دروازے کی سائیڈ میں ایک باریک جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ جواں سال ڈاکٹر مہناز، عمر رسیدہ سہراب جلالی کے ساتھ ہی فوم کے بستر پر لیٹ گئی ہے۔ جلالی صاحب نے آہستگی سے کروٹ بدلی اور اپنا رخ مہناز کی طرف کر لیا۔ اس نے کمال مہربانی سے جلالی صاحب کو اپنے جوان بازوؤں کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

میں مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ دو تین منٹ بعد یوں لگا جیسے جلالی صاحب سو گئے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز کی ٹھوڑی ان کے نیم گنجے سر پر ٹکی ہوئی تھی اور ان کا چہرہ مہناز کے جسمانی گداز میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ سکڑے سمٹے کسی بچے کی طرح لگ رہے تھے۔ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ وہ جلالی صاحب ہیں، جن کے غصے سے بے شمار لوگ خوف کھاتے ہیں اور جن کو ان کی مرضی کے خلاف چلانا جُوئے شِیر لانے سے زیادہ مشکل ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بظاہر تو یہ رومانی تعلق تھا لیکن اگر یہ واقعی رومانی یا جنسی تعلق تھا تو پھر یوں سرِعام کیوں تھا؟ اس چھت پر کسی وقت کوئی بھی آ سکتا تھا۔ جس طرح میں نے بند دروازے میں سے جھانکا تھا، کوئی دوسرا بھی جھانک سکتا تھا۔ برساتی میں ایک کھڑکی بھی موجود تھی جس کی چٹخنی کو تھوڑی سی کوشش سے کھولا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر مہناز کی والدہ کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ’’کبھی تو مجھے لگتا ہے، لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک ’انوالو‘ ہو چکی ہو۔ کچھ رحم کرو ہم پر مہناز...... کیوں ہمارا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے......‘‘

وہ جلالی صاحب کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے اسی طرح لیٹی رہی۔ مدھر ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ اس کی زلفوں کو ہوا میں اڑا رہے تھے۔ چھت پر مکمل خاموشی تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے چمکتے تھے اور حیرت سے پلکیں جھپکتے تھے، جیسے وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر ششدر ہوں...... انسان بھی کیا چیز ہے۔ اس کے دل و دماغ کی گہرائی کو ناپنا ناممکن ہے۔

آٹھ دس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر شاید ڈاکٹر مہناز نے محسوس کیا کہ جلالی صاحب سکون سے سو گئے ہیں۔ اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ خود کو جلالی صاحب سے جدا کیا۔ کوئی آواز پیدا کئے بغیر فوم کے بیڈ سے اتری۔ اپنائیت بھری نظروں سے جلالی صاحب کو دیکھتی رہی۔ اپنے بال درست کئے۔ ایک بھاری چادر سے جلالی صاحب کا سکڑا سمٹا جسم کندھوں تک ڈھانپ دیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں تاریک سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

میں نے سارا ماجرا عمران کو سنایا۔ وہ بھی اس ساری صورتِ حال پر حیران نظر آیا...... یہ باکس ایک معما بنتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف جلالی اور ڈاکٹر مہناز کا رشتہ بھی کچھ عجیب نوعیت کا

تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جلالی صاحب کے قیلولے کا ٹائم ٹھیک ایک بج کر پینتالیس منٹ پر شروع ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں کوٹھی کے اندر ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا تھا۔ کسی کو کھانسی یا چھینک بھی آ جاتی تو وہ لرز جاتا۔ ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجھے ڈاکٹر مہناز سے پھر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی۔ کل والے خوفناک واقعے کے اثرات ابھی تک اس کے سرخ و سپید چہرے پر عیاں تھے۔ مختار ملک کا اچانک ہمارے سامنے آنا اور پھر لڑائی کے دوران میں اس کے سر کا پختہ دیوار سے زوردار تصادم، یہ سب کچھ یقیناً مہناز اور لائبہ کے لئے دہلا دینے والا تھا۔ میں کچن سے ایک ''کک بک'' لے آیا تھا...... میں ڈاکٹر مہناز کے صوفے کے پاس ہی ایک کشن پر بیٹھ گیا اور ''کک بک'' اپنے سامنے پھیلا لی۔ ہم دونوں کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ڈاکٹر مہناز میرے ساتھ کسی خاص ڈش کی کوکنگ پر بات چیت کر رہی ہو۔

میں نے اس امر کا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ میں نے کل رات جلالی صاحب اور مہناز کو ایک ہی بستر پر دراز دیکھا ہے۔ میں نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے منقطع ہوئی تھی۔ جس وقت جلالی صاحب کے آنے سے ہماری گفتگو کو بریک لگے تھے، اس وقت مہناز مجھے بتا رہی تھی کہ تین چار ہفتے پہلے اس پُراسرار باکس کی خاطر کچھ سخت گیر لوگوں نے یہاں کوٹھی میں کیا اودھم مچایا تھا۔ انہوں نے نہ صرف عمر رسیدہ جلالی صاحب پر تشدد کیا بلکہ ان کے قریبی ملازموں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔

میں نے پکوانوں کی کتاب پر جھکے جھکے ڈاکٹر مہناز سے کہا۔ ''کیا اس رات ان لوگوں نے آپ سے بھی پوچھ گچھ کی تھی؟''

''آپ پوچھ گچھ کی بات کر رہے ہیں، ان خبیثوں نے باقاعدہ تشدد کیا۔ بال کھینچے، تھپڑ مارے...... مجھے تین گھنٹے سردی میں ننگے پاؤں کھڑا رکھا گیا۔ خوفناک دھمکیاں دیں۔ لائبہ اور دوسری عورتوں کو بھی بُری طرح ہراساں کیا گیا۔ ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا، ہم کیا بتاتے؟ اور جس کو معلوم تھا، وہ بتا کر نہیں دے رہا تھا۔ میرا مطلب جلالی صاحب سے ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ باکس ان کے پاس ہے لیکن اگر ان کے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تو وہ بتائیں گے نہیں۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جلالی صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ ان لوگوں کو لگا کہ جلالی صاحب کی صورت میں باکس کا جو واحد سراغ موجود ہے، وہ ناپید ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے لیکن یہ صرف ایک ہی بار نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

''تین روز بعد یہ لوگ دوبارہ کوٹھی میں گھس آئے۔ اس مرتبہ جلالی صاحب پر تو ہاتھ ہلکا رکھا لیکن ملازمین کی بہت کم بختی آئی۔ ڈرائیور ریاض کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ اس کے بچے کی کنپٹی پر بندوق رکھی گئی۔ مالی خورشید سے بھی برا سلوک کیا گیا۔ اس کی بیوی کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ ملازموں کے ہاتھوں میں کدالیں اور کسیاں تھمائی گئیں اور ان سے کوٹھی اور فارم میں مشتبہ جگہوں پر کھدائی کرائی گئی۔ کوٹھی میں موجود سب لوگوں کے سیل فون ایک جگہ جمع کر لئے گئے تھے اور لینڈ لائن فون کے تار کاٹ دیئے گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اب شاید عارضی طور پر نرم ڈپلومیسی سے کام لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔'' ڈاکٹر مہناز نے کتاب پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ ''پرسوں جو فیشن ایبل عورت ایک یورپین کے ساتھ یہاں آئی تھی، اس کا نام دُرِ شہوار ہے۔ چار ہفتے پہلے بھی یہ اپنے ساتھی مائیکل کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔ تب ان کے ساتھ ان کا باس جاوا اور دیگر دس پندرہ بندے بھی شامل تھے۔''

''جاوا...... یہ کون ہے؟''

''بڑا خطرناک بندہ ہے۔ قتل پہلے کرتا ہے، نام بعد میں پوچھتا ہے۔ سرحد کے آر پار آتا جاتا رہتا ہے۔ ابھی تک کسی کو ٹھیک سے پتا نہیں کہ یہ اصل میں انڈین ہے یا پاکستانی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں جن دو چار لوگوں کے نام کا سکہ چلتا ہے، ان میں ایک یہ جاوا بھی ہے۔ شوبز کے بڑے بڑے گرو گھنٹال اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں اور اپنے مسئلوں کے حل کے لئے اس کی طرف دیکھتے ہیں۔''

''تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ یہاں جو باکس کا چکر چل رہا ہے، اس کا تعلق کسی طور فلم انڈسٹری یا شوبز وغیرہ سے ہے؟''

''ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ جاوا جیسے لوگ پیسے کی خاطر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اس سارے کام میں دو چار سفید فام لوگ بھی ملوث ہیں۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ شاید اس باکس والے معاملے کا تعلق شوبز سے نہ ہو بلکہ...... یہ کوئی اسمگلنگ وغیرہ کا چکر ہو۔''

''یہ جاوا نامی بندہ کتنی بار یہاں آیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے علم کے مطابق تو دو بار آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی آیا ہو لیکن مجھے خبر نہیں۔ جب یہ دوسری بار آیا تھا تو بڑے طیش میں تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ اس کا

جلالی صاحب پر بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ان کے جسم کی بوٹی بوٹی علیحدہ کر دیتا۔ طیش میں آ کر اس نے ڈرائیور ریاض کو بری طرح پٹوایا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مالی خورشید اور اس کے بھائی کی ایک ایک ٹانگ سے رسی باندھ کر انہیں ایک گھنٹے تک الٹا لٹکائے رکھا، یہاں تک کہ خورشید بے ہوش ہو گیا۔ جاوے کے کہنے پر خورشید کی جواں سال بیوی کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ اسے بے عزت کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس موقع پر دُرِشہوار آگے آئی اور اس نے مالی کی بیوی کی جان بچائی۔ اس موقع پر انگریز مائیکل نے بھی اس کا ساتھ دیا بلکہ جاوا سے ہلکا سا جھگڑا بھی کیا۔ اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ سارا بھی ایک ڈراما تھا۔ ان لوگوں نے جاوے کی نسبت نرم رویہ دکھایا اور اس طرح یہاں واپس آنے کے لئے راستہ بنایا۔''

''آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ پرسوں دُرِشہوار اپنے ساتھ جلالی صاحب کے لئے نایاب چڑیوں کا تحفہ بھی لائی تھی۔''

''لیکن جلالی صاحب کی یادداشت اتنی کمزور نہیں اور نہ ہی وہ اتنے سیدھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ خطرہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ لوگ اس باکس تک پہنچنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔''

'کیا اس حوالے سے جلالی صاحب نے پولیس میں رپورٹ وغیرہ بھی کروائی ہے؟''

''انہوں نے نہیں کروائی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ ان کا خیال ہے کہ مقامی پولیس کے دو چار لوگ بھی ان گینگسٹرز کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مقامی تھانے دار معاملہ پوچھنے کے لئے یہاں آیا تو جلالی صاحب نے اس بے نقط سنائیں۔ وہ دُم دبا کر نکل گیا۔ بعد میں یہ بات اوپر تک پہنچی۔ لاہور میں دو تین اعلیٰ پولیس آفیسر ایسے ہیں جو جلالی صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایس ایس پی حمزہ صاحب ہیں۔ حمزہ صاحب چند دن پہلے خود یہاں آئے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ ایف آئی آر درج کروائی اور کوٹھی کی حفاظت کے لئے گارڈز مہیا کئے۔ بہرحال جلالی صاحب اس سلسلے میں بالکل بے پروا ہیں۔ کبھی کبھی وہ بالکل نوجوانوں کی طرح بے خوف اور پُرجوش ہو جاتے ہیں۔ پرسوں بھی وہ شام کی چائے کے بعد اکیلے ہی واک پر نکل گئے اور کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئے۔ میرے منع کرنے سے بھی کوئی اثر نہیں لیتے۔''

''آپ نے کہا ہے کہ دونوں بار جاوا اور اس کے ساتھی یہاں آئے تو ان کے ساتھ کوئی مقامی پولیس والا بھی تھا۔ اس کا پتا چلا؟''

''کہتے ہیں کہ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس افسر ہے۔ مقامی پولیس والوں سے اس کی دوستی وغیرہ ہے۔ ایف آئی آر میں اس کا نام بھی آیا ہے۔''

اس دوران میں، میں نے دیکھا کہ عمران کوریڈور میں سے گزرا۔ اس نے دو ایرانی بلیاں اپنی بغلوں میں دے رکھی تھیں اور ان سے لاڈ کرتا ہوا لان کی طرف جا رہا تھا...... جلالی صاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ نہایت قیمتی و نایاب بلیاں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے رنگ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

''یہ کدھر جا رہے ہیں؟'' میں نے مہناز سے پوچھا۔

''آپ کا یہ ساتھی چھپا رستم ہی لگتا ہے۔ بڑی تیزی سے جلالی صاحب کے قریب آتا جا رہا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے جانوروں سے دلچسپی ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ جلالی صاحب بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔''

''ذرا دیکھیں یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

مہناز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دبے قدموں کوریڈور میں پہنچے اور پھر لان کی طرف چلے آئے۔ عمران اور جلالی صاحب جانوروں والے پورشن کی طرف موجود تھے۔ ایک ملازم نے ایرانی بلیوں والے پنجرے کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ یہاں دو اور بلیاں بھی موجود تھیں۔ جلالی صاحب بڑی بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر پنجرے کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ عمران نے بھی تقلید کی۔ وہ دونوں ایک موٹی تازی بلی کو کوئی دوا کھلانے میں مصروف ہو گئے۔ دوا کو دودھ میں ملایا گیا تھا۔ غالباً یہ وہی تندمزاج حاملہ بلی تھی جسے چند روز میں بچے دینے تھے۔ بلی عمران کی گود میں آ کر مست ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ جلالی صاحب کے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔ بلیوں سے فارغ ہو کر عمران اور جلالی صاحب ایک قریبی پنجرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں زیبرے کا ایک خوبصورت جوڑا تھا۔ مادہ جانور کے پاؤں میں شاید کوئی تکلیف تھی، وہ اپنے پنڈے پر ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔ عمران نے آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ کو سہلایا۔ وہ رام نظر آنے لگی۔ تب عمران اور جلالی صاحب نے اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ جلالی صاحب نے ڈیجیٹل کیمرے سے پاؤں کی دو تین تصویریں کھینچیں اور کوئی میڈیسن لگائی۔ وہ دونوں آپس میں بڑی محویت اور بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے لیکن پھر اچانک صورتِ حال بدلی ہوئی نظر آئی۔ جلالی صاحب کا مخصوص چڑچڑا پن ان کے چہرے پر جھلک دکھانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مشتعل ہو گئے۔ وہ کسی بات پر عمران کو ڈانٹ رہے تھے۔ عمران صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم ذرا آگے گئے تو یہ آوازیں ہمارے

آپ کا رہن سہن، آپ کی دلچسپیاں۔"

"آپ نے یہاں میری کون سی دلچسپی دیکھی ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

میں کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتا تھا کیونکہ میں نے بہت کچھ دیکھا تھا...... کل رات والا واقعہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا جب وہ جلالی صاحب کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ مگر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ شہر میں جاب کرنے کے بجائے اور کوئی کلینک چلانے کے بجائے یہاں اس فارم میں جلالی صاحب جیسے مشکل بندے کے ساتھ وقت گزار رہی ہیں۔"

وہ بولی۔ "بس اتنی سی بات پر آپ نے مختلف کہہ دیا ہے حالانکہ خود آپ میں بھی کئی ایسی باتیں ہیں جن کی بنیاد پر آپ کو نہایت مختلف کہا جا سکتا ہے۔"

"میں ٹھیک سے سمجھا نہیں۔"

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھاما اور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے ایسے سخت بلکہ کرخت ہاتھ پاؤں بہت کم لوگوں کے دیکھے ہیں۔ لگتا ہے آپ نے اپنے جسم کے ان حصوں پر بہت ظلم کیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ سخت فرش پر سوتے ہیں۔ شدید تکلیف کی صورت میں بھی دوا وغیرہ نہیں لیتے۔"

میں نے کہا۔ "بس کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک استاد ملا تھا۔ یہ اسی کے دیئے ہوئے اسباق ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میرا استاد درد خور تھا۔ اس نے مجھے بھی درد خور بنا دیا۔"

"درد خور؟ یہ کیا لفظ ہوا؟"

"درد سہنے والا۔ درد کھانے والا۔ درد سے پیار کرنے والا۔ میں کچھ ایسے حالات سے گزرا ہوں جن میں بندہ مر جاتا ہے یا پھر انوکھا ہو جاتا ہے۔ شاید مجھ میں بھی انوکھا پن آ گیا ہے۔ اپنے دل و دماغ اور خاص طور سے جسم کو اذیت دینا بہت عرصے سے میرا معمول بن چکا ہے۔ اب یہ سب کچھ مجھے بالکل نارمل سا لگتا ہے۔"

"شاید مارشل آرٹ وغیرہ کی بہت کڑی مشقیں کی ہیں آپ نے۔ جسمانی طور پر آپ گرانڈیل نہیں، یعنی نارمل ہی ہیں۔ لیکن پرسوں آپ نے جس طرح اس خونی کو گھمایا تھا، وہ جسمانی طور پر آپ سے کم از کم ڈیڑھ گنا تو تھا۔"

"لیکن اس میں آپ کا کردار بھی تو ہے۔ اگر اس کے ہاتھ سے پسٹل نہ گرتا تو میرے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔"

"مارشل آرٹ میں بیلٹس وغیرہ ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے پاس بھی کوئی بیلٹ ہے؟"

"میرے اندر کے زخم ہی میری بیلٹس ہیں۔ کچھ زخم چھوٹے ہیں لیکن ایک دو بہت بڑے ہیں۔ ان بڑے زخموں کو آپ میری بلیک بیلٹس کہہ سکتی ہیں۔"

"آپ اچھی گفتگو کرتے ہیں اور آپ کی کہانی بھی دلچسپ لگتی ہے۔ اگر زندگی رہی تو تفصیل سے سنیں گے۔"

"زندگی رہی کیا مطلب؟ آپ اتنی پریشان اور مایوس کیوں ہیں؟"

"جو کچھ یہاں کے حالات ہیں، ان میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"آپ حالات کی فکر چھوڑیں۔ اس فکر کے لئے ہم جو ہیں یہاں۔ ان شاء اللہ بال بھی بیکا نہیں ہو گا یہاں کسی کا۔ آپ آرام سے جا کر سوئیں اور یہ یقین رکھیں کہ ہم جاگ رہے ہیں۔"

میرے پُراعتماد لہجے نے اسے متاثر کیا۔ اس نے پُرتشکر نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "آپ دونوں اپنا بہت خیال رکھیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا...... وہ مجھے کچن میں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ بہت متناسب جسم کی مالک تھی۔ پُرکشش بھی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ڈاکٹر تھی کوئی بھی نوجوان اس کے حصول کو اپنی خوش قسمتی سمجھ سکتا تھا۔

عمران کا کمرا تبدیل ہو گیا تھا۔ اب اسے Zoo کی طرف اپارٹمنٹ دے دیا گیا تھا۔ مجھے یہ اکیلا پن اچھا نہیں لگا۔ عمران کے ساتھ رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ میں دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ یہ بہار کی ایک پُرفسوں رات تھی۔ کھڑکیوں سے باہر رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے۔ چاند کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا...... ثروت کی یاد نے دل کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ملی بھی تو لیکن یوں کہ دل کے زخم کچھ اور گہرے کر گئی تھی۔ وقت کا دریا اسے بہا کر مجھ سے بہت دور لے گیا تھا...... اور وہ ایک منجدھار میں بھی تھی۔ یہ ایک سنگین منجدھار تھی لیکن وہ اس کی سنگینی کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا اور بہار میں تو پھولوں کے ساتھ ساتھ زخم بھی کھل اٹھتے ہیں۔ سوختہ جگری مہک جاتی ہے۔ مجھے بھی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے لئے ہمارا دیوانہ پن...... کیلنڈر پر سے تاریخیں کاٹنا اور شادی کے دن کا انتظار کرنا۔ پھر وہ طوفان جس نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔ ایک بظاہر چھوٹا سا واقعہ جو زندگی بھر کا ناسور بن گیا۔ وہ ایک شب جو ثروت کو گھر سے باہر گزارنا پڑی...... اور وہ ایک شب ہماری ساری زندگی پر محیط ہو گئی۔ پھر وقت کا پُرشور ریلا ثروت کو بہا کر جرمنی لے گیا اور مجھے بھانڈیل اسٹیٹ۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے وہ ساڑھے تین

کانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔

جلالی صاحب گرجے۔ ''اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو چھٹی کرلو۔ ابھی کرلو چھٹی......جسٹ گیٹ آؤٹ۔''

عمران نے کہا۔ ''سر! میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے یہاں زیادہ ٹائم دیا تو کچن کا کام سُست پڑ جائے گا اور......''

''کیوں سُست پڑ جائے گا؟ کیوں پڑ جائے گا؟ کیا وہ تمہارا ساتھی، باورچی نہیں ہے؟ وہ اندھا اور اپاہج ہے؟ تم تو اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہو۔ کیا جھوٹ بولتے ہو تم؟''

''نہیں سر! وہ کر تو لے گا لیکن اُسے میری ماتحتی میں کام کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔''

''یہاں عادتیں نہیں چلیں گی۔ وہی کچھ چلے گا جو میں کہتا ہوں۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچن سے زیادہ یہاں "Zoo" میں تمہاری ضرورت ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک نیا ڈاکٹر ہمیں جوائن نہیں کر لیتا۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو پھر تم فارغ ہو اور تمہارا وہ اسسٹنٹ بھی۔'' وہ ایک دم بھنائے ہوئے تھے۔

''سوری سر! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ جیسا کہتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ میں کچن کا کام تابی کے سپرد کر دیتا ہوں۔ وہ گزارہ کرلے گا۔''

جلالی صاحب تیوریاں چڑھائے ہوئے اٹھے اور واپس چلے گئے۔ ان کے جسم سے جیسے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ عمران کھوپڑی سہلا کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد میں اور وہ کچن میں موجود تھے۔ عمران نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہ تو مصیبت کھڑی ہوگئی ہے۔ بابا جی تو آگ کا گولہ ہیں اور تمہیں ننگا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اب تم سے کھانا پکوائیں گے اور تم ایسا کھانا پکاؤ گے کہ ہمارا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹے گا اور بابا جی اچھل اچھل کر چھت کو لگیں گے۔''

''یار! تم ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہے ہو۔ تم مجھے پوری ترکیب کاغذ پر لکھ کر دے دو۔ میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔''

''اوئے باندر! کھانا پکانا پینٹنگ کرنے کی طرح ہوتا ہے۔ اگر میں تمہیں رنگ، برش، ایزل وغیرہ دے دوں اور انہیں استعمال کرنے کی پوری ترکیب بھی بتا دوں تو کیا تم کوئی شاہکار تصویر بنا لو گے؟''

''آلو، بینگن اور مونالیزا میں کافی فرق ہوتا ہے یار۔''

''یہ بڑا شکی بابا ہے۔ تم اس کو نہیں سمجھتے۔ اگر......''

اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر مہناز دلکش مسکراہٹ بکھیرتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس نے اپنے خوبصورت بال جُوڑے کی صورت میں سمیٹے ہوئے تھے اور باقاعدہ ایپرن باندھ رکھا تھا۔ ''ہیلو! گڈ ایوننگ۔'' اس نے کہا۔

''آپ یہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ لوگوں سے کچھ سیکھوں۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں منفرد ذائقہ ہے۔ ایک دم کلاسیکل انڈین ٹچ۔ آج دوپہر ہم کک بک میں جو ڈش دیکھ رہے تھے، وہ بھی انڈین اسٹائل ہی کی تھی نا؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''یعنی آپ میری مدد کرنا چاہ رہی ہیں؟'' میں نے گہری سانس لی۔

''دراصل میں اپنی ہی مدد کر رہی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''اگر ہم دونوں مل کر کھانا نہیں بنائیں گے تو جلالی صاحب کا پارا ساتویں آسمان سے کافی اوپر چلا جائے گا۔ ان کی طبیعت بگڑے گی اور پھر بھگتنا مجھے ہی پڑے گا۔''

''تھینک یو۔'' عمران نے کہا۔

''ویسے آپ دونوں ابھی تک اپنی اصلیت کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے۔'' مہناز کا لہجہ پھر معنی خیز تھا۔

میں نے کہا۔ ''پلیز ڈاکٹر! اس کے لئے تھوڑا سا انتظار کرلیں۔''

مجھ سے کوکنگ سیکھنے کے بہانے ڈاکٹر مہناز نے میرے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا اور یہ خاصا بہتر کھانا تھا۔ ہم نے آلو، بینگن کے ساتھ، دیسی مرغ کی یخنی تیار کی اور فرنی بنائی۔ ڈاکٹر مہناز ایک خوش اخلاق اور معاملہ فہم لڑکی کے طور پر سامنے آئی تھی۔ پرسوں یہاں جو سنگین واقعہ رُونما ہوا، اس میں مہناز کا کردار قابلِ ذکر تھا۔ اس نے مختار ملک کے ہاتھ پر گل دان سے کاری ضرب لگائی اور یوں مجھے اس پر حملہ کرنے کا مواع ملا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہاں صورتِ حال کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر مہناز قدرے مختلف لڑکی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کی منگنی ہوئی تھی۔ دو سال بعد یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ اب ڈاکٹر مہناز تقریباً چھبیس سال کی تھی۔ اسے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ وہ اس حوالے سے کچھ بیزار سی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! ایک بات کہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو؟''

''میں زیادہ تر بُرا نہیں مانتی۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ اپنی ہم عمر ڈاکٹرز کے مقابلے میں کافی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی گفتگو،

برس یاد آئے جن کا ہر ہر پل حوادث آور بے چارگیوں سے عبارت تھا۔ اور وہ لڑکی بھی یاد آئی جو اپنی فطرت میں انوکھی تھی۔ جس نے بھانڈیل اسٹیٹ میں مجھے نئی زندگی دی۔ میرے مصائب کے سامنے ڈھال بنی اور میرے بچے کی ماں بھی۔ اور پھر کیا ہوا؟ پھر ایک دن وہ بھی بچھڑ گئی۔ مجھے بالو کی صورت میں ایک محبت بھری نشانی دے کر اور ایک پیغام دے کر......
اسے تلاش کرنا مہروج...... اس کا کھوج لگانا...... وہ تمہیں ملے گی...... کیونکہ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو اور جب وہ کسی خوبصورت دن کی سنہری دھوپ میں تم سے ملے تو اس سے کہنا...... ہندوستان کے ایک دور دراز راجوڑے میں تمہاری ایک بہن تھی......

الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ سلطانہ اور ثروت کے چہرے میری نگاہوں میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ اچانک میں چونک گیا۔ میری نظر سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر پر پڑی۔ آج تو میری پیدائش کا دن تھا۔ ہاں، یہ سالگرہ تھی میری۔ وقت کی دھول میں کیا کچھ گم ہوا تھا، اتنے اہم دن بھی اب پہچانے نہیں جاتے تھے۔ خاموشی سے آتے اور گزر جاتے تھے۔

میں کتنی ہی دیر نیم تاریک کمرے میں گم صم لیٹا رہا۔ زندگی مجھ سے کتنی دور ہو گئی تھی۔ بہار کے سارے رنگ بجھتے محسوس ہوئے اور ساری خوشبوئیں ماند پڑنے لگیں۔ جب ایسی مایوسی طاری ہوتی تھی تو مجھ پر وہی خود اذیتی کی خواہش غالب آ جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی صحرا ہو یا برفستان جس میں، میں برہنہ بدن بھاگتا چلا جاؤں۔ میرے پاؤں خون اگلنے لگیں، میرے پھیپھڑے چاک ہونے لگیں اور میں بے دم ہو کر گر جاؤں۔

میں لیٹا رہا، بالکل خاموش۔ اتھاہ سوچوں میں ڈوبا رہا۔ اچانک موبائل فون کی وائبریشن ہوئی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور بُری طرح چونک گیا۔ یہ آسٹریا کا نمبر تھا۔ میں نے کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ کو اچھی طرح بند کیا اور کمرے کے ڈریسنگ روم میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نصرت کی آواز آئی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو نصرت! کیسی ہو؟“ میں نے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں بھائی...... اور آپ کو سالگرہ مبارک۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”تھینک یو نصرت کہ تم نے یاد رکھا۔“

”کاش، ہم ایک ساتھ ہوتے۔“

”گھبراؤ مت، ان شاء اللہ وہ وقت بھی جلد آئے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور تمہاری ٹریٹمنٹ کیسی جا رہی ہے؟“

”ابھی تو ٹیسٹ ہی ہوئے جا رہے ہیں بھائی جان...... روزانہ ایک لیٹر خون نکال لیتے

ہیں میرا۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔

نصرت کو اس کی بیماری کے بارے میں سب کچھ بتایا جا چکا تھا اور اس نے یہ سب کچھ جھیل بھی لیا تھا۔ اب وہ کافی حد تک نارمل محسوس ہوتی تھی اور اپنی بیماری سے لڑنے کے لئے پُرعزم بھی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ دل کڑا کر کے مریض کو اس کی تکلیف کے بارے میں بتا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔

نصرت کے بعد میری بات ثروت سے ہوئی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خوشگوار سا احساس موجود تھا کہ شاید نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی ہے۔ اس سے پہلے تو نصرت کو کبھی یہ دن یاد نہیں رہا تھا۔ ثروت سے میری گفتگو سنجیدہ نوعیت ہی کی رہی۔ اس نے تھوڑا سا نصرت کے علاج کے بارے میں ڈسکس کیا پھر مجھے اپنے شوہر کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے بولی۔ ”یوسف بھی منگل تک یہاں آ رہے ہیں۔ انہوں نے دو دن پہلے کچھ رقم بھی بھیجی ہے پاکستان سے۔“

”چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تقریباً روزانہ ہی فون کر رہے ہیں۔ یہاں ویانا میں ان کا ایک پاکستانی ڈاکٹر دوست بھی ہے۔ اس سے بھی ڈسکس کر رہے ہیں۔“ ثروت نے اطلاع دی۔

”نصرت کے علاج والی آزمائش کافی بڑی ہے ثروت! ہمیں یہ لڑائی مل جل کر لڑنا ہو گی۔ اللہ اسے جلد سے جلد صحت دے۔“

”جو کچھ ہے تابش! اس کی شروعات تو آپ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ میں اس کے لئے شکریے کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اس کی آواز قدرے بھرا گئی۔

”شکریہ غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ کیا اب میں تمہارے لئے اتنا ہی اجنبی ہو چکا ہوں؟“

”لیجئے انکل احمد سے بات کیجئے۔“ ثروت نے جلدی سے فون چچا احمد کو تھما دیا۔

”ہیلو تابی! کیسے ہو...... سالگرہ مبارک۔“ انہوں نے کہا۔

”تھینک یو انکل...... نصرت کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟“

”لگتا ہے کہ ابھی وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں میرا مطلب ہے کہ ٹرانسپلانٹیشن کے حوالے سے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نصرت کو ’اسٹے ایبل‘ رکھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں اور لگتا ہے کہ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ نصرت کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ درد میں افاقہ ہے اور کھا پی بھی رہی ہے۔“

چچا احمد شاید باتیں کرتے کرتے نصرت کے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ اسی لئے کھل کر گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گفتگو کا رخ ثروت کے شوہر یوسف کی طرف مڑ گیا۔ چچا احمد کو میں نے تقریباً وہ سارے معاملات بتا دیئے تھے جو ثروت کے گھر میں چل رہے تھے۔ یوسف جس طرح اپنی ٹین ایجر جرمن بیوی کے عشق میں گم تھا اور جس طرح ثروت کا استعمال رہا تھا، وہ سب کچھ کچھ چچا احمد کے علم میں تھا اور جو میں نے نہیں بتایا تھا، اس کا اندازہ انہوں نے خود لگا لیا تھا۔

وہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے بولے۔ ''تابی! یہ یوسف کافی تیز بندہ لگتا ہے۔ دو تین دفعہ فون پر اس سے بات بھی ہوئی ہے میری۔ نصرت کے علاج اور صحت سے تو اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں لگتی لیکن وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ دیکھ چکا ہے کہ نصرت کا علاج شروع ہو چکا ہے اور خرچے کا انتظام بھی ہوتا جا رہا ہے، اب وہ اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ روپے کا ایک ڈرافٹ بھیجا ہے اس نے۔ چند دن تک شاید خود بھی یہاں آئے گا۔''

''بس جو بھی ہے چچا جان! یوسف کو یہ شک نہیں ہونا چاہئے کہ نصرت کے علاج کا خرچہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔''

''لیکن وہ ہے بہت کائیاں...... مجھ سے میرے کام کے بارے میں سوال جواب کر رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میری انکم کیا ہے، اخراجات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

''آپ اس کے لئے کوئی معقول سا جواب تلاش کر چھوڑیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے حال ہی میں اپنا کوئی اثاثہ بیچا ہو۔''

''ہاں، میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اگر وہ بال کی کھال اتارنے پر آ گیا تو پھر ایسا ہی کوئی جواب دینا ہو گا۔''

چچا احمد سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے دیکھا۔ فون پر ایک بڑا اچھا میسج آیا ہوا تھا۔ یہ فرح اور عاطف کی طرف سے تھا۔ مجھے سالگرہ کی پُر جوش مبارک باد دی گئی تھی اور بہت سی نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا۔ آخر میں بالو کی طرف سے ایک فقرہ تھا...... ''پیارے ابو! آج کے دن آپ کو بہت یاد کر رہا ہوں۔ سالگرہ مبارک۔''

میں نے فرح اور عاطف کے اس میسج کو ''ڈیلیٹ'' کر دیا، اس کے علاوہ چچا احمد اور ثروت والی کال کا ریکارڈ بھی ''ڈیلیٹ'' کر دیا۔ اس کے بعد میں اپنے فرشی بستر پر لیٹ گیا۔ نہ چاہنے کے باوجود ثروت کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ رات عجیب سرور کی

سی کیفیت میں گزری۔ اس سرور کی وجہ یقیناً یہ خیال تھا کہ نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی تھی۔

صبح مجھے ناشتا اکیلے ہی تیار کرنا تھا اور ایک بار پھر اس کام کا میرے ذہن پر بہت بوجھ تھا لیکن ڈاکٹر مہناز میری مشکل آسان کرنے کے لئے پھر آن موجود ہوئی۔ اس نے میرے ساتھ مل کر کر ناشتا تیار کیا اور پورے سات بجے خود بھی ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گئی۔ جلالی صاحب ناشتا زیادہ تر ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی کرتے تھے۔ ان کا ٹیڈی کتا بھی عین اسی وقت ناشتے کی میز کے نیچے اپنا ناشتا کرتا تھا۔ وہ بڑا پھرتیلا کتا تھا اور جلالی صاحب اسے واکنگ اسٹک کی طرح استعمال کرتے تھے۔ جلالی صاحب اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی کچھ اور گرہیں میرے سامنے کھلی تھیں۔ وہ اس کوٹھی میں جیسے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم تھے۔ جلالی صاحب کو گاہے بگاہے ڈاکٹر مہناز کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ اس کو آوازیں دیتے تھے اور کبھی کبھی بہت سخت بھی بولتے تھے۔ دوسری طرف مہناز بھی ہر وقت ان کی طرف سے باخبر رہتی تھی۔ وہ کیا کھا رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ وہ کئی ایک دوائیں کھاتے تھے اور ان دواؤں کا طویل ٹائم ٹیبل مہناز کو ازبر تھا۔ جلالی صاحب اچھے موڈ میں ہوتے تو پاس بیٹھی مہناز کا ہاتھ تھام لیتے اور جیسے بے خیالی میں اس کے ہاتھ اور بازو کو سہلاتے رہتے۔ کسی وقت اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور نرمی سے اس کے کندھے کو مسلتے رہتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ سلسلہ صرف ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی نہیں تھا۔ ایک دن میں نے انہیں اسی طرح ڈاکٹر لائبہ کا ہاتھ تھامے ہوئے دیکھا۔ پھر ایک دن جب وہ اچھے موڈ میں سیکرٹری ندیم سے باتیں کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ ایک نوخیز ملازمہ رخشی ان کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے اور جلالی صاحب کا بازو اس کے کندھوں پر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مشکل ''بزرگوار'' تھے۔ ڈاکٹر مہناز کو اس لحاظ سے بھی جلالی صاحب کی قربت حاصل تھی کہ وہ ان کا علاج معالجہ کرتی تھی۔ ملازمین نے اپنی کوئی مشکل بات جلالی صاحب تک پہنچانا ہوتی تو اس کے لئے ڈاکٹر مہناز کا سہارا لیتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ جلالی صاحب دونوں ڈاکٹرز اور خاص طور سے ڈاکٹر مہناز کی بات تحمل سے سنتے ہیں لیکن مہناز بھی سو فیصد ڈانٹ ڈپٹ سے محفوظ نہیں تھی...... کبھی کبھی جلالی صاحب کا خراب موڈ مہناز کی بھی ایسی تیسی کر ڈالتا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز، ڈاکٹر لائبہ اور سیکرٹری ندیم کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ جلالی صاحب کو اپنا چیک اَپ کرانا تھا۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عمران آ دھمکا۔ اس کے کپڑوں سے وہی بو آ رہی تھی جو چڑیا گھر میں سے آتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''بس ذم کی کسر رہ گئی ہے۔ ورنہ میں یہی سمجھتا کہ کمرے میں بن مانس گھس آیا ہے۔''

''مادہ بن مانس کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا اور اپنے موبائل کی اسکرین کو گھورنے لگا۔

''کیوں خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ریان ولیم صاحب کا فون آ رہا ہے۔ وہاں اور لوگ بھی تھے۔ میں سن نہیں سکتا تھا۔ لگتا ہے کہ کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کل اس نے ریان صاحب سے رابطہ کیا تھا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے دریافت کیا۔ ''مختار ملک کے بارے میں بھی کوئی بات ہوئی؟''

''ہاں۔ میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے زور بازو کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ شکر ہے کہ مختار ملک کا تعلق ریان اینڈ کمپنی سے نہیں نکلا۔ ورنہ اپنے ہی ساتھی کو مارنے کے جرم میں ہمیں لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔''

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ عمران مسلسل اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے خود ریان صاحب کو کال ملائی۔ چند سیکنڈ بعد رابطہ ہو گیا۔ ''ہیلو ایمران!'' ریان ولیم کی آواز اس کے جسم ہی کی طرح بھاری بھرکم تھی۔

''جی سر۔ آئی ایم سوری۔ مصروف تھا اس لئے دو بار آپ کی کال کا ٹنا پڑی۔'' عمران نے انگلش میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' ریان نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''کل جو کچھ تم نے بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم حسب توقع بڈھے کے قریب جانے میں کامیاب ہو رہے ہو۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق ''زد'' کے جو نور تم دونوں کی مشترکہ دلچسپی ٹھہرے ہیں۔''

''جی ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''میں ابھی زد میں ہی تھا۔ ایک زہریلے کے پاؤں کا زخم دھو رہا تھا۔''

ریان ولیم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تمہیں اس معاملے کے بارے میں کچھ اور بتا دیا جائے۔ اس سے تمہیں اس سارے ''ایشو'' کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا اور تمہیں آگے کام کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔ کیا تم فی الوقت ایسی محفوظ جگہ

کہ میں اپنی بات جاری رکھ سکوں؟''

''بالکل جناب! جلالی صاحب، ان کی دونوں ڈاکٹرز اور سیکرٹری ندیم فارم سے باہر ہیں۔ میں اس وقت علیحدہ کمرے میں موجود ہوں۔''

''تمہیں پتا ہے کہ یہاں کوٹھی میں دو تین جگہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی ہیں؟''

''اس طرف سے بالکل تسلی رکھیں جناب۔ ہم اس کمرے کو اچھی طرح چیک کر چکے ہیں۔''

''ہاں، میں کہیں بھول نہ جاؤں۔ اس سیکرٹری ندیم کی طرف سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جتنا ہوشیار نظر آتا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' عمران نے کہا۔

ریان ولیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں بھی یہ سوال بہت مرتبہ ابھرا ہوگا کہ اس باکس میں کیا ہے جس کے لئے یہ ساری جدوجہد اور بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ اس باکس میں ایک بہت قیمتی دھات ہے۔ صرف ''ایک دھات'' لیکن بہت قیمتی...... کم از کم میں تو اسے دھات ہی کہوں گا کیونکہ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم سن رہے ہو؟''

''جی ہاں۔ پوری توجہ سے۔'' عمران نے کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''کہنے کو وہ ایک مورتی ہے۔ اسے آرا کوئے کہا جاتا ہے۔ آرا کوئے برما میں بولی جانے والی ایک زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنی حفاظت خود کرنے والا۔

''اس مورتی کے حوالے سے مشہور ہے کہ یہ نہ صرف صدیوں سے اپنی حفاظت خود کر رہی ہے بلکہ یہ جس مقام پر موجود ہوتی ہے اس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اب تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ یہ کس چیز کی مورتی ہے؟ یہ دراصل بدھا کا ایک دو فٹ اونچا مجسمہ ہے......''

ریان ولیم بول رہا تھا۔ اس کے الفاظ موبائل فون میں سے نکل کر ہم دونوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے اور ان الفاظ نے جیسے ہم دونوں کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ یہ ہم کیا سن رہے تھے؟ جو کچھ ریان ولیم بڑی رازداری کے انداز میں بتا رہا تھا، وہ ہمارے لئے نیا نہیں تھا۔ اس دھاتی مجسمے کے بارے میں ہم سے زیادہ کون جانتا تھا۔ یہی بدھا تو تھا جس نے ہمیں میڈم صفورا جیسی شاطر عورت اور صدیقی جیسے منافق بندے سے ٹکرایا

تھا۔ اسی نایاب بدھا کی خاطر بھانڈیل اسٹیٹ کے رنجیت پانڈے جیسے خطرناک کمانڈوز پاکستان آئے تھے اور انہوں نے مار دھاڑ کی تھی۔ اسی بدھا کو چرانے کی سزا میں ہمیں یعنی مجھے، صفورا اور صدیقی کو پاکستان سے اٹھا کر انڈیا کی اس دوردراز اسٹیٹ میں پھینکا گیا تھا۔ یہی نایاب مورتی جسے لوگ آراکوئے کہتے تھے۔ یہ بات پورے یقین سے کہی جاتی تھی کہ آراکوئے اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور اسے ناجائز طور پر اپنے قبضے میں رکھنے والے برباد ہوتے ہیں۔ ہماری آخری اطلاعات کے مطابق یہ بدھا بھانڈیل اسٹسٹ میں تھا۔ وہاں کے بڑے پگوڈا میں...... لیکن اب یہ سفید فام ریان ولیم ہم پر انکشاف کر رہا تھا کہ وہ یہاں ہے۔ شیخوپورہ کے اس فارم میں یا کہیں آس پاس۔ ایک مستطیل چوبی ڈبے میں بند اور کچھ خطرناک لوگ اس کے پیچھے ہیں۔

عمران نے اپنے "ری ایکشن" سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ریان ولیم بدستور فون پر بول رہا تھا۔ "...... یہ مجسمہ آراکوئے کچھ لوگوں کے لئے بے حد قیمتی ہے۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس مجسمے کے بہت سے مداح ابھی اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ یہاں پاکستان میں لاہور کے قریب موجود ہے۔ اگر یہ نیوز پھیل گئی تو یہاں بہت ہنگامہ ہو سکتا ہے۔ بہت سے ملکی اور غیر ملکی گروہ اس علاقے کا رخ کر سکتے ہیں۔ ہم اس کام کو جتنی جلدی نمٹا لیں، اتنا ہی اچھا ہوگا۔"

عمران نے کہا۔ "ذہن میں بہت سے سوال ابھرتے جناب! سب سے اہم سوالات تو یہی ہے کہ یہ خاص بدھا یہاں پہنچا کس طرح اور یہ کس کی ملکیت ہے؟"

ریان بولا۔ "میری معلومات بھی اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس حوالے سے کسی ابرار صدیقی کا نام لیا جا رہا ہے۔ اب یہ صدیقی کہاں ہے، اس کا بھی کسی کو کچھ پتا نہیں۔ تم نے بھی کل بتایا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے بیان کے مطابق یہ بدھا ایک چاندنی رات میں ایک تیز رفتار گاڑی میں سے نہر کے کنارے جھاڑیوں میں گرا تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ صدیقی ہی اس بدھا کو لے کر کہیں جا رہا ہو اور کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ ان لوگوں سے مجسمے کو بچانے کے لئے اس نے اسے جان بوجھ کر پھینک دیا ہو۔"

شاید ریان ولیم کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر کسی وجہ سے سگنل خراب ہو گئے اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ہم سناٹے میں تھے۔ یہاں فارم ہاؤس میں آنے کے بعد ہم نے پُراسرار باکس کے بارے میں کئی بار سنا تھا لیکن ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس باکس کا تعلق نایاب

مجسمے کی اسمگلنگ کے ان واقعات سے نکل آئے گا جن کو ہم تقریباً بھول چکے ہیں۔

عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا گڑبڑ گوٹالا ہو گیا ہے جگر! آراکوئے کا بھوت پھر زندہ ہو گیا ہے۔ نہ صرف زندہ ہو گیا ہے بلکہ زرگاں سے ترت یہاں شیخوپورہ روڈ کے اس فارم میں بھی آ پہنچا ہے۔ تمہاری سوگند، میری تو بدھی چکرا گئی ہے۔ بدھی کا مطلب سمجھتے ہو نا تم؟"

میں نے کہا۔ "صدیقی کا نام آنے کے بعد اس معاملے میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہاں صدیقی اور بدھا کا نام ساتھ ساتھ کیوں آ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ صدیقی ہی بدھا کو پھر انڈیا سے پاکستان لے آیا ہو۔"

"بڑا مبارک دن ہے۔ کئی مہینوں کے بعد تم نے کوئی عقل کی بات کی ہے۔" عمران نے کہا اور پریشان بکری کی طرح سر جھکا لیا۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"یار! وہی جو تم کہنا چاہ رہے ہو۔ تمہیں یاد ہوگا جب ہم اسٹیٹ سے واپس روانہ ہونے لگے تھے تو صدیقی کو بہت تلاش کیا تھا۔ میڈم صفورا نے پورے دو دن اس کو کھوجنے میں لگائے تھے۔ پھر ایسے شواہد ملے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صدیقی ہم سے پہلے ہی اسٹیٹ سے نکل چکا ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا۔ "اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے اسی وقت شبہ سا ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ یہ بندہ اگر واقعی یہاں سے گیا ہے تو پھر جاتے جاتے کوئی کارنامہ انجام دے گیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ صدیقی نے اسٹیٹ سے نکلتے نکلتے وہ بدھا پھر چرا لیا ہے جس کے لئے وہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا اور جس کی چوری نے چار سال پہلے ہر جگہ تہلکہ مچایا تھا۔"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔"

"لیکن یہ کام کچھ آسان تو نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تم بھول رہے ہو کہ ایڈووکیٹ صدیقی ایک شاطر ترین شخص کا نام ہے۔ اس کے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ ہے اور پھر ان دونوں اسٹیٹ میں جس طرح کے حالات تھے تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ حکم اور اس کے حواری گوروں کو شکست ہو چکی تھی۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ حفاظتی انتظام درہم برہم ہو چکے تھے۔"

"لیکن پھر بھی آرا کوئے کی بڑی اہمیت تھی یار! اگر اسے غائب کیا جاتا تو چند گھنٹوں کے اندر زرگاں میں تہلکہ مچ جاتا۔"

"تمہارے اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں جگر...... یہ بھی تو ممکن ہے کہ پگوڈا کے اندر اصلی مورتی کی جگہ اس کی نقل رکھ دی گئی ہو۔"

عمران کی بات میں وزن تھا۔

ایک دم ہی صدیقی کا کردار ہماری نظروں میں زبردست اہمیت اختیار کر گیا تھا اور کسی حد تک صفورا کا کردار بھی۔ صفورا اور صدیقی نوادرات کے حوالے سے دو پرانے دوستوں کی طرح تھے۔

میں اور عمران اس بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ باکس والے معاملے میں ہماری دلچسپی ایک دم ہی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ 16 ملین ڈالرز کے انعامی مقابلے اور فریبانہ انداز م ریان ولیم سے شروع ہونے والے واقعات کے ڈانڈے یوں اس فارم ہاؤس اور پھر آرا کوئے سے جا ملیں گے۔ ریان ولیم کو بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ اس نے عمران کو جس کام پر مامور کیا ہے اور جس چیز کا کھوج لگانے کو کہا ہے، اس چیز سے عمران کا پہلے ہی گہرا واسطہ رہا ہے۔ بہرحال، اب بھی آرا کوئے کی یہاں موجودگی کے بارے ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

عمران اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ تیزی سے سگریٹ بھی پھونک رہا تھا۔ اپنی خوب صورت ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ "یار یہ تو بڑا قضیہ شروع ہو جائے گا۔ سارے کے سارے حالات پلٹ آئیں گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ انڈیا سے پھر خطرناک کمانڈوز آئیں گے اور آرا کوئے کو ڈھونڈیں گے؟"

"بالکل ایسا ہی ہو سکتا ہے...... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، ریان ولیم جیسے لوگ بھی اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہونا چاہئے؟"

"یہ بدھا اگر واقعی جلالی کے آس پاس ہے تو پھر اسے جلد از جلد برآمد ہونا چاہئے اور ہماری حفاظت میں آنا چاہئے...... لیکن یہ بابا جی...... اپنی ذات شریف میں خود ایک بہت بڑی مصیبت ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ آسانی سے کچھ بتا کر دیں گے۔"

"اور سختی کر کے ان سے پوچھنا ممکن ہی نہیں۔ یہ چلتا پھرتا مدعا ہیں...... آناً فاناً اللہ کو

پیارے ہو سکتے ہیں۔"

"اصل مسئلہ تو یہی ہے۔" عمران نے کہا۔ "ورنہ ریان اور جاوا جیسے لوگ دو گھنٹے میں ان کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیتے۔"

"کوئی ترکیب سوچو۔"

وہ کش لے کر بولا۔ "شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر مہناز سے جلالی کا لگاؤ کچھ کام آ سکتا ہے۔ یعنی اگر مہناز کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو اسے بچانے کے لئے یہ حضرت اپنی زبان کھول دیں گے لیکن اب اندازہ ہوا ہے کہ ایسے معاملوں میں یہ بالکل بے حس ہیں۔ ان حضرت نے رشتوں ناتوں کے حوالے سے اپنے اندر کوئی کمزوری رہنے ہی نہیں دی۔ مہناز اور دوسری جوان ملازماؤں کو یہ اپنے سکون اور راحت کے لئے استعمال ضرور کرتے ہوں گے لیکن ان کے لئے کوئی جذباتی وابستگی یہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔"

"پھر تو ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے۔ کسی طرح باکس کا اصل مالک سامنے آ جائے۔ یعنی وہ بندہ جس نے چلتی گاڑی سے باکس پھینکا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی انجان شخص کو ساری بات سمجھا کر اور باکس کا مالک بنا کر جلالی صاحب کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ انہیں مطمئن کر دے؟"

"یہ حضرت کچی گولیاں نہیں کھیلے بلکہ پکے گولے کھیلے ہوئے ہیں۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ کچھ عرصہ فوج میں رہے ہیں۔ انہیں الو بنانا آسان نہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ دس پندرہ دن پہلے ایک پینٹ کوٹ والا شخص "مالک" بن کر آیا تھا یہاں۔ پورا پورا ڈراما کیا اس نے لیکن جلالی صاحب نے باکس کے بارے میں تفصیل پوچھی۔ باکس کا رنگ کیا ہے؟ تالا کس کمپنی کا لگا ہوا ہے؟ باکس کے اندر مجسمہ کس چیز میں لپٹا ہوا ہے؟ اس پر کوئی داغ ہے یا وہ بے داغ پیس ہے؟"

"پھر کیا ہوا؟"

"اس بندے کو بھی ڈاکٹر راشد کی طرح صرف ایک چڈی میں یہاں سے بھاگنا پڑا۔ گرے ہاؤنڈ کتے اس کی گاڑی کو کافی دور تک "سی آف" کرنے گئے۔"

"واقعی یار! اگر یہ بابا جی کہیں اللہ کو پیارے ہو گئے تو...... آرا کوئے تو ایک معما بن کر رہ جائے گا۔"

رات کو کھانے کے بعد میں عمران کا کمرا دیکھنے چلا گیا۔ یہ شاندار کمرا تھا۔ ڈبل بیڈ، فریج، ٹی وی سب کچھ موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرا اس سے پہلے چھوٹے ویٹرنری ڈاکٹر

لطیف کا تھا۔عمران نے کہا۔'' مجھے مبارک باد دو۔میری ترقی ہوگئی ہے۔میں باورچی سے ڈاکٹر بن گیا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''سنا ہے کہ نیا ڈاکٹر عقیل یہاں آنے سے مکر گیا ہے۔اب جونیئر ڈاکٹر لطیف ہی جانوروں کی دیکھ بھال کا کام سنبھالے گا۔ مجھے اس کے اسسٹنٹ کا درجہ دے دیا گیا ہے اور اس کا کمرا بھی مجھے عنایت کر دیا گیا ہے۔وہ خود بھگوڑے ڈاکٹر راشد کے کمرے میں منتقل ہو گیا ہے۔''

''ڈاکٹر عقیل کیوں نہیں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ اسے یہاں کے گڑبڑ حالات کا پتا چل گیا ہو۔آج کل جو کچھ یہاں چل رہا ہے، وہ کسی کے لئے بھی پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔لیکن میرے لئے بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیوں، تمہیں جنگلی بھینس کا دودھ دھونا پڑتا ہے؟''

''نہیں یار! جب میں کسی اچھے آرام دہ کمرے میں ہوتا ہوں اور وہاں ڈبل بیڈ بھی ہوتا ہے تو مجھے کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔جی چاہتا ہے کہ کوئی ساتھی ہو۔''

''تو فتح محمد کو ساتھ سلا لیا کرو۔''

''حسِ لطافت تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔کھوتے! میں کسی خوبرو لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔چلو، وہ اس ڈبل بیڈ تک نہ آئے لیکن کم از کم کوئی آس امید تو ہو۔''

''تو کوئی یارانہ جوڑ لو یہاں بھی۔یہ تمہارے لئے کون سا مشکل کام ہے۔''

''یہاں ڈاکٹر مہناز کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتی اپنے اسٹینڈرڈ کی۔اب سوچو نا جس نے ریما اور نرگس جیسی دل ربا خواتین کے ساتھ وقت گزارا ہو، اس کا کوئی معیار تو ہوگا نا۔ ویسے لڑکی یہ مہناز بھی ٹھیک ہے۔کل لان میں ڈاکٹر لائبہ، سیکرٹری ندیم اور کچھ دوسرے ملازموں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔میں تو بس کھڑکی میں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔اتنی خوبصورتی سے دوڑ کر رن بناتی ہے کہ فیلڈر گیند ہاتھ میں پکڑ کر تکتا رہ جاتا ہے۔رن آؤٹ کرنا ہی بھول جاتا ہے۔''

''پھر کیا ارادے ہیں؟''

''یار! اسے باؤلنگ کرانے کو دل چاہتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ کیچ پکڑا ہی دے۔''

''وہ باؤلر کو بیک ڈرائیو مارے گی اور تمہاری مڈل اسٹمپ اڑا دے گی...... میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ سمجھ گیا ہوں۔لگتا ہے کہ اپنی منگنی ٹوٹنے کے بعد اسے ہر جواں سال مرد سے الرجی ہوگئی ہے۔وہ جلالی صاحب کے ساتھ بڑی مطمئن ہے۔''

''لیکن جگر! جلالی صاحب نے تو زیادہ سے زیادہ رمضان شریف تک اللہ کو پیارے ہو جانا ہے۔''

''وہ ہو بھی گئے تو وہ ہم جیسوں کو گھاس نہیں ڈالے گی۔کوئی اور ادھیڑ عمر ڈھونڈ لے گی اور شاید شادی بھی کر لے۔''

''اچھا، دوسری ڈاکٹر لائبہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ ذرا ماٹھی ہے لیکن گزارہ کر جائے گی۔تھوڑی بہت لفٹ بھی کرا رہی ہے۔کل اس نے......''

یکا یک وہ چپ ہوگیا۔ایک دم اپنی چیسٹ پاکٹ کی طرف متوجہ ہوا۔یہاں موبائل فون موجود تھا۔وہ گڑبڑا کر بولا۔''اوئے، یہ کیا؟ یہ موبائل تو ابھی آن ہے......اوگاڈ...... یہ تو بند ہی نہیں ہوا۔''

اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔میں نے دیکھا اسکرین پر شاہین کا نمبر تھا...... وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔اب یہ ساری گفتگو اس نے شاہین کو سنانے کے لئے کی تھی اور ظاہر یہ کیا تھا جیسے غلطی سے موبائل کھلا رہ گیا ہے۔

''تم بہت بے ہودہ اور خبیث شخص ہو۔جو لوگ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے تمہیں ہیرو کہتے ہیں، اس لفظ کی توہین کرتے ہیں۔''

''اور تم کیا کر رہے ہو۔تم ''توہین چینل'' کر رہے ہو۔یار رکھو بعض اوقات اس کی سزا توہین عدالت سے بھی کڑی ہوتی ہے۔''

''ماشاءاللہ! کیا سزا ہوتی ہے اس کی؟''

''تمہارا کارٹون بنایا جائے گا اور اسے انڈیا کے کسی آئٹم سانگ پر رقص کرایا جائے گا۔ وہ سانگ بھی ایسا ہوگا جس کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آئیں گے۔اور تمہیں پتا ہی ہے جب ایسے گانوں کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے تو سننے والوں کے ذہنوں میں کیسے کیسے گندے خیالات آتے ہیں......وہ گانا......''

عمران کہتے کہتے اچانک خاموش ہوگیا۔ایک دم اس کے چہرے کی ساری غیر سنجیدگی سمٹ کر اس کی آنکھوں میں کہیں غائب ہوگئی۔وہ کچھ سن رہا تھا۔میں نے بھی اس کی سماعت کا تعاقب کیا۔یہ چکور کی آواز تھی جو سناٹے میں بلند ہوئی تھی۔یہ آواز فارم ہاؤس کی باؤنڈری

کے باہر سے آئی تھی۔

''سن رہے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں، چکور کی آواز ہے شاید۔''

''چکور ہی کی ہے لیکن اصلی نہیں کوئی یہ آواز نکال رہا ہے۔'' وہ یقین سے بولا۔

جانوروں کے حوالے سے عمران کی معلومات کو جھٹلانا بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل چکور کی آواز تھی لیکن عمران کہتا تھا کہ نہیں ہے تو کیا درختوں کی تاریکی میں کوئی شخص کسی دوسرے کو کوئی اشارہ وغیرہ دے رہا تھا؟ یہ کوئی پہرے دار ہو سکتا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی غیر متعلق شخص ہو۔ میں اور عمران دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میری شلوار کے نیفے میں ابھی تک وہ پسٹل موجود تھا جو مختار ملک سے لڑائی کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ ہم تیزی سے باہر نکلے۔ جانوروں کے پنجرے کے درمیان سے ہوتے ہوئے فارم کے بڑے گیٹ کی طرف آئے......ابھی ہم گیٹ سے تیس چالیس قدم دور تھے کہ پہلا فائر سنائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پستول کا فائر تھا۔ فوراً بعد دو اور گولیاں چلیں، یہ رائفل کی تھیں۔ یہ شوٹنگ بھی سو ڈیڑھ سو گز دور ہو رہی تھی۔ ان آوازوں نے ایکا ایکی فارم ہاؤس میں تہلکہ سا مچا دیا۔ پنجروں میں پرندے پھڑ پھڑانے لگے اور کئی چوپایوں نے چلانا شروع کر دیا۔ گارڈز بھی آوازوں کی طرف لپکے۔ ہم مین گیٹ سے نکلے اور درختوں کی طرف بڑھے۔ باؤنڈری وال کے اردگرد بیس تیس میٹر جگہ بجلی کی ٹیوبس سے نیم روشنی تھی مگر اس کے بعد گہری تاریکی تھی۔ کوئی سو میٹر آگے جانے کے بعد ہمیں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے دیکھ لیا، یہ سیکرٹری ندیم کی سفید مہران تھی۔ وہ کچے راستے پر آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ پھر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے ندیم بھی دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ حواس باختہ تھا۔

''کیا ہوا ندیم صاحب؟'' فتح محمد نے بلند آواز میں پوچھا۔

''وہ نکل گئے۔''

''کون تھے؟''

''پتا نہیں، انہوں نے مجھ پر گولی بھی چلائی ہے۔''

اس وقت ہم نے دیکھا کہ مہران کار راستے سے اتری ہوئی تھی اور اس کا ایک پہیا گڑھے میں تھا۔ غالباً ندیم نے کسی کے پیچھے جانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔

دو تین اور گارڈز بھی دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ہمیں تھوڑے فاصلے پر لوہے کی

چھوٹی سی ہتھ ریڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایسی ریڑھیاں مزدور، تعمیراتی سامان ڈھونے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں ہانپتے کانپتے ہوئے ندیم کا معائنہ کیا۔ وہ زخمی ہونے سے محفوظ رہا تھا۔ ہاں، گاڑی کی ونڈ اسکرین میں گولی کا سوراخ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''ہوا کیا ہے ندیم صاحب؟'' فتح محمد نے دوبارہ پوچھا۔

وہ اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ ''میں پُل کی طرف سے آ رہا ہوں۔ روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ دو بندے ہتھ ریڑھی میں سے کچھ نکال کر جیپ میں رکھ رہے تھے۔ یہ کوئی بڑا تھیلا سا تھا۔ بڑی جلدی میں نظر آ رہے تھے وہ۔ میں نے آواز دے کر پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ وہ جواب دینے کے بجائے جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئے۔ ہتھ گاڑی بھی وہیں چھوڑ دی۔ میں نے ان کی طرف جانا چاہا تو انہوں نے فائر کر دیا۔ یہ مجھے ڈرانے کے لئے تھا۔ میں نے بھی گاڑی سے رائفل نکال لی اور جیپ کے ٹائر کو نشانہ بنانا چاہا......اس کے بعد فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں اس بڑے درخت کے پیچھے تھا جو ہتھ گاڑی کے پاس نظر آ رہا ہے۔ چار پانچ گولیاں چلانے کے بعد انہوں نے جیپ بھگا دی۔ میں نے مہران پر ان کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن ریورس کرتے ہوئے یہ ٹائر یہاں کھڈے میں چلا گیا۔'' ندیم نے تاسف سے کہا۔

فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اعشاریہ تین آٹھ......کی ایک گولی ونڈ اسکرین میں لگی تھی جبکہ ایک گولی نے پچھلے دروازے میں سوراخ بنایا تھا۔

ہم سب فوراً واپس کوٹھی میں پہنچے۔ جلالی صاحب سلیپنگ گاؤن میں تھے اور بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں ساری صورتِ حال بتائی گئی۔ دو گاڑیاں فوراً مشتبہ جیپ کی تلاش میں روانہ ہوئیں۔ جلالی صاحب نے دونوں گاڑیوں سے موبائل فون پر رابطہ رکھا ہوا تھا۔ قریباً ڈھائی گھنٹے بعد دونوں گاڑیاں گھوم پھر کر واپس آ گئیں۔ مشتبہ جیپ کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر چل رہا ہے؟''

''کافی سنگین چکر لگتا ہے۔ جلالی صاحب بھی پریشان ہیں۔''

''کہیں یہ وہی باکس والا معاملہ ہی تو نہیں؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ آرا کوئے والا باکس بابا جی کے ہاتھ سے بھی نکل گیا ہے۔''

"کیا اسے اتنی آسانی سے ڈھونڈ لیا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا تابی! یار لوگوں نے صدام کو بھی ڈھونڈ نکالا تھا مگر ہم میں سے کچھ نکتہ چیں اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صدام کے بجائے اس کے کسی ہم شکل کو پھانسی دی گئی تھی۔ انسان چاند پر قدم رکھ چکا لیکن ہم اسے اب بھی ڈراما قرار دیتے ہیں۔ نائن الیون کے حوالے سے بھی نئی نئی موشگافیوں کی فیکٹریاں ہم نے لگا رکھی ہیں۔ میرے اور ٹنڈولکر کے بارے میں بھی کئی بے ہودہ خبریں لوگ پھیلاتے رہتے ہیں۔"

"تمہارا اور ٹنڈولکر کا کیا میل ہے؟" میں مسکرایا۔

"اسی کو تو بے ہودہ اور بے بنیاد خبر کہتے ہیں۔" وہ دانائی سے بولا۔ "نہ میں ٹنڈولکر کی طرح کرکٹ کھیلتا ہوں، نہ وہ کسی نیوز چینل کا اینکر ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلی فرصت میں ریان ولیم کو فون کر کے یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہئے۔"

"ہاں، یہ تو ضروری ہے۔" میں نے تائید کی۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ کچھ دیر تک کمرے میں گہری خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ "ویسے تابی! ہمیں اس صورتِ حال کا ایک اور پہلو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے...... سچویشن کا ایک دوسرا اینگل بھی ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

اس نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا، تب دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ امکان بھی ہے کہ جلالی صاحب کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔"

"وہ کس طرح؟"

"ہم کچھ دیر کے لئے فرض کر لیتے ہیں کہ جلالی صاحب نے آرا کوئے والے باکس کو حفاظت کی غرض سے فارم ہاؤس کے اردگرد کہیں چھپا رکھا ہے۔ انہوں نے یہ کام اکیلے کیا ہے اور اس جگہ کی خبر ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کچھ دیر پہلے جو واقعہ ہوا ہے، اس نے یقیناً جلالی صاحب کو بہت پریشان کیا ہوگا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جسے کچھ لوگوں نے ہتھ گاڑی سے نکال کر جیب میں رکھا اور پھر بھاگ گئے۔ نہ صرف بھاگے بلکہ خود کو بچانے کے لئے باقاعدہ فائرنگ بھی کی۔"

"ہاں، بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ ان کا دھیان 'باکس' کی طرف بھی جا سکتا ہے۔"

"بالکل جا سکتا ہے...... بلکہ گیا ہوگا۔ اب سوچو...... وہ کیا کرنا چاہیں گے؟ وہ تصدیق

کرنا چاہیں گے کہ باکس اپنی جگہ پر موجود ہے یا نہیں۔"

میں نے سنسنی محسوس کی۔ عمران کی بات میں زبردست منطق موجود تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ جلالی صاحب کا پیچھا کیا جائے گا؟"

"اللہ تمہیں نرینہ اولاد دے۔ میرا مطلب بالکل یہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اگلے ایک دو دن میں ہمیں جلالی صاحب کی آمد و رفت پر نظر رکھنی ہوگی۔"

"یقیناً...... خاص طور پر اس وقت جب وہ کہیں اکیلے روانہ ہوں۔"

"فرض کیا وہ روانہ ہوتے ہیں اور ہمیں پتا بھی چل جاتا ہے، تو پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر ان کا پیچھا کیا جا سکتا ہے۔ "زو" میں تین پک اپ گاڑیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کی چابی میرے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک اسکوٹر بھی قابلِ استعمال حالت میں ہے۔"

"یہ لمبا چوڑا کھیل لگتا ہے عمران۔ جاوا جیسے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ فرض کیا سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا ہم نے سوچا ہے۔ ہم نے جلالی صاحب کا پیچھا بھی کر لیا لیکن جب جلالی صاحب موقع پر پہنچے اور پندرہ بیس مسلح بندے وہاں آ دھمکے تو پھر؟"

"یار! تم سب کچھ پہلے ہی تو مت سوچ لو نا۔ کچھ فیصلے موقع پر بھی کئے جاتے ہیں۔ اگر ہمیں محسوس ہوا کہ جلالی صاحب کے آس پاس زیادہ گڑبڑ ہے تو ہم انہیں آگے جانے سے روک بھی سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم انہیں بتا سکتے ہیں کہ انہیں ٹریپ کیا جا رہا ہے۔ وہ جہاں جا رہے ہیں، وہاں کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ لیکن ابھی تو یار یہ سب مفروضہ ہی ہے نا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی چکر ہی اور ہو؟"

وہ رات گزر گئی۔ اگلے دن بھی کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں ہوا۔ فارم ہاؤس کے اردگرد چوکیداروں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی۔ حسبِ سابق اس واقعے کی رپورٹ بھی جلالی صاحب نے پولیس میں درج نہیں کرائی۔ تاہم وہ پریشان نظر آتے تھے اور یہ پریشانی واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے۔ عمران ڈاکٹر لطیف کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا۔ ایک ایرانی بلی بھی ساتھ گئی تھی۔ اس کا کوئی چیک اپ ہونا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں جانوروں کے لئے کچھ ادویات بھی لے کر آنا تھیں۔ ان کی واپسی شام کے فوراً بعد ہو جانا تھی لیکن پھر

عمران کا فون آیا کہ قیمتی ایرانی بلی کو مزید ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے اور وہ کل سہ پہر سے پہلے واپس نہیں آسکیں گے۔ یہ وہی حاملہ بلی تھی جس کو بچے جنم دینے تھے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہوگا۔ کوٹھی کی بیشتر روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ وسیع و عریض لان بھی خالی تھا۔ میں دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ یہاں سے مجھے کوٹھی کا پورچ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ شیورلیٹ بھی دکھائی دیتی تھی جسے جلالی صاحب زیادہ تر سفر کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پچھلے تین دن سے میں نے مسلسل پورچ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ عمران بھی یہی کر رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں جلالی صاحب کی آمدورفت کی خبر رہے لیکن وہ ان تین دنوں میں کہیں نکلے ہی نہیں تھے۔ صرف ایک صبح پیدل نکلے تھے۔ طرح دار ڈاکٹر مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے واپس لوٹ آئے تھے۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے جلالی صاحب کی شیورلیٹ کے قریب ایک سایہ سا نظر آیا۔ شیورلیٹ کے قریب ہی چھوٹی پوٹھوہار جیپ کھڑی تھی۔ سائے نے جیپ کے گرد مشکوک انداز میں ایک چکر لگایا۔ چند سیکنڈ بعد نیچے جھکا جیسے اگلے پہیے کی ہوا چیک کرنا چاہتا ہو۔ وہ قریباً آدھ منٹ تک وہیں رہا۔ مجھے لگا کہ اس نے کچھ کیا ہے۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ شاید کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔ بظاہر یہ عام سا واقعہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تقریباً آٹھ دس منٹ بعد میرے دل کی دھڑکن اچانک بڑھنا شروع ہوگئی۔ میں نے پوٹھوہار جیپ کے قریب ایک اور سایہ دیکھا۔ یہ یقیناً جلالی صاحب تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے سے آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ وہ اکیلے کہیں جا رہے تھے۔ ان کی عمر اور ان کی جسمانی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ اس طرح رات کے وقت کہیں اکیلے نکلیں لیکن انہیں روکنے ٹوکنے کی جرأت کون کر سکتا تھا؟ ایک دم میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا اور عمران یہاں نہیں تھا۔ مجھے اس کی بے وقت غیر موجودگی پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر سیڑھیاں اتر کر تیزی سے نیچے آیا۔

عمران نے کہا تھا کہ ہم اسکوٹر پر جلالی کا پیچھا کریں گے لیکن اس وقت تو اسکوٹر نظر آ رہا تھا اور نہ ہی وہ پک اَپ جس کی چابی عمران کے پاس تھی۔ اب تو ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ جلالی صاحب کو جانے سے روکا جائے۔ وہ کسی جال میں پھنسنے والے تھے۔

میں احاطے میں پہنچا تو ان کی سفید پوٹھوہار جیپ مین گیٹ سے نکل رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف گیا۔ میں نے گارڈز کو پکار کر کہا کہ وہ جلالی صاحب کو روکیں لیکن انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ جلالی صاحب نکل گئے۔ میں گیٹ پر پہنچا تو گارڈز نے مجھے روک

لیا۔ وہ ششدر تھے۔ ''کیا بات ہے؟'' فتح محمد نے گرج کر پوچھا۔

جلالی صاحب کو روکو۔ ان کے لئے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' وہ جھلا کر بولا۔

''تم پہلے ان کو روکو۔'' میں نے بھی جھلا کر کہا۔

''کیا تماشا لگا رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟'' اس نے مجھے دھکا دیا۔

میں نے بھی جواباً اسے دھکا دیا۔ اسے مجھ سے ایسے شدید دھکے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ادھ کھلے گیٹ سے ٹکرایا اور پلٹ کر ایک اسٹول پر گرا۔ میں اندھا دھند جیپ کے پیچھے بھاگا۔ جیپ کافی آگے درختوں میں پہنچ چکی تھی۔ وہ رفتار پکڑ چکی تھی۔ شاید میرے لئے اسے روکنا ممکن نہ ہوتا مگر اسی دوران میں سامنے ایک ٹارچ چمکی، کوئی گارڈ موجود تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''جلالی صاحب کو روکو۔''

بات گارڈ کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے جیپ کے سامنے آکر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ دھیمی ہوئی اور پھر رک گئی۔ میں ہانپتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جلالی صاحب موجود تھے اور حیرت آمیز غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے اجازت طلب کئے بغیر جیپ کا دروازہ کھولا اور ان کے برابر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ ہنکارے۔

''صاحب جی! آپ نہ جائیں۔ آپ کے لئے کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے۔''

''کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اور تم مجھے روکنے والے کون ہو؟''

''میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ پلیز، آپ فارم میں واپس چلیں۔''

''میں سمجھ گیا۔ ڈاکٹر مہناز نے بھیجا ہے نا تمہیں؟ اسی کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے۔ وہ کیا سمجھتی ہے...... میں بڈھا ہوں، ناکارہ ہوں، اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتا؟ کون ہوتی ہے وہ مجھ پر پابندیاں لگانے والی؟ میری موت جب آنی ہے، وہ آجائے گی۔ وہ اسے روک نہیں سکتی۔ بے وقوف کی بچی......''

''نہیں سر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملے سے ڈاکٹر مہناز کا کوئی تعلق نہیں۔ لگتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کو ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں سب کچھ۔ آپ واپس چلیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے آپ کی جیپ میں کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔''

میرے آخری فقرے سے جلالی کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ اس نے عینک کے پیچھے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتا ہے...... کہاں دیکھا ہے تم نے؟''

میں نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا ہے جناب...... اور مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ لوگ آپ کا پیچھا کرنا چاہ رہے ہیں۔ کیا آپ کسی خاص جگہ پر جا رہے تھے؟''

''کیا بک رہے ہو تم؟ میرا پیچھا کون کرے گا؟ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ گاڑی میں گڑبڑ کی گئی ہے، اب کہہ رہے ہو کوئی پیچھا کر رہا تھا؟''

''آپ گاڑی کو چیک کریں۔ اس کا بریک وغیرہ تو فیل نہیں یا اسٹیئرنگ میں کوئی مسئلہ ہو؟''

جلالی نے وہیں بیٹھے بیٹھے بریک پیڈل دبا کر دیکھا، وہ بالکل صحیح تھا۔ اندرونی لائٹ جلا کر اس نے اسٹیئرنگ کے نیچے کراس کو دیکھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ اس دوران میں فتح محمد اور دیگر گارڈز بھی ہانپتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ فتح محمد کا ایک بازو چھلا ہوا تھا اور ناک سے خون رِس رہا تھا۔ وہ مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے جلالی صاحب کو بتایا۔

''یہ مجھے دھکا دے کر آپ کے پیچھے بھاگا ہے۔ صادق تو اس پر گولی چلانے لگا تھا، میں نے روکا۔''

میں نے کہا۔ ''جلالی صاحب! میں آپ کے سارے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔ پلیز، آپ گاڑی واپس لے جائیں۔ اگر میرا کہا غلط نکلے تو جو سزا چاہیں مجھے دے لیں۔''

جلالی صاحب کچھ دیر تک مجھے گھورتے رہے۔ پھر انہوں نے جیپ کو یوٹرن دیا اور واپس فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ جلالی صاحب نے اپنی سیٹ کے قریب ایک شاندار ''بیکارل'' رائفل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ بوقتِ ضرورت اس کا گھوڑا دبانے کی طاقت اپنے اندر رکھتے تھے یا نہیں۔

جیپ واپس پورچ میں پہنچ گئی۔ کئی ملازم ہمارے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان میں سیکرٹری ندی، ملازم خاص فتح محمد اور ہیڈ گارڈ صادق علی وغیرہ بھی شامل تھے۔ رکھوالی کے کتے اپنی دُموں کو گردش دیتے ہمارے اردگرد چکرانے لگے۔

جلالی صاحب نے کڑکتے لہجے میں کہا۔ ''ہاں بتاؤ، کیا بتانا چاہتے ہو؟''

میں جیپ کے اگلے پہیے کے پاس بیٹھ گیا اور مڈگارڈ کے نیچے اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ میں نے پہیے کے نٹ بھی دیکھے، وہ ٹھیک کسے ہوئے تھے۔ میں نے خود کو پزل محسوس کیا۔ اگر میں کوئی خاص تبدیلی نہ ڈھونڈ سکتا تو میری بات غلط ثابت ہو جاتی۔ ایسے میں جلالی صاحب میری کم بختی لا سکتے تھے۔ یقیناً فتح محمد کا پارا

بھی چڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے فتح محمد کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور پشت کے بل جیپ کے نیچے لیٹ کر اس کے اگلے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ یکایک میں چونک گیا۔ مڈگارڈ کے پلاسٹک کور میں اندر کی طرف درز نظر آ رہی تھی، میں نے اس درز کو کھولا تو ایک چھوٹی سی براؤن ڈبیا گاڑی سے چپکی نظر آئی۔ میں نے یہ ڈبیا سیکرٹری ندیم کو بھی دکھائی اور پھر اسے اکھاڑ لیا۔

''یہ کیا ہے؟'' جلالی صاحب بھی اب چونک گئے تھے۔

''مجھے کیا پتا جی۔ میں تو کھانا پکانا جانتا ہوں۔ بس میں نے جو دیکھا تھا، آپ کو بتا دیا ہے۔''

سیکرٹری ندیم نے اس ''چھوٹی ماچس'' کے سائز کی ڈبیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ''یہ تو کوئی الیکٹرانک ڈیوائس لگتی ہے۔ شاید اس سے کوئی سگنل وغیرہ نشر ہوتا ہو۔''

جلالی صاحب کو ایک دم صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے سیکرٹری ندیم کے سوا سب کو پورچ سے باہر نکال دیا۔ باہر نکلنے والوں میں فتح محمد بھی شامل تھا۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا لیکن اس گھورنے میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' جلالی صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''جناب! میرا کام تو باورچی کا ہے۔ ایسی باتوں کا مجھے زیادہ پتا نہیں لیکن مجھے شک پڑ رہا ہے کہ یہ سازش ہے۔ اس سازش کا تعلق اسی باکس سے ہے۔ جس کے پیچھے کچھ لوگ ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس رات کو جو کچھ ہوا، وہ بھی ایک ڈراما ہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ ندیم صاحب کو جان بوجھ کر ناٹک دکھایا گیا ہو۔ اس طرح آپ کو شک میں ڈالا گیا ہو کہ آپ نے جس جگہ باکس چھپایا ہے، شاید اب وہ وہاں موجود نہیں ہے......''

جلالی صاحب ایک دم گم صم نظر آئے۔ وہ بار بار اپنی عینک کو ناک پر درست کر رہے تھے۔ یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ سیکرٹری ندیم بھی متحیر تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''اگر واقعی یہ سازش ہے تو بڑی گہری ہے جناب...... ان لوگوں نے سوچا ہوگا کہ آپ باکس کے بارے میں فکرمند ہوں گے اور دیکھنا چاہیں گے کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں۔ وہ آپ کا پیچھا کریں گے اور لوکیشن دیکھ لیں گے۔ پیچھا کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے یہ سگنل دینے والا ٹریکر گاڑی پر لگا دیا۔''

جلالی صاحب بے دم سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی باڈی لینگوئج گواہی دے رہی

تھی کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ درست ہے۔

''یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟'' کچھ دیر بعد انہوں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ کوئی گھر کا بھیدی ہی ہے۔'' ندیم نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابش! تم چشم دید گواہ ہو۔ تم نے بندے کو دیکھا ہے، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟''

''نہیں، جی، میں نے بس ہیولا سا دیکھا تھا۔ میں تو شاید یہ بھی ٹھیک سے نہ بتا سکوں کہ وہ مرد کا ہیولا تھا یا عورت کا۔''

ندیم نے ٹارچ جلائی اور گرد آلود فرش پر پاؤں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں روانگی سے پہلے پوٹھوہار جیپ پارک تھی۔ زمین پر بہت سے قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے مگر گڈمڈ تھے۔ ان میں ایک دو نشان لیڈیز جوتے کے بھی تھے۔ جلالی صاحب بالکل گم صم تھے۔ شاید وہ میری تعریف میں کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن انہوں نے کہا کچھ نہیں۔ ماچس نما ڈیوائس لے کر اندر چلے گئے۔

اگلے روز میں نے ڈاکٹر مہناز کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا۔ ڈاکٹر مہناز نے کہا۔ ''کل جو کچھ ہوا ہے، وہ ظاہر کرتا ہے کہ باکس کو ڈھونڈنے والے اس تک پہنچنے کے لئے ہر ہتھکنڈا آزما رہے ہیں۔ جلالی صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ عقل دانش کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ ایک باورچی کے دماغ میں وہ بات آ گئی جو ہم میں سے اور کسی کے دماغ میں نہیں آتی۔''

میں خاموش رہا۔ میں سے بتانا چاہتا تھا کہ اس ہوشیاری میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا عمل دخل ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بول اٹھی۔ ''میں نے جلالی صاحب کو بتا دیا ہے کہ آپ دونوں باورچی وغیرہ نہیں ہیں بلکہ ایک خاص مشن پر یہاں موجود ہیں۔ کچھ خاص لوگوں نے آپ کو یہاں بھیج رکھا ہے۔''

میں نے چونک کر ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میرا پورا جسم تھرا گیا تھا۔ پھر ایک دم میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ وہ ہنسی اور اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ایسا غضب نہ کرنا ڈاکٹر صاحبہ! سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔ جناب ہتھے سے اکھڑ گئے تو کھڑے کھڑے لات مار کر کوٹھی سے باہر کر دیں گے اور کیا پتا کپڑے بھی اتروا لیں۔''

''لیکن تابش صاحب! ایک بات ہے۔ آپ لوگوں کو کم از کم میرا سسپنس تو دور کرنا چاہیئے۔ میں آپ پر اعتماد کر رہی ہوں، آپ مجھ پر نہیں کر رہے۔ مختار ملک والا کتنا بڑا واقعہ ہو گیا لیکن آپ نے مجھے ابھی تک اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ کون تھا؟ کیا یہاں اکیلا تھا یا اس کا کوئی بھی ساتھی ہے؟ اس کی ضمانت دے کر اسے یہاں نوکری دلانے والا کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سچی بات یہ ہے ڈاکٹر مہناز کہ ابھی تک اس حوالے سے میں بھی اندھیرے میں ہوں۔ عمران پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ مختار کا ضامن کون تھا لیکن اس بارے میں بھی کوئی چونکا دینے والا انکشاف نہیں ہونے والا۔ مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ مختار کا تعلق جاوا سے ہی ہو گا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ ناشتے کا ٹائم شروع ہونے میں صرف آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔

مجھے اور ڈاکٹر مہناز کو تیزی سے ہاتھ چلانا پڑے۔ ناشتا تیار ہوتے ہی مہناز اپنا ایپرن اتار کر اور ہاتھ وغیرہ دھو کر کھانے کے کمرے کی طرف لپک گئی۔ ناشتے کی ٹیبل پر وہ روزانہ جلالی صاحب کے ساتھ ہوتی تھی۔ دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ وہی ملازم پھر آیا۔ اس مرتبہ وہ مجھے بلانے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں صاحب جی کھانے کے کمرے میں بلا رہے ہیں۔''

''یا اللہ خیر۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

جلالی صاحب کے روبرو جانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ ان کے موڈ کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا والا معاملہ تھا۔ ایک دم بھڑک اٹھتے تھے اور پھر انہیں سنبھالنا دشوار ہو جاتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں ناشتے میں کوئی کسر رہ گئی ہے جس کے لئے یہ نادر شاہی حکم آیا ہے۔ میں کھانے کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے ایک عجیب آرڈر جاری کیا۔ ''یہاں بیٹھو کرسی پر۔''

میں ٹھٹک گیا۔ وہ مجھے اپنے برابر، ناشتے کی میز پر بٹھا رہے تھے۔ میں تھوڑا سا تذبذب دکھانے کے بعد بیٹھ گیا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے ویسا ہی کرنا ہو گا جیسا وہ کہہ رہے ہیں، ورنہ یہ عزت افزائی کسی بھی وقت زبردست تذلیل میں بدل سکتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ ''مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ کل تم نے بہت اچھی کارکردگی

دکھائی۔ہم میں سے کسی کا دماغ اس طرف نہیں گیا جس طرف تمہارا گیا۔شروع میں جب تم نے مجھے باہر جانے سے روکا تو مجھے بہت غصہ آیا تھا لیکن بعد میں وہی کچھ درست نکلا جو تم نے کہا تھا۔وہ ڈبیا جو کل جیپ کے نیچے سے نکلی ہے،ایک الیکٹرانک ٹریکر ہے۔قریباً سات آٹھ کلومیٹر کے ایریا میں اس کا سگنل آسانی سے ریسیو کیا جا سکتا ہے۔یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ ایک سازش کا حصہ تھا۔تم بہت دور کی کوڑی لائے ہو۔میں پوچھنا پسند کروں گا کہ یہ سب کچھ تمہارے دماغ میں آ کیسے گیا؟''

میں نے انکساری کے انداز میں کہا۔''سچ بات تو یہ ہے جناب کہ اس بارے میں بھی استاد جی نے ہی اپنا دماغ دوڑایا تھا۔استاد عمران نے کافی عرصہ ایک بڑے انڈین پولیس افسر کے گھر میں بھی ملازمت کی ہے۔شاید یہ وہاں کے ماحول کا ہی اثر ہے کہ انہیں ایسے معاملوں میں سوچ بچار کی عادت پڑ گئی ہے۔شکل وصورت سے بندے کے کریکٹر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں اکثر اس میں کامیابی ہوتی ہے۔جس رات درختوں میں ندیم صاحب اور جیپ والوں میں فائرنگ ہوئی،اسی رات استاد جی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس میں کوئی چکر ہو سکتا ہے۔''

جلالی صاحب نے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی اونچی ناک پر موٹے چشمے کو درست کیا اور بولے۔''یہ تمہارا استاد ہر فن مولا شخص لگتا ہے۔پتا نہیں کہ کس کس گھر میں کام کر چکا ہے اور کیا کیا سیکھ چکا ہے۔جانوروں کے بارے میں بھی اسے کافی جانکاری ہے۔بتا رہا تھا کہ مشہور شکاری تہور علی صندوقی صاحب کا باورچی بھی رہ چکا ہے اور ان کے شکار کئے ہوئے ہر طرح کے جانوروں کا گوشت پکاتا رہا ہے۔خاص طور سے ہرن کی ڈشیں تیار کرنے میں اسے خاص الخاص مہارت حاصل ہے۔''

''جی ہاں لیکن استاد جی کو جانوروں سے پیار بھی بہت ہے اور جانور بھی ان سے بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔آج کل ان کو یہ شوق چرایا ہوا ہے کہ ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیاں ان کے ہاتھ سے لے کر دانہ کھائیں۔یہ کوشش کر رہے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اس میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ہاں،کچھ لوگ ایسا کر لیتے ہیں۔میں نے خود ایک ڈاکومنٹری فلم میں دیکھا تھا۔اٹلی کے شہر''پیسا'' کا ایک سین دکھایا گیا تھا۔ایک شخص ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیوں کو اپنے ہاتھ سے''فیڈ'' کر رہا تھا۔بعض لوگوں میں جانوروں کے لئے خاص کشش پائی جاتی ہے۔یہ تمہارا استاد بھی ان میں سے ایک ہے۔میرے خیال میں تو اسے باورچی کا کام چھوڑ دینا چاہئے۔

ذہین بندہ ہے،یہ کام چھوڑ کر زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ہماری قوم کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں کر رہے۔جس کو موٹر مکینک ہونا چاہئے،وہ ڈاکٹر بننے کی کوشش کر رہا ہے،جس کو ڈاکٹر ہونا چاہئے،اس کے پاس وسائل نہیں......وہ کھڑکیاں ویلڈنگ کر رہا ہے۔''

''لیکن جناب!کھانا پکانا تو استاد عمران کا خاندانی کام ہے......ان کے والد......''

''یہ کیا بات ہوئی؟''جلالی صاحب نے تیزی سے میرا فقرہ کاٹا۔''کسی کا باپ ڈکیت رہا ہے تو کیا اسے ڈکیتی ہی زیادہ راس آئے گی؟چور سے قطب اور قطب سے چور پیدا ہوتے ہیں۔یہ کیا بات کہی تم نے کہ یہ اس کا خاندانی کام ہے۔خاندانی کام کا مطلب کیا یہ ہوتا ہے کہ ایک نسل کے بعد دوسری اور پھر تیسری مکھی پر مکھی مارتی رہے۔تمہارے باپ کا خاندانی کام کیا تھا؟''انہوں نے غصے سے پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ میں بحث میں الجھنے کی کوشش نہ کروں۔

میں نے ڈھیلے انداز میں کہا۔''وہ تو باورچی نہیں تھے جی......وہ درزی کا کام کرتے تھے۔''

''تو پھر تم کیسے باورچی بن گئے اور ایک اچھے باورچی بنے۔یہ ناشتا تم نے ہی بنایا ہے نا......یا کسی اور نے بنا کر دیا ہے تمہیں؟''

مہناز کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔میں نے جلدی سے کہا۔''میں نے ہی بنایا ہے جی۔''

''تو پھر......؟اس میں خاندانی فن کاری کہاں سے آ گئی۔یا پھر یہ ہوگا کہ تمہاری ماں باورچن ہوگی یا پھر تمہاری پڑدادی یا لکڑدادی بہادر شاہ ظفر کے لئے بریانی بناتی رہی ہوگی۔یہ کس حساب سے تم نے کہا ہے کہ خاندانی کام،خاندانی کام ہوتا ہے......''

مہناز نے آنکھ بچا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔میں نے کہا۔''معافی چاہتا ہوں جی۔ایویں غلط بات کر دی میں نے......آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......''

جلالی صاحب کچھ دیر تک تلملاتے رہے اور مجھے گھورتے رہے۔یوں لگتا تھا کہ اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔مہناز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اب خالی برتن اٹھا کر باہر نکل جاؤں۔میں نے ایسا ہی کیا۔

ویسے اندر ہی اندر میں بھی سٹپٹایا ہوا تھا۔بابا جی کس وقت اور کس بات پر ہتھے سے اکھڑیں گے،اس کے بارے میں اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔اب وہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ڈاکٹر مہناز کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔میں نے عمران کے

لگائے ہوئے ڈکٹافون کا ریسیور آن کر دیا۔ واضح آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بالکل یوں لگا جیسے ریڈیو کے کسی ٹاک شو میں دو افراد بول رہے ہوں۔ ایک ایک لفظ پوری وضاحت کے ساتھ کانوں تک رسائی حاصل کر رہا تھا۔ میں نے آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کر لیا۔

جلالی صاحب کا موڈ شاید اب تک آف تھا۔ وہ سخت لہجے میں مہناز سے کہہ رہے تھے۔ ''جو کچھ بھی ہے، مجھے اس رات والا کام پسند نہیں آیا۔ وہ کھلی چھت تھی، کوئی کمرا تو نہیں تھا...... کوئی بھی تمہیں میرے ساتھ لیٹے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ آئندہ ایسا نہ ہو تو اچھا ہے۔''

مہناز کی آواز ابھری۔ ''معافی چاہتی ہوں۔ میری بات کا غصہ نہ کیجئے گا۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو کیا ہوتا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ تو نہ ہوتا۔ سب جانتے ہیں کہ آپ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ یہ بس آپ کی عادت ہے۔ اس میں کوئی خاص جذبہ تو نہیں ہوتا......''

''تم کیا جانتی ہو میری اس عادت کے بارے میں؟'' جلالی کا لہجہ تلخ تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں جی۔ بس اتنا پتا ہے کہ اس سے پہلے آپ رخشی کے ساتھ بھی اسی طرح لیٹتے رہے ہیں اور اس سے پہلے ایک استانی شائستہ آئی تھی یہاں...... جو ملازموں کے بچوں کو پرائمری کے امتحان کی تیاری کراتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی آپ کا ایسا ہی تعلق تھا...... اور شاید اس کے علاوہ بھی ایک دو ہوں گی۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ میں ایسا نہیں کرتا رہا ہوں...... لیکن تمہاری وجہ سے یہ معاملہ کچھ اور رنگ اختیار کرتا جا رہا ہے اور مجھے اس وجہ سے پریشانی ہے۔''

''کیا آپ کچھ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟'' مہناز نے کہا۔

لگتا تھا کہ آج وہ بھی اپنے خوف کو پس پشت ڈال کر کھلی باتیں کرنا چاہ رہی ہے۔

جلالی صاحب نے پُرطیش کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''دیکھو مہناز! میں تمہیں ایک بات بالکل صاف صاف بتا دوں۔ میں وہ ضدی گھوڑا ہوں جس نے کسی بڑے سے بڑے سورما کو بھی خود پر سواری نہیں کرنے دی اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کسی طرف سے کمزور نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں جس روز جلالی کی کوئی کمزوری دنیا والوں کے ہاتھ آ جائے گی، جلالی...... جلالی نہیں رہے گا۔ تم جس طرح ہر وقت میرے آگے پیچھے پھر رہی ہو، میرے ذاتی معاملوں میں دخل دے رہی ہو، یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔''

چند سیکنڈ تک مکمل خاموشی رہی۔ پھر ریسیور پر ڈاکٹر مہناز کی آواز ابھری۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''سر! جب آپ کے دل میں کچھ ہے ہی نہیں تو پھر میری ذات آپ کی کمزوری کیسے بن سکتی ہے؟ میں بھی تو ان دوسری عورتوں کی طرح ہی ہوں جو آپ کے

اردگرد ہیں، آپ کی خدمت گار ہیں اور جن کے ساتھ آپ کسی وقت ایک خاص قسم کے رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ سلاتے ہیں یا انہیں اپنے بہت قریب رکھتے ہیں۔''

''تم مجھ سے بحث کرنا چاہتی ہو، زبان چلانا چاہتی ہو میرے ساتھ؟'' ایک دم جلالی صاحب پوری طرح ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''میری اتنی جرأت کہاں سر! میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے یہ خاص اہمیت کیوں دے رہے ہیں جبکہ میری کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔''

''کیا اس طرح تم مجھ سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ تمہاری خاص اہمیت ہے؟'' وہ بدستور بپھرے ہوئے تھے۔

''نہیں سر! میں ایسا نہیں چاہتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جلالی صاحب نے قدرے بدلے ہوئے لب و لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں کہوں کہ ایسا ہے یا ایسا ہو رہا ہے تو پھر؟''

''کک...... کیا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟'' مہناز نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کپکپاہٹ کی تہ میں کہیں شاید خوشی کی ہلکی سی لہر بھی تھی۔

''وہی جو تم سن رہی ہو...... اگر میں تمہارے ساتھ یہ ساری بکواس کر رہا ہوں اور اپنا مغز کھپا رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ میں تمہارے سلسلے میں پریشان ہوں۔ میں تم سے دو دفعہ پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تم چلی جاؤ...... کم از کم کچھ دنوں کے لئے ہی چلی جاؤ لیکن تم یہاں سے ہل نہیں رہی ہو۔''

جلالی صاحب کے اندازِ گفتگو نے مہناز کو کچھ حوصلہ دیا۔ وہ ذرا اٹھلا کر بولی۔ ''اور میں جاؤں گی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جان ہی جائے گی نا...... لیکن میں آپ کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ آپ کے پاس بہت پیسا ہے۔ زمین ہے، شہر میں کروڑوں کی پراپرٹی ہے۔ آپ کے قریب رہوں گی تو کچھ نہ کچھ فائدہ تو مجھے بھی ہوگا نا۔'' وہ مسکراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں جانتا ہوں۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، سب کچھ اس کے الٹ ہے۔ تمہیں ان چیزوں کا لالچ نہیں اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ تم کچھ علیحدہ ٹائپ کی لڑکی ہو۔ اپنے من کی موج میں بہنے

والی۔اپنے بنائے ہوئے رستے پر چلنے والی۔''

وہ پھر مسکراتے لہجے میں بولی۔''لیکن کسی کے دل کا کیا پتا ہوتا ہے سر! ہوسکتا ہے کہ میرے دل میں کچھ ایسی باتیں ہوں جو آپ کی سوچ سے مختلف ہوں۔''

''میں نے یہ بال اور یہ بھویں وغیرہ دھوپ میں سفید نہیں کیں۔'' جلالی صاحب نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم انداز میں کہا۔

لگتا تھا کہ ان باتوں نے مہناز کو دل سے خوش کیا ہے۔ وہ بولی۔''اچھا، اب آپ یہیں بیٹھیں آپ کی معدے والی دوا کا وقت ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے پاؤں کا مساج بھی کرنا ہے۔کل بھی ناغہ ہوگیا تھا۔ میں ابھی آئنٹمنٹ لے کر آتی ہوں۔''

''لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات ذرا دھیان سے سن لو۔'' جلالی صاحب کے لہجے میں پھر گہری سنجیدگی آگئی۔

''جی۔'' مہناز نے کہا۔

''یہ جو تم میرا ایکسٹرا دھیان رکھتی ہو، یہ چھوڑ دو۔ اسی طرح نظر آؤ جیسے دوسرے نظر آتے ہیں۔ اسی میں میرا اور تمہارا بھلا ہے۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو پھر کچھ غلط ہوا تو اس کی ذمے دار تم خود ہوگی۔''

''ٹھیک ہے جی۔ میں احتیاط کروں گی۔'' مہناز نے کہا پھر اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ چھوٹے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر جا رہی تھی۔

جی چاہ رہا تھا کہ یہ ساری گفتگو ریکارڈ کرسکتا اور عمران کو سنا سکتا۔ یوں اسے بھی مہناز اور جلالی صاحب کے تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ عمران کا کہنا تھا کہ جلالی ایک سخت دل اور کسی حد تک ایک بے حس شخص کا نام ہے۔ وہ کسی شخص یا چیز کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیتا۔ بعض اوقات وہ اپنی خوب صورت ملازماؤں کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق پیدا کرلیتا ہے۔ ان کو اپنے قریب رکھتا ہے، ان کے ساتھ لیٹتا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی نرم جذبہ کبھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس کے لئے بس اجرتی ملازم ہی رہتی ہیں اور ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہے۔ لیکن آج جو گفتگو میں نے پوشیدہ مائیکروفون کے ذریعے سنی تھی، وہ اشارہ کر رہی تھی کہ اس صورتِ حال میں مہناز کے حوالے سے کچھ نہ کچھ چینج موجود ہے' بابا جی' کے نزدیک اگر وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت اہمیت ضرور رکھتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا کسی طرح اس ''اہمیت'' کو باباجی کی زبان کھلوانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ یا پھر یہ اہمیت ابھی اتنی توانا ہی نہیں کہ اس سے کوئی کام لیا جاسکے؟

دو چھٹیاں ساتھ ساتھ آرہی تھیں۔ ان میں تیئس مارچ کی چھٹی بھی تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ جلالی صاحب کیلنڈر پر موجود ساری روایتی چھٹیاں بڑے اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں۔ اس موقع پر بھی انہوں نے خاص انتظام کروا رکھا تھا۔ فارم سے پانچ کلومیٹر دور ایک نہر گزرتی تھی۔ یہاں چکور کے شکار کا پروگرام بنا۔ شکار کے پروگرام سے پہلے کھلی فضا میں'' بار بی کیو'' ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ پانچ چھ خیمے لگائے جانے تھے اور جنریٹر بھی لے جایا جارہا تھا۔ آج پھر عمران کی صلاحیتوں کا امتحان تھا۔ ایک باورچی کی حیثیت سے ہم دونوں سہ پہر تک کچھ دیر بعد ہی موقع پر پہنچ گئے اور کھانے کا انتظام شروع کردیا۔ حسبِ معمول سارا کام عمران ہی کر رہا تھا۔ وہ مجھے ثانوی حیثیت کے کام سونپ رہا تھا اور دیکھنے والے کو لگتا یوں تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ برابر کا مصروف ہوں۔

ایک بڑے دیگچے میں چمچہ چلاتے ہوئے وہ بولا۔''اب تو جی چاہتا ہے کہ کسی کماؤ لڑکی سے شادی کرلوں۔ وہ باہر کا کام کرے، میں گھر میں کھانا پکاؤں اور بچوں کو سنبھالوں۔''

میں نے چکن کے ٹکڑوں کو دہی میں بھگوتے ہوئے کہا۔''تو کماؤ لڑکی ہے نا تمہارے پاس۔ رات دن ریما جی کے قصیدے پڑھتے ہو یا نہیں۔''

''یار! وہ تو مجھے لگتا ہے کہ دو مولویوں میں مرغی حرام ہوچکی ہے۔ نرگس، ریما کو کچا کھا جائے گی یا ریما، نرگس کو شوٹ کرڈالے گی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی میرے حوالے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اب تو کوئی تیسری ہی ڈھونڈنی پڑے گی۔'' بولتے بولتے اس نے ایک دم چونک کر بائیں طرف دیکھا اور بولا۔''لو، دیکھو وہ آگئی تیسری بھی۔''

ڈاکٹر مہناز پوٹھوہار جیپ سے اتر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی بلی اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے بار بار سہلا رہی تھی اور اپنے ساتھ لگا رہی تھی۔ ڈوبتی شام میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی گلابی نظر آتا تھا۔ براؤن سن گلاسز چہرے پر جچ رہے تھے۔ عمران نے سرد آہ بھری اور بولا۔

''کاش، میں ایک بلی ہوتا اور اس خوبصورت شام میں...... میرا سر عین اس جگہ پر ہوتا...... جہاں بلی کا ہے۔''

''حالانکہ میں تمہیں سب کچھ بتا بھی چکا ہوں۔ یہ لڑکی کسی اور کے کام کی نہیں رہی۔ جلالی صاحب کے بڑھاپے پر عاشق ہوچکی ہے۔ اس ناتے سے تم تو اس کے نزدیک کل کے بچے ہو بلکہ بلونگڑے ہو۔''

عمران نے آہ بھری۔''یار! یہ عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ جلیبی کی طرح گول، پیاز کی طرح تہ در تہ اور امربیل کی طرح الجھی ہوئی۔ یہ کب کیا گزرے گی، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

میں نے کنکھیوں سے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ کل سے بڑے اچھے موڈ میں تھی اور موڈ کی یہ تبدیلی اس گفتگو کے بعد سے دکھائی دے رہی تھی جو جلالی صاحب کے ساتھ اس نے ڈرائنگ روم میں کی تھی۔ سورج ڈوبنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ کافی روشنی تھی۔ کوٹھی کے نوجوان ملازم، ڈاکٹر لائبہ اور ندیم وغیرہ کے ساتھ کھلی جگہ پر کرکٹ کھیلنے لگے تھے۔ ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہوگئی۔ سب خوش گوار موڈ میں تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے ڈرائیور رشید کو ایک زوردار شاٹ مارا اور گیند نہر میں جا گری۔ گیند نکالنے کی کوشش میں مالی رمضان کا بیٹا سلیم نہر میں گر گیا۔ خوب ہنسی مذاق ہوا۔ کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر مہناز آؤٹ ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

عمران نے سرد آہ بھری۔ ”کاش، میں اس ماہ جبیں کو باؤلنگ کراتا اور کلین بولڈ کرتا۔ لیکن افسوس اے حسن کی شہزادی! میں اس محل سرا کا ایک ادنیٰ باورچی ہوں۔ سرد آہیں تو بھر سکتا ہوں لیکن تیرے ساتھ کرکٹ نہیں کھیل سکتا۔“

”تم کسی کے ساتھ بھی نہیں کھیل سکتے۔ تم بارہویں کھلاڑی بن چکے ہو جو بس فیلڈنگ کر سکتا ہے۔“

”چلو یار! فیلڈنگ ہی کروں لیکن کچھ تو ہو۔ ڈاکٹر مہناز جیسی لڑکی کا کیچ پکڑ لیا تو سمجھو پورا میچ جیت لیا۔“

میں اور عمران ایک بڑے چکن پیس کے چھوٹے ٹکڑے کر رہے تھے۔ چھری عمران کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کراہ کر بولا۔ ”یار! ذرا دھیان رکھنا، مہناز جی کے حسن میں کھو کر کہیں میں تمہاری انگلی ہی نہ کاٹ ڈالوں۔“

میں نے کہا۔ ”بڑے کھوچل عاشق ہو۔ انگلی بھی کاٹو گے تو کسی اور کی......“ پھر میں نے چونک کر اس کی چیسٹ پاکٹ کی طرف دیکھا۔ ”کہیں آج بھی فون تو آن نہیں کر رکھا تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بھئی۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”شاہین کی بچی نے تو اس دن سے بات کرنا ہی چھوڑ دی ہے۔ صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تمہیں ریما اور نرگس مل رہی ہیں تو مجھے بھی کوئی اکشے کمار یا عامر خان مل جائے گا۔“

”دیکھو عمران! وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے اور تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔ پیار کرنے والوں کو اس طرح ستایا نہیں کرتے۔ وہ تم کیا کہا کرتے ہو مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے پر دل نہ کسے دا ڈھائیں......“

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا ہو ہا کی زوردار آواز سنائی دی۔ مالی کے بیٹے قیوم نے ایک زوردار ہٹ لگا کر گیند جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ سب اسے تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اب اندھیرا اتر آیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جلالی صاحب ہر جگہ اپنی مرضی کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی مرضی خطرناک بھی ہوتی ہے۔ اب جس قسم کے حالات یہاں چل رہے ہیں، اس آؤٹ ڈور پروگرام کی بھلا کیا تک تھی۔ سکیورٹی کے لحاظ سے یہ کسی طور مناسب نہیں۔“

”تم یہی بات بابا جی کے سامنے فرمانا۔ تمہیں نہر کے کنارے ساری رات کے لئے مرغا نہ بنا دیں تو میرا نام بدل دینا۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے کہنے کی؟ مگر کوئی تو ان کو سمجھانے والا ہونا چاہئے۔“

”اب یہ سمجھنے سمجھانے کی حد سے گزر چکے ہیں۔ خواہ مخواہ دل جلانے سے فائدہ نہیں۔ بس ہوشیار رہو اور آنکھیں کھلی رکھو۔ کوئی گڑبڑ ہو تو ہمیں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ مختار ملک والا پسٹل ہے نا تمہارے پاس؟“

”ابھی تک تو ہے۔“ میں نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے کو ٹٹولا پھر ذرا توقف سے کہا۔ ”دیکھو، ابھی تک ہمیں یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ مختار ملک کا تعلق کس سے تھا اور وہ کس مشن پر یہاں موجود تھا۔“

”مشن کے بارے میں تو کوئی شبہ ہے ہی نہیں تابی ڈیئر......لکڑی کے باکس میں وہی دو فٹ کا فتنہ ساز آرا کوئے ہمارے آس پاس موجود ہے اور کچھ لوگوں نے اس کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دو پارٹیاں ہیں۔ ایک تو وہی پارٹی ہے جس نے ہمیں بھی ہائر کیا ہوا ہے۔ یعنی ریان ولیم اور پروفیسر رچی وغیرہ ہیں۔ دوسری پارٹی انڈین گینگسٹر جاوا کی ہے۔ اس میں دُرِشہوار اور انگریز مائیکل وغیرہ شامل ہیں۔“

”لیکن مختار ملک کا تعلق کس سے تھا؟ ریان ولیم اینڈ کمپنی سے یا جاوا سے؟“

”یہ سوال ابھی جواب طلب ہے۔ لیکن ایک بات تو میرے نزدیک کلیئر ہے۔ شروع میں گوشت کے پہاڑ ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سراسر جھوٹ بولا تھا کہ وہ باکس کو ڈھونڈنے والا کام کسی اور کے لئے کر رہا ہے۔ دراصل وہ خود ہی باکس کے پیچھے ہے۔ شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ شخص نسل کے اعتبار سے یہودی ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ خالص کاروباری ذہانت بھی رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جس کام میں بھی پیسا نظر آتا ہے وہ اسے کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ کوئز شو ہو، جوئے بازی ہو، بھتا خوری ہو یا کوئی بزنس۔“

''یار! یہ ساری معلومات تمہیں حاصل کیسے ہو جاتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اقبال اور جیلانی وغیرہ کسی قبرستان میں بیٹھ کر بھنگ گھوٹ رہے ہیں۔ بھئی وہ کام کر رہے ہیں...... اور اچھا کام کر رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اطلاعات اکٹھی کرنے کے لئے تمہارا اپنا نیٹ ورک موجود ہے۔''

''بالکل۔ یہی وجہ تو ہے کہ فساد پلس اس وقت پاکستان کا نمبرون چینل ہے۔''

''تم ایک دم جلیبی کی طرح گول ہو۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تمہاری۔ مجھے تو پھر ابن صفی والی بات یاد آ رہی ہے۔ اگر محترم حیات ہوتے تو تمہیں دیکھ کر ضرور حیران ہوتے...... بلکہ دانتوں میں انگلی دباتے کہ ان کا تخیلاتی کردار زندہ حالت میں آ موجود ہوا ہے۔''

''تم ان رائٹرز لوگن کو ناہیں جانتے۔ یہ انسپائر ہووت ہیں بھیا۔ پہلے کسی چیز کو دیکھت ہیں پھر اس کی نقل اتار کر کہانیوں میں پیش کر دیوت ہیں۔ ان ابن صفی صاحب نے بھی یقیناً میری نقل اتاری ہووے گی۔''

''تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔''

''یہی تو ہوشیاری ہوتی ہے ان لوگن کی۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی نقل اتار لیوت ہیں۔ ویسے بھی پیدا ہونے سے پہلے بندے کی آتما تو موجود ہوتی ہے نا۔ کسی رات میری آتما محترم لکھاری صاحب کے کمرے میں چلی گئی ہووے گی۔ انہوں نے جھٹ اس کا خاکہ اتار لیا ہووے گا......'' وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کر رہا تھا۔

ایک باوردی گارڈ ٹہلتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق نہر کے کنارے کافی ہلا گلا رہا۔ کوئلوں پر دیسی مرغی اور دیسی بکرے کا گوشت بھونا گیا۔ سیخ کباب بنائے گئے۔ پرانے طرز کے گراموفون پر سہگل، ثریا بیگم اور نور جہاں کے گانے سنے گئے۔ جلالی صاحب نے اپنے جدید ٹینٹ میں قدیم فلم جگنو دیکھی اور کئی ساتھیوں کو بھی زبردستی دکھائی۔ ان میں ڈاکٹر مہناز، لائبہ، ندیم اور ڈرائیور رشید وغیرہ شامل تھے۔ چاندنی رات تھی۔ چکور کا شکار بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میں نے سحر انگیز چاندنی میں ڈاکٹر مہناز کو نہر کے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھے دیکھا۔ وہ ڈاکٹر لائبہ اور ندیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور جلدی سے جلالی صاحب کے ٹینٹ کی طرف دوڑ گئی۔ غالباً جلالی صاحب کی کسی دوا کا وقت ہو گیا تھا۔

رات دھیرے دھیرے کھسکتی رہی اور خیریت سے گزر گئی۔ کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں

ہوا۔ رات کے آخری پہر سب لوگ سو گئے تھے۔ بس گارڈز ہی پہرا دیتے رہے۔ نو دس بجے تک یہ لوگ وہیں اوپن ایئر میں ناشتے سے فارغ ہو گئے اور واپس فارم ہاؤس روانہ ہوئے۔

جب ہماری گاڑ اِں فارم ہاؤس کے سامنے رکیں، کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ گیٹ پر ہر وقت دو باوردی گارڈز موجود رہتے تھے اور جواب نہیں تھے۔ جلالی صاحب کے ڈرائیور رشید نے تین چار بار شیورلیٹ کا ہارن دیا لیکن گیٹ نہیں کھولا گیا۔ پھر گارڈز جیپ سے اترے، انہوں نے گیٹ کھٹکھٹایا اور آوازیں دیں۔ کافی تاخیر سے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک گارڈ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر سب بری طرح چونک گئے۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہوئی تھی اور ایک ٹانگ بھی بری طرح گھائل تھی۔ دروازہ کھولنے کے عد وہ وہیں لڑکھڑا کر گر گیا۔ سب گاڑیوں سے اترے اور اس کی طرف لپکے۔ ڈاکٹر مہناز پیش پیش تھی۔ ندیم نے زخمی کو سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ مدھم آواز میں بولا۔ ''انہوں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ بہت ساروں کو زخمی کر دیا، کچھ کو مار ڈالا۔ ہم نے بڑی کوشش کی...... مم...... مگر......'' اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ اس کی گردن سے خون بہنے لگا۔ تب ہم نے دیکھا کہ اس کی گردن میں بھی گولی لگی ہوئی تھی۔ یہ گولی اس کی گردن کے سائڈ مسلز کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ شاید اسی لئے وہ زندہ تھا۔

ہم اسے چھوڑ کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف لپکے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چُور تھے، ہر طرف کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمروں کے اندر تکیے پھٹے ہوئے اور گدے ادھڑے ہوئے تھے۔ قالین الٹ پلٹ کر دیئے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی کے ایک ایک انچ کی تلاشی لی گئی ہے اور یقیناً یہ کام دو چار بندوں کا نہیں تھا۔ یہاں کئی درجن افراد نے ہلا بولا تھا۔

''یار! کہیں ہماری چوری تو نہ پکڑی گئی ہو؟'' عمران نے میرے کان میں سرسراتی سرگوشی کی۔

ہم چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف لپکے۔ ڈرائنگ روم کے عین سامنے ایک ملازمہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر پر کسی وزنی شے سے بڑی کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ اس کے کھچڑی بال خون سے رنگین ہو رہے تھے۔ چھوٹے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ صوفے اور میز الٹے پڑے تھے۔ ہر طرف تباہی کا منظر تھا۔ جس سینٹر ٹیبل کے نیچے ''ڈکٹا فون'' نصب کیا گیا تھا، وہ بھی الٹی پڑی تھی۔ تاہم ڈکٹا فون محفوظ تھا۔ دراصل عمران نے اسے اس طریقے سے نصب کیا تھا کہ وہ لکڑی کے ایک دو انچ موٹے کالر کے پیچھے آ گیا تھا۔ میز الٹنے کے باوجود کسی کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ عمران نے میز کو سیدھا کر دیا۔ یکا یک رونے چلانے کی آوازیں

آئیں۔ہم ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف آئے۔ یہاں کا منظر دہلا دینے والا تھا۔نوجوان گارڈ مشتاق کی لاش سیڑھیوں کے آغاز میں پڑی تھی۔وہ شلوار قمیص میں تھا۔اس کے ہاتھوں پر ہلکی سی مہندی بھی نظر آ رہی تھی۔میری معلومات کے مطابق مشتاق نامی اس گارڈ کی شادی پانچ چھ ہفتے پہلے ہی ہوئی تھی۔مشتاق کو دیکھ کر ہی پتا چل گیا کہ وہ اپنی زندگی کا سفر پورا کر چکا ہے۔یوں لگتا تھا کہ اسے سیڑھیوں کے اوپر سے دھکا دیا گیا ہے اس کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور شاید رخسار کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی۔اس کی خون آلود چپل اس کے قریب ہی پڑی تھی۔دو عورتیں اس کی لاش پر بین کر رہی تھیں۔یہ مشتاق کی قریبی رشتے دار ہی تھیں۔

بڑے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ایک دیوار پر جلالی صاحب اور ان کے تین چار بزرگوں کی فریم شدہ تصویریں آویزاں تھیں۔ان ساری تصویروں پر رائفل کی گولیاں برسائی گئی تھیں اور انہیں چکنا چور کر دیا گیا تھا۔

سیکرٹری ندیم نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلالی صاحب یہ سارے اندوہناک مناظر دیکھیں اور اپنی حالت بگاڑ لیں۔وہ انہیں فوراً لفٹ کے ذریعے فرسٹ فلور کے ایک کمرے میں لے گیا۔ڈاکٹر مہناز اور لائبہ زخمیوں کی طرف متوجہ تھیں اور انہیں ابتدائی طبی امداد دے رہی تھیں۔شدید زخمیوں کو لاہور منتقل کرنے کے لئے انہیں پورچ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ابھی تک صرف ایک لاش ملی تھی مگر زخمی ہونے والے زیادہ تھے۔

ندیم دانش مندی کا مظاہرہ کر کے جلالی صاحب کو اوپر والے ایک علیحدہ کمرے میں تو لے گیا تھا مگر جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی اس کی یہ کوشش بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ جب ہم اوپر پہنچے تو جلالی صاحب کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور وہ ندیم سے بار بار پوچھ رہے تھے۔''کیا کوئی اور بھی زخمی ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ، کسی کی جان تو نہیں گئی؟ تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔تم مجھے نیچے جانے دو۔''

''سر! سب ٹھیک ہے۔چار پانچ بندوں کو چوٹیں آئی ہیں۔دونوں ڈاکٹرز ان کی مرہم پٹی کر رہی ہیں۔آپ پریشان نہ ہوں۔''

وہ دہاڑے۔''تم کہہ رہے ہو چوٹیں آئی ہیں۔وہ گارڈ اشرف تو آخری سانسیں لے رہا ہے۔''

''اشرف کے سوا کسی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا جناب۔زخم ضرور لگے ہیں لیکن خطرے کی بات نہیں۔''

وہ مختلف ملازموں کے نام لے کر ان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ندیم اور ڈرائیور رشید گول مول جواب دیتے رہے۔پھر جلالی صاحب اپنے پالتو جانوروں کے بارے میں پوچھنے لگے۔انہیں زیادہ پریشانی ایرانی بلیوں کی طرف سے تھی۔عمران نے انہیں بتایا کہ دیگر جانوروں کی طرح بلیاں بھی بالکل محفوظ ہیں۔اس نے جلالی صاحب کو بتایا کہ کل رات جانے سے پہلے وہ چاروں بلیوں کو حفاظت کی غرض سے بالائی منزل کے پنجرے میں چھوڑ گیا تھا۔وہ بالکل خیریت سے ہیں۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے اٹھک پٹخ کی آوازیں آنے لگیں۔یوں لگا جیسے کوئی بند دروازے کو دھکے دے رہا ہے یا ٹھوکریں مار رہا ہے۔اس کے ساتھ ''اُوں اُوں'' کی منہ بند صدائیں بھی سنائی دیں۔''یہ کیا ہے؟ یہ تو کوئی عورت ہے۔'' جلالی صاحب نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔دروازہ کھولا تو آنکھیں بند کرنا پڑیں۔جلالی صاحب کی دو جوان ملازمائیں رخشی اور زرینہ بالکل برہنہ حالت میں موجود تھیں۔ان کے ہاتھ پاؤں ٹیلی فون کے تار سے باندھے گئے تھے اور نیلگوں نشان ان کے جسموں پر نظر آ رہے تھے۔انہیں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ہم نے فوراً ان کے جسموں پر چادریں ڈال دیں۔رخشی تو نیم بے ہوش تھی۔وہ قالین پر کھڑکی کے قریب پڑی تھی۔یہ زرینہ ہی تھی جس نے بند دروازے کو ٹانگیں رسید کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے گئے تھے۔کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، شراب کے پوے اور کٹے پھٹے زنانہ لباس پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔

زرینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اس کے گندمی چہرے اور گردن پر گہری خراشیں نظر آ رہی تھیں۔عمران نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔وہ بلکی۔''انہوں نے ہمیں برباد کر دیا۔کہیں کا نہیں چھوڑا۔یااللہ مجھے موت آ جائے۔میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔'' زرینہ کی آہ و بکا دل دوز تھی۔

''کون تھے وہ؟'' عمران نے زرینہ کا سر گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ان کتوں نے اپنے منہ کپڑوں اور ٹوپیوں میں چھپا رکھے تھے۔ایک دوسرے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔وہ ساری رات یہاں کمرے میں رہے ہیں۔میرے کاکے کو دیکھو، زندہ بھی ہے یا نہیں۔خدا کے لئے اس کو دیکھو۔'' اس نے اپنے چہرے کی مدد سے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک چھوٹی چارپائی پر ایک کھیس سا پڑا تھا۔ اس کے نیچے کچھ تھا۔ چھوٹا سا ایک بچہ۔ میں نے کھیس اٹھایا۔ قریباً ایک سالہ بچہ بالکل ساکت پڑا تھا۔ بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ وہ زندہ تھا لیکن نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ میرے زور سے جھنجوڑنے کے باوجود جاگا نہ رویا۔ اس کے ادھ کھلے منہ سے کسی دوا کی تیز بو آ رہی تھی۔ پھر میری نگاہ اس دوا پر پڑی۔ یہ کھانسی کا ایک نہایت تیز اثر شربت تھا۔ بالغ شخص بھی اس کے دو چمچ پی کر چار پانچ گھنٹے کے لئے انٹاغفیل ہوسکتا تھا۔ بچے کو غالباً زیادہ مقدار میں یہ شربت پلا دیا گیا تھا۔

میں نے باہر جا کر اسے ڈاکٹر لائبہ کے حوالے کیا۔ وہ اسے فوراً طبی امداد دینے میں مصروف ہوگئی۔ کمرے میں واپس آیا تو زرینہ کے ہاتھ کھولے جا چکے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک چادر سی تان دی گئی تھی اور ہمارے ساتھ پکنک پر جانے والی دو ملازمائیں زرینہ اور بے ہوش رخشی کو کپڑے وغیرہ پہنا رہی تھیں۔ زرینہ کی آہ وزاری جاری تھی۔ اس کی اپنی حالت بھی بُری تھی لیکن اسے زیادہ فکر اپنے بچے کی تھی۔

میں نے آواز دے کر اسے بتایا۔ ''زرینہ! تیرا بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر لائبہ نے اسے ٹیکا لگایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں جاگ جائے گا۔ کچھ نہیں ہوا اسے۔''

دونوں ملازماؤں کی حالت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کئی شرابی مردوں نے ان کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا ہے اور دیر تک اس کمرے میں رہ کر اپنے چہروں پر گناہ اور نحوست کی کالک ملتے رہے ہیں۔

رخشی کی حالت زیادہ بری تھی۔ اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ گاہے بگاہے عجیب انداز سے کراہ اٹھتی تھی۔

عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''تابی! مجھے تو لگتا ہے، یہ سب کچھ ٹریکٹر ڈرائیور اور مخبر مختار ملک کا بدلہ لینے کے لئے کیا گیا ہے۔''

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟''

''مشتاق کی لاش سے۔'' عمران نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ لاش عین اس جگہ پڑی ہے جہاں تم نے مختار ملک کو مارنے کے بعد ڈالا تھا۔'' میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ قابلِ غور بات تھی۔

مشتاق کا چھوٹا بھائی اعجاز بھی زخمی ہوا تھا۔ اسے اس کے ایک ساتھی سمیت غسل خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ان دونوں کی گھڑیاں، موبائل

اور نقدی وغیرہ سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ تھپڑوں کے نشان ابھی تک ان دونوں کے چہروں پر واضح تھے۔ ان کے تین دیگر زخمی ساتھی بھی ایک غسل خانے کا تالا توڑ کر نکالے گئے۔ اعجاز نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی تین درجن بندے تھے۔ ڈکیتوں کی طرح ان سب نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے۔ ایک لمبے قد کے بندے کے سوا وہ سب پنجابی بولتے تھے۔ لمبے قد والا پٹھانی اردو بولتا تھا۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی سب سے پہلے مین گیٹ کے گارڈز کو بے بس کیا۔ جس نے بھی ان کو روکنا چاہا، اس کی ٹانگوں پر گولیاں ماریں اور ناکارہ کر دیا۔ جب انہوں نے زرینہ سے اس کا بچہ چھینا اور اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی تو بھائی مشتاق ان کے سامنے آ گیا۔ اس نے چاقو چلایا جس سے ان کے دو بندے پھٹڑ (زخمی) ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے بھائی کو پکڑ لیا اور بڑی بیدردی سے مارا۔ بابے طفیل نے بھائی کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس کی داڑھی کھینچی گئی اور اس کی عمر کی پروا کئے بغیر اسے فرش پر لٹا کر جانوروں کی طرح مارا گیا۔ بھائی ادھ موا ہو کر گر گیا تو ان کا سرغنہ بولا...... خو، اسے پار کر دو۔ وہیں پہنچا دو جہاں امارا ساتھی گیا ہے۔'' ہم سمجھتے تھے کہ وہ بھائی کو گولی مارنے لگے ہیں۔ لیکن وہ اسے سیڑھیوں پر لے گئے۔ غسل خانے کی کھڑکی میں سے ہم کو سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بھائی آخر تک خود کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ انہوں نے اسے پندرہ سیڑھیوں سے نیچے پکے فرش پر پھینک دیا۔ وہ اسے سر کے بل گرانا چاہتے تھے مگر وہ کندھوں کے بل گرا۔ انہوں نے نیچے جا کر دیکھا۔ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ اوکھے اوکھے سانس لے رہا تھا۔ وہ ظالم اسے اٹھا کر پھر اوپر لائے۔ پھر اسی طرح اسے اٹھا کر نیچے پھینکا۔ اس مرتبہ وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا رہا۔ شاید اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ میرے بھائی کو بڑی تکلیف دی ہے انہوں نے......'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اسی دوران میں مالی کے بیٹے امین نے ہمارے کان میں بتایا کہ کوٹھی کے پچھواڑے اور چڑیا گھر کی پچھلی طرف دور تک کھدائی کی گئی ہے اور وہاں مٹی کے ڈھیر پڑے ہیں۔ میں اور عمران کوٹھی کی چھت پر گئے۔ فتح محمد اور ندیم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ امین کی بات درست تھی۔ کوٹھی کے پچھواڑے اور شمال کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کئی جگہ کھدائی کی گئی تھی۔ یہ کھدائی باقاعدہ ''ڈگنگ مشین'' کے ذریعے ہوئی تھی۔ مشین کے بڑے بڑے ٹائروں کے نشان بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔

ندیم نے طویل سانس لی اور کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ یہ اسی موٹے ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کی کارستانی ہے۔ ان میں مرجان خان نام کا ایک لمبے قد کا بدمعاش بھی تھا۔ وہ

پٹھانی لہجے میں اردو بولتا ہے۔"

"یہ ریان ولیم کون ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہ وہ دوسری پارٹی ہے جو باکس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ایک رات یہ لوگ بھی ہمارے بن بلائے مہمان بنے تھے۔ ریان کوئی غیر ملکی جواری ہے۔ بہت موٹا شخص ہے اور صرف انگریزی بول سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ دو تین مقامی بندے بھی لایا تھا۔ یہ لوگ بھی پہلے نرمی سے جلالی صاحب کو گھیرنے کی کوشش کرتے رہے پھر سختی پر اتر آئے۔ اس ریان نامی شخص نے جلالی صاحب کو دھمکی دی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ باکس کے لئے اس سارے فارم ہاؤس کو کھود کر رکھ دے گا۔" کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر ہم دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ سب سے اہم کام زخمیوں کو اسپتال پہنچانا تھا۔ ہم نیچے آئے اور اس سلسلے میں دیگر افراد کی مدد کی۔ ایک اسٹیشن وین، ایک ڈبل کیبن اور ایک جیپ اس کام کے لئے استعمال کی گئی۔ پانچ بندے ایسے تھے جن کی ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں۔ چھٹا شخص شدید زخمی تھا یہ وہی گارڈ اشرف علی تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ دو عورتیں بھی شدید زخمی تھیں۔ ان میں سے ایک تو رخشی ہی تھی جسے زرینہ کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت بھی درست نہیں لگ رہی تھی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ بار بار عجیب انداز میں بڑبڑانے لگتی تھی۔

کوٹھی اور فارم ہاؤس میں عام طور پر چالیس پینتالیس ملازم ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ ان میں سے بیس پچیس تو گارڈز ہی تھے۔ لیکن واردات کے وقت کچھ لوگ تو ہمارے ساتھ نہر کے کنارے خیموں میں موجود تھے اور کچھ چھٹیوں کی وجہ سے غیر حاضر تھے۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس واردات کی وجہ سے زیادہ جانی نقصان ہوتا۔ سیکرٹری ندیم نے جلالی صاحب کو بتائے بغیر ہی پولیس کو فون کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کوٹھی میں ایک لاش بھی موجود تھی اور اس کی فوری رپورٹ کرنا ضروری تھی۔ اس دوران میں عمران نے باریک بینی سے مختلف شواہد اکٹھے کئے، میں بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے عمران کی توجہ نیم بے ہوش رخشی کے ایک ہاتھ کی طرف دلائی۔ ناخنوں میں گوشت کے باریک ریزے سے پھنسے ہوئے تھے جیسے اس نے خود پر حملہ کرنے والے کو نوچا ہو۔ دوسری ملازمہ زرینہ نے روتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ رخشی نے زیر ہونے سے پہلے لمبے قد والے پٹھان کی سخت مزاحمت کی تھی۔ جواباً اس شخص نے بھی رخشی کو اپنا خصوصی نشانہ بنایا تھا۔ رخشی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی تقریباً ساری ذمے داری اسی شخص پر آتی تھی۔

آدھے گھنٹے میں پولیس جیپ سائرن بجاتی کوٹھی میں پہنچ گئی مقامی ایس ایچ او چوڑے جبڑوں اور موٹی توند والا ایک روایتی سا تھانیدار تھا۔ سب سے پہلے تو جلالی صاحب نے اس کی کلاس لی۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں۔ بولے۔"تم زنانے بن کر تھانے میں گھسے رہتے ہو کھڑکی کے پیچھے سے وارداتیں ہوتی دیکھتے ہو اور جب سب کچھ ہو جاتا ہے تو توندیں مٹکاتے پہنچ جاتے ہو۔ یہ چور، ڈاکو تمہارے بھائی بند ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

ندیم اور ڈاکٹر مہناز وغیرہ نے بمشکل جلالی صاحب کو سنبھالا لیکن وہ بدستور طیش میں تھے۔ فتح محمد تھانیدار اکرام خان کو ایک طرف لے گیا اور کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتا رہا مجھے کئی دفعہ فتح محمد پر عجیب سا شبہ ہوتا تھا۔ یہ شخص دوسرے ملازموں سے کچھ الگ تھلگ سا تھا۔ ایک طرح سے اس کی حیثیت انچارج گارڈ کی تھی مگر وہ ڈیوٹی پر کم ہی نظر آتا تھا۔ کسی وقت شک ہوتا تھا کہ شاید اس رات جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے اردگرد گھومنے والا اور پھر مڈگارڈ کے اندر "ٹریکر" چپکانے والا یہ فتح محمد ہی تھا موقع پر اس کے گرگابی نما جوتے کے نشان بھی موجود تھے پھر جب میں جلالی صاحب کو روکنے کے لئے جیپ کے پیچھے بھاگا تھا تو سب سے پہلے میرے راستے میں آنے والا یہ فتح محمد ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ کل رات ہونے والی خونی واردات میں بھی اس شخص کا کردار ہو۔ اسی نے حملہ آوروں تک اطلاع پہنچائی ہو کہ جلالی صاحب رات نہر کے کنارے گزاریں گے اور کوٹھی کے اندر کی دیگر معلومات بھی اسی نے دی ہوں۔

بہرحال، ایک بات تو طے تھی کہ کوٹھی اور فارم ہاؤس میں ایک دو افراد اب بھی ایسے موجود ہیں جو اندر کی خبریں باہر دے رہے ہیں اور باہر والوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر بعد پتا چلا کہ جلالی صاحب کے جلال سے بچنے کے لئے تھانیدار اکرام خان واپس چلا گیا ہے اور اب کوئی اعلیٰ افسر ہی جلالی صاحب کو مطمئن کرنے کے لئے لاہور سے آئے گا۔ یہ افسر دو گاڑیوں کے ساتھ قریباً ایک گھنٹے میں پہنچ گیا اور یہ وہی حمزہ صاحب تھے جن کی حیثیت جلالی صاحب کے پرانے دوست اور پرستار کی سی تھی۔ اعلیٰ سطح پر جلالی صاحب کا ایک حلقۂ احباب تھا۔ جلالی باقاعدہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے۔ جنگلی حیات کے تحفظ پر لکھے ہوئے ان کے ریسرچ مقالے نے ماضی میں کافی شہرت پائی تھی۔ وہ امریکا میں وائلڈ لائف کی ایک ویلفیئر سوسائٹی کے بنیادی اور اہم رکن تھے۔ دس پندرہ برس پہلے تک جب ان کی صحت ٹھیک تھی، وہ اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے لئے امریکا اور کینیڈا وغیرہ

جاتے رہتے تھے۔انہیں بعض اوقات غیر ملکی یونیورسٹیوں میں لیکچر کے لئے بھی بلایا جاتا تھا۔

سہ پہر کے بعد جونہی موقع ملا، عمران نے موبائل فون پر ریان ولیم سے رابطہ کیا۔ میں بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ایسے رابطے کے وقت عمران موبائل کا اسپیکر آن کر لیتا تھا تا کہ میں بھی دوطرفہ گفتگو سن سکوں۔ عمران کے ذہن میں بھی یقیناً وہی سوال مچل رہا تھا جو میرے ذہن میں بھی موجود تھا۔ اگر واقعی کل رات ہونے والی خونی کارروائی ریان ولیم کے ایما پر ہوئی تھی تو پھر ہمیں اس سے بے خبر کیوں رکھا گیا؟ یہ تو کوئی بات نہیں تھی کہ ہم ریان ولیم کے لئے کام بھی کر رہے تھے اور اس کی منصوبہ بندی سے بھی لاعلم تھے۔ اس سے پہلے بھی ریان ولیم نے ہمیں آدھا سچ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے خود ''باکس'' میں دلچسپی نہیں بلکہ وہ کسی اور کے لئے اسے ڈھونڈنا چاہتا ہے۔

رابطہ ہونے پر عمران نے ریان ولیم کو کل رات کے واقعات کے بارے میں بتایا۔ ریان اور رچی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ان واقعات کے بارے میں جان چکے ہیں۔ بہرحال، ریان نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ اس کارروائی میں ان کا کوئی عمل دخل ہے۔

عمران نے کہا۔ ''سر! یہاں کچھ معاملات ہمیں الجھا رہے ہیں۔ اگر ہم اس الجھن میں رہے تو ہماری کارکردگی پر بھی اثر پڑے گا۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک دو باتوں کی وضاحت کر دیجئے۔''

''ہاں ہاں، پوچھو ایمران! برا لگنے کی کیا بات ہے؟''

''کیا آپ کے مقامی ساتھیوں میں کوئی مرجان خان نام کا شخص بھی ہے؟''

''تم اسے ساتھی تو نہیں کہہ سکتے، بہرحال میں گاہے بگاہے اس سے کام لے رہا ہوں۔ بے خوف شخص ہے۔ ہر کام میں کود پڑتا ہے۔''

''کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر ہی یہاں شیخوپورہ پہنچے اور کسی کام میں کود پڑے؟''

''نہیں، وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''سر! کل یہاں جو خونی واردات ہوئی ہے، اس میں کم وبیش تین درجن بندے شامل تھے۔ ان سب نے شروع سے آخر تک اپنے چہرے منڈاسوں اور ٹوپیوں میں چھپائے رکھے۔ ان کا سرغنہ ایک خاصے لمبے قد کا شخص تھا اور پٹھانی لہجے میں اردو بولتا تھا۔''

ریان ولیم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''اگر وہ شخص لمبے قد کا تھا اور خاص طرح

کی اردو بولتا تھا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ وہ مرجان خان ہوگا؟''

''میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں سر! میں نے تو وہ معلومات آپ تک پہنچائی ہیں جو مجھ تک پہنچیں۔ باقی آپ اس ساری صورتِ حال کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔''

''نہیں ایمران! اگر مرجان خان کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی شک ہے تو وہ نکال دو۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا اور نہ میں کسی کو ایسا کام کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میرے خیال میں تو کل رات جس نے بھی کارروائی کی ہے، اس نے حماقت کی ہے۔ ایسی کسی حماقت کا نتیجہ جلالی کے ہارٹ اٹیک یا اس کی موت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے اور اگر یہ بڈھا عدم آباد روانہ ہو گیا تو سمجھو سب کچھ چوپٹ ہو گیا۔''

''پھر آپ کے خیال میں یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں سر؟'' عمران نے پوچھا۔

''تمہیں بتایا تھا نا کہ کچھ اور لوگ بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں۔ یقیناً ان میں سے ہی کسی نے یہ حماقت فرمائی ہے۔''

''لیکن سر! یہاں کوٹھی میں مرجان خان کا نام لیا جا رہا ہے اور اس حوالے سے آپ کا نام بھی آ رہا ہے۔ پولیس تفتیش کا رخ آپ کی طرف مڑ سکتا ہے۔ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''میری طرف سے فکر نہ کرو ایمران! میں محفوظ جگہ پر ہوں...... مرجان خان بھی پچھلے کئی مہینے سے انڈر گراؤنڈ ہے۔ اس تک پہنچنا آسان نہیں۔ لیکن یہاں ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوسرے گروہ نے تفتیش کا رخ جان بوجھ کر غلط رخ پر موڑنے کی کوشش کی ہو۔ میرا مطلب اس لمبے قد اور پٹھانی لہجے والے شخص سے ہے۔''

''یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی آ رہا ہے سر! بہرحال آپ بھی اس بارے میں غور فرمائیں، کل پھر بات کریں گے۔''

کچھ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد بات چیت کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ عمران کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

O......❖......O

اگلے روز سہ پہر کے وقت عمران نے مجھے بتایا۔ ''لگتا ہے کہ ملازموں کی ہمت جواب دے گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''زیادہ تر ملازم کوٹھی چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کچھ جا بھی چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر لائبہ اور ڈرائیور رشید وغیرہ۔ مجھے لگتا ہے کل تک یہ ساری جگہ بھائیں بھائیں کرنے لگے گی۔''

''ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟''

''وہ رکی ہوئی ہے۔ صبح سے جلالی صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ مسلسل ان کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لائبہ کی جگہ کسی اور کو یہاں بلائے گی۔''

''پرسوں رات والی کارروائی کے بارے میں تم کسی نتیجے پر پہنچے ہو؟ یہ ریان اینڈ کمپنی کا کام ہے یا جاوا اینڈ کمپنی کا؟''

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ آج مبارک دن ہے۔ تم اچھے سوال کر رہے ہو...... دراصل ہم کل سے ایک نکتہ فراموش کر رہے ہیں۔ پرسوں رات کے واقعات سے اس بات کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ اس خونی کارروائی میں کسی حد تک انتقام کا جذبہ بھی شامل تھا اور وہ انتقام تھا مخبر مختار ملک کی موت کا۔ دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مختار ملک کا تعلق اپنے ریان ولیم صاحب سے نہیں تھا۔ کم از کم ریان صاحب نے تو یہی کہا تھا کہ مختار ملک کو وہ نہیں جانتے۔''

''ہاں، یہ پوائنٹ تو ہے لیکن یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ مختار کے بارے میں ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سچ بولا تھا؟''

''یار! میرا دل کہتا ہے کہ اس نے سچ بولا تھا۔ کم از کم اتنی سی رعایت تو دے دو میرے دل کو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''یعنی ہم پرسوں رات کی کارروائی کے لئے ریان ولیم کو اپنی ''تفتیش'' سے خارج فرما رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کی کارروائی تھی۔''

''جاوا خود تو بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ پرسوں والی کارروائی میں وہ خود تو شریک نہیں ہوا ہوگا۔ یہ اس کے ساتھیوں کا کام ہوگا۔''

''بات پھر وہیں آجاتی ہے۔ وہ پٹھانی لہجے میں اردو بولنے والا کون تھا؟''

''ہوسکتا ہے کہ ریان ولیم کا شک درست ہی ہو۔ جاوا گروپ نے تفتیش کا رخ غلط سمت موڑنے کے لئے یہ ''پٹھانی لہجے'' والا چکر چلایا ہو۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ یہ بے ہودہ اور سفاک کارروائی جاوا جیسے اکھڑ مزاج شخص کے ذہن میں ہی ترتیب پا سکتی ہے۔ جلالی صاحب ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح ہیں۔ اگر اس کارروائی کے صدمے سے یہ

دماغ گل ہو جاتا تو بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ جاوا کو بھی سر پیٹنا پڑتا۔''

''لیکن یار! اگر یہ جاوا کا کام ہے بھی تو اس نے جلالی صاحب کو براہِ راست تو نشانہ نہیں بنایا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر کارروائی کے لئے پرسوں کی رات چنی تھی۔ انہیں پتا تھا کہ جلالی صاحب خود یہاں موجود نہیں۔ غالباً انہوں نے جلالی صاحب کو صرف ڈرایا ہے اور ان پر دباؤ بڑھایا ہے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن جلالی صاحب کتنا دباؤ برداشت کر سکتے ہیں، یہ بھی تو کنفرم نہیں۔ ایسے شخص کا پٹاکا کسی بھی وقت بول سکتا ہے۔ پٹاکا سمجھتے ہو نا تم؟''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری وہ سیڑھیوں والی تھیوری بھی درست ہی لگتی ہے۔ کارروائی کرنے والوں نے گارڈ مشتاق کو جان بوجھ کر دوبار سیڑھیوں سے گرایا اور جان سے مارا۔ وہ ہمیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ مختار ملک اتفاقاً نہیں گرا تھا، اسے قتل کر کے وہاں سے پھینکا گیا تھا یا وہاں ڈالا گیا تھا۔''

عمران بولا۔ ''اب وہ سیڑھیاں خوف کا ٹریڈ مارک بن گئی ہیں۔ کچھ ملازم انہیں پُراسرار رنگ دے رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہاں سے بھاگنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ان سیڑھیوں کے خوف سے فرار ہوئے ہیں۔ ابھی یہاں آتے ہوئے میں نے دیکھا ہے کہ سیڑھیوں کی طرف والا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہاں زینوں پر تلسی کے پتے بکھیرے گئے ہیں اور ریلنگ کے ساتھ دو تعویذ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کارروائی بابے طفیل یا اس کی بیوی کی ہے۔''

''لیکن عمران! یہ سیڑھیوں والا چکر تو کافی پہلے کا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ باکس والے معاملے سے چند مہینے پہلے بھی یہاں کے ملازم ان سیڑھیوں سے خوف کھاتے تھے۔ ندیم نے خود مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ سب سے پہلے یہاں جلالی صاحب کا ایک لاڈلا طوطا مردہ پایا گیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چلا کہ وہ اپنے پنجرے سے کیسے نکلا اور کیسے یہاں پہنچ کر ختم ہوا۔ پھر وہ مہمان کے گرنے والا واقعہ ہوا جس میں وہ اپنی یادداشت بالکل کھو بیٹھا اور ابھی تک اسی حالت میں ہے...... دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ملازموں نے ان سیڑھیوں پر خون کے باریک باریک چھینٹے دیکھے، جیسے کوئی پھوار پڑی ہو۔ رات کے وقت سیڑھیوں سے ایسی آوازیں سنی جاتی ہیں جیسے کوئی بھاری بھرکم شخص ٹھہر ٹھہر کر اتر رہا ہو۔ اب یہ اوپر نیچے دو اموات ہوگئی ہیں یہاں۔''

''یہ تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو تابش! ہمارے دیہی علاقوں میں ایسی سیڑھیاں،

ایسی چھتیں، ایسے تالاب اور درخت ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ان سے کہانیاں وابستہ کی جاتی ہیں اور پھر انہیں بڑھایا چڑھایا جاتا ہے۔ یہ سادہ لوح لوگوں کے اندر کے وہم ہی تو ہوتے ہیں۔ بعض اوقات عیار لوگ اس کمزوری کو اپنے کسی مقصد کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں جارج اور حکم جی کی ایک اہم کارستانی تو یاد ہوگی...... وہ اپنے قیدیوں کے جسموں میں ''الیکٹرانک چپ'' نصب کرتے تھے اور پھر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ قیدی آزاد ہو کر بھی حکم کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتا۔''

''لیکن ایک بات تو ہے عمران! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم اپنی سائنس کے پیمانے پر نہیں تول سکتے۔ خود سائنس بھی یہ مانتی ہے کہ بہت کچھ ابھی انسان کے ذہن اور نظر سے اوجھل ہے۔''

''میں اس کو مانتا ہوں لیکن وہم اور ماورا میں بہت فرق ہے جگر...... جوں جوں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، وہم سکڑتا جاتا ہے اور ماورا کے لئے اس کی جستجو بڑھتی جاتی ہے۔ ہپناٹزم، مسمریزم، ٹیلی پیتھی، مستقبل بینی...... پہلے یہ ماورا تھے، اب یہ سارے علوم ہیں۔''

''اچھا علامہ صاحب! اب یہ فرمایئے کہ ہمیں یہاں سے بھاگنا ہے یا ٹکنا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ مبارک گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اب تم نے پھر بے وقوفی کی باتیں شروع کر دی ہیں۔ بھئی، ہم نے ریان ولیم صاحب سے ایڈوانس پکڑا ہوا ہے...... کمٹمنٹ کی ہوئی ہے۔ اب ہم اس کام کو رستے میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ کام پورا کریں گے تو باقی پیسے بھی ملیں گے اور پیسے ملیں گے تو نصرت کا علاج اچھے طریقے سے ہو سکے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تم نے یہ سوال بس برائے سوال ہی پوچھا ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہم بھاگنے والے ہیں، نہ جھکنے والے، نہ بکنے والے...... نہ ٹکنے والے۔''

''یہ ''ٹکنے والے'' کیوں شامل کر دیا؟''

''بھئی، سیاست میں کوئی بات بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ہر نعرے میں بچاؤ کا کوئی راستہ کھلا رکھنا چاہئے۔''

گفتگو مذاق کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''یار! تم عجیب گھن چکر ہو۔ ایک طرف تو اڑیل سے اڑیل اور غصیلے سے غصیلے جانور کو رام کر لیتے ہو، دوسری طرف جلالی صاحب کے ساتھ کچھ نہیں کر پا رہے۔''

''تم جلالی صاحب کو اڑیل جانور سے ملا رہے ہو۔ تمہارے ستارے گردش میں ہیں۔ اپنے اس ''طرزِ کلام'' کی وجہ سے تم نے عنقریب جلالی صاحب کے ہاتھوں مرحوم ہو جانا

ہے۔''

''تو اس سے پہلے کچھ کر گزرو نا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہو چلے ہیں لیکن ابھی تک کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔''

اس کی کشادہ پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''میرے خیال میں سرا ہاتھ آیا ہے اور تمہارے ہاتھ ہی آیا ہے لیکن تم غور نہیں کر رہے۔ ہم ایک ایسے پوائنٹ تک پہنچ چکے ہیں جو یہاں کسی کی نظر میں نہیں۔''

''کس پوائنٹ کی بات کر رہے ہو؟''

''جلالی صاحب اور مہناز کی وہی گفتگو جو منگل کے روز تم نے مائیکروفون پر سنی ہے۔ جلالی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر مہناز کا تعلق بظاہر تو اس کوٹھی کے رواج کے مطابق عام ہی نظر آتا ہے لیکن وہ تھوڑا سا مختلف ہو چکا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود عزت مآب جلالی صاحب کے دل میں اس نرم و نازک ڈاکٹر مہناز کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ گوشہ وسیع ہو رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی وہ اہم پوائنٹ ہے جو ہمیں غیر متوقع فائدہ پہنچا سکتا ہے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ گوشہ فائدہ پہنچائے گا؟''

''اس کا دار و مدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اس گوشے کے بارے میں کسی دوسرے کو پتا نہ چلے اور دوسرا یہ کہ یہ گوشہ واقعی وسیع ہو جائے۔ اگر ہم......''

بات کرتے کرتے اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ کھانسی کی آواز سے اندازہ ہوا کہ جلالی صاحب اِدھر تشریف لا رہے ہیں۔ عمران نے جلدی سے سگریٹ بجھایا۔ جلالی صاحب کی آمد پر ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان کا رنگ معمول سے زیادہ زرد نظر آ رہا تھا۔ ''بیٹھو بیٹھو۔'' جلالی صاحب نے کہا اور پھر ہمارے پاس ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے ہمیں یہ افسوس ناک اطلاع دی کہ زخمی گارڈ اشرف جانبر نہیں ہو سکا۔ اس کی میت لاہور سے اس کے آبائی علاقے ایمن آباد پہنچا دی گئی ہے۔ یہ واقعی دل گرفتہ کرنے والی اطلاع تھی۔

جلالی صاحب نے دوسری اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''گارڈ مشتاق کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی ہے۔ اس کے جسم پر ایسے نشان ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سیڑھیوں سے گرانے سے پہلے بھی اسے بیدردی سے مارا پیٹا گیا تھا۔ اس کی ایک ران کا گوشت اندر سے پھٹا ہوا ہے اور پیٹھ پر ٹھڈوں کے نشان ہیں۔ مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ یہ اسی سفید کتے کی

کارستانی ہے۔ وہ موٹا سؤر...... اس نے خطرناک دھمکیاں دی تھیں۔ وہ لمبے قد والا قبائلی بدمعاش بھی اس کے ساتھ تھا۔'' جلالی صاحب نے بے حد مغموم لہجے میں کہا۔ وہ کافی پریشان تھے۔موٹے سؤر سے ان کی مراد ریان ولیم ہی تھا۔

جن لوگوں سے وہ مشورہ وغیرہ کرتے تھے، ان میں سے کئی ایک انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آج یہاں اس کمرے میں بیٹھے ہم سے دکھ سکھ بیان کر رہے تھے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی انہیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ گئی۔ جلالی صاحب کے اشارے پر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اور عمران بھی مؤدب بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔''ابھی ندیم کا فون آیا ہے سر...... اس نے کہا ہے کہ دوسرے قتل کی ایف آئی آر بھی درج ہو گئی ہے۔ مشتبہ افراد میں انگلینڈ کے شہری ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔ دوسری طرف جاوا اور دُرِ شہوار وغیرہ کا نام بھی شامل ہے۔ پولیس ان لوگوں کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی ہے۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔'' جلالی صاحب نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔''یہ گھسے پٹے فقرے بہت سن رکھے ہیں ہم نے۔ ہماری پولیس تو صرف شرفا کی پگڑیاں اچھالنے کے لئے ہے۔ مجرموں کے ساتھ ان کے یارانے ہوتے ہیں۔ مجھے بہت کم امید ہے ان کی طرف سے کسی اچھی خبر کی...... باقی جہاں تک اپنی حفاظت کا تعلق ہے، یہ اب میں خود کروں گا۔ اس فارم کے ایک ایک انچ پر بہترین گارڈز کھڑے کر دوں گا۔ وہ جدید اسلحے سے لیس ہوں گے۔ دس پندرہ دن تک کوٹھی کی چھت پر واچ ٹاور بھی مکمل ہو جائے گا۔ وہاں سے فارم کے اردگرد چار پانچ کلومیٹر تک نظر رکھی جا سکے گی۔''

مہناز نے ہمت کر کے کہا۔''لیکن سر! ان قاتلوں کو بھی تو پکڑنا ہے جنہوں نے دو جانیں لیں۔ دو عورتوں کو بے آبرو کیا۔ درجن بھر افراد کو بری طرح زخمی کیا۔ پورے فارم میں توڑ پھوڑ کر کے کروڑوں کا نقصان کیا۔ ایرانی بلیوں کو......''

مہناز کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ عمران نے ٹھوکا دے کر مہناز کو فقرہ پورا کرنے سے روکا تھا۔ جلالی صاحب نے غالباً آخری الفاظ سنے ہی نہیں اس لئے انہوں نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

عمران نے مہناز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔''جی ہاں، حملہ آوروں کا کھوج لگنا ضروری ہے۔ ورنہ ان کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔''

''یہ سب بھی ہو گا...... ضرور ہو گا۔'' جلالی صاحب نے وجدانی انداز میں سر ہلایا۔ ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ ڈاکٹر مہناز سمجھ گئی کہ اگر یہ موضوع تھوڑی دیر مزید چلا تو جلالی صاحب کا بلڈ پریشر شوٹ کر جائے گا۔ اس نے فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا۔ وہ جلالی صاحب کو یہ بتانے میں مصروف ہو گئی کہ ڈاکٹر لائبہ کی جگہ کسی ڈاکٹر کا انتظام کر رہی ہے۔ اس طرح کی کچھ مزید حوصلہ افزا باتیں بھی اس نے جلالی صاحب کے سامنے کیں۔

اگلے روز صبح سویرے موقع ملا تو میں نے عمران سے کل والی گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب ڈاکٹر مہناز، جلالی صاحب کے سامنے ایرانی بلیوں کا ذکر کرنے لگی تھی تو اس نے مہناز کو روک کیوں دیا تھا؟

وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر مدھم آواز میں بولا۔''تم ان بلیوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں، بس یہ سنا تھا کہ تم جلالی صاحب کو واردات کے روز بتا رہے تھے کہ بلیوں کو حفاظت کی غرض سے کسی بالائی منزل کے پنجرے میں رکھا گیا ہے۔''

''وہ غلط بات تھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔''بلیاں اوپر والے پنجرے میں نہیں ہیں۔ اوپر والے پنجرے کا ذکر میں نے صرف اس لئے کیا تھا کہ جلالی صاحب دو منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا نہیں سکتے...... بلیاں مر چکی ہیں۔''

''مر چکی ہیں؟''

''ہاں، یہ خونی واقعہ بھی ان واقعات میں شامل ہے جو بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں ہوئے۔''

''چاروں بلیاں؟'' میں نے سخت تحیر کے عالم میں پوچھا۔

''ہاں چاروں ہی۔ ان خبیثوں نے ان پر افریقن جنگلی کتے چھوڑ دیئے۔ جنگلی کتوں کا بڑا پنجرہ بلیوں والے پنجرے کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے دونوں پنجروں کی درمیانی رکاوٹ ہٹا دی۔ آٹھ عدد خونخوار کتوں کے گروہ نے منٹوں میں بلیوں کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ یہ بڑے ظالم کتے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے چرندے درندے پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اپنے شکار کو زندہ حالت میں ہی پھاڑنا اور کھانا شروع کر دیتے ہیں۔''

''اوہ گاڈ۔'' میں نے سر پکڑ لیا۔ وہ بڑی قیمتی اور نایاب بلیاں تھیں۔ جلالی صاحب کو ان سے خاص اُنس تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے وہ نہایت سفاک تماشا دیکھا۔ کالے دھبوں والے وہ خوفناک جنگلی کتے نرم و نازک بلیوں پر جھپٹ رہے تھے۔ انہیں چیر پھاڑ رہے تھے۔

حملہ آوروں نے بدھ کی رات اس فارم ہاؤس میں جو درندگی دکھائی، وہ ''یادگار'' تھی۔
اب اس درندگی میں ان بلیوں والے واقعے کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ بے مثل سفاکی تھی۔ جہاں بے گناہ ملازماؤں کی عصمت دری کی گئی تھی، وہاں بے زبان جانوروں کو بھی معاف نہیں کیا گیا تھا۔ دو افراد جان سے گئے اور ایک درجن کے قریب بے طرح گھائل ہوئے اور پولیس ابھی تک صرف ''چھاپے'' ہی مار رہی تھی۔ میرے خیال میں عمران نے اچھا ہی کیا تھا جو جلالی صاحب کو بلیوں والے واقعے سے ابھی تک بے خبر رکھا تھا۔ یہ اطلاع ان کے صدمے کو شدید تر کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ آج کل میرے ذہن میں رہ رہ کر ابرار صدیقی کا خیال بھی آ رہا تھا۔ اگر اس چاندنی رات میں واقعی اسی نے لکڑی کا باکس جھاڑیوں میں پھینکا تھا تو پھر وہ اس کی کھوج میں واپس کیوں نہیں آیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اس بھاگ دوڑ میں کہیں مارا ہی گیا ہو؟

مشتاق کی دردناک موت اور دیگر سنگین واقعات کو اب چوتھا روز تھا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس پر عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ بھاگ جانے والے ملازموں کا خلا پُر کرنے کے لئے جلالی صاحب کافی کوشش کر رہے تھے پھر بھی وہ پانچ چھ افراد سے زیادہ کا انتظام نہیں کر پائے تھے۔ درحقیقت یہاں رُونما ہونے والے واقعات نے اردگرد کے سارے علاقے میں ہراس پھیلا دیا تھا اور فارم ہاؤس کے لئے زیادہ تر ملازم آس پاس ہی سے مہیا ہوتے تھے۔

ہاں، جلالی صاحب ایک اچھی سکیورٹی کمپنی سے معاملہ طے کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کمپنی نے جدید اسلحے سے لیس کم و بیش چالیس گارڈز فارم ہاؤس کو مہیا کر دیئے تھے۔ ان گارڈز نے بارہ بارہ گھنٹے کی دو شفٹوں میں فارم ہاؤس کی نگہبانی کرنا تھی۔ ان لوگوں کے پاس واکی ٹاکی، سرچ لائٹس، دو پیٹرولنگ گاڑیاں اور اس طرح کی دیگر سہولتیں موجود تھیں۔ اب جلالی صاحب اپنی ذاتی حفاظت کی طرف سے بھی چوکس ہو گئے تھے۔ پچھلے دنوں میں وہ صرف ایک بار فارم سے باہر گئے تھے۔ اس موقع پر گارڈز کی ایک گاڑی اور دو موٹر سائیکل سواران کی شیورلیٹ کے ساتھ موجود رہے تھے۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کے ذہن میں کچھ پک رہا ہے۔ وہ ظلم برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا اور یہاں ظلم ہوا تھا۔ خاص طور سے دو بے بس عورتوں کو ایک ہی کمرے میں رات بھر بے آبرو کرنے والا واقعہ عمران کے ذہن کو مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ میں بھی اپنے طور پر بہت ذہنی بوجھ محسوس کرتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ بدھ کی رات جو خونی واردات ہوئی، اس کی شروعات میری طرف سے ہی ہوئی تھی۔ مختار ملک سے میری لڑائی ہوئی اور وہ آناً فاناً مارا

گیا۔ حملہ آوروں نے یہاں جو کچھ کیا، اس میں یقیناً مختار ملک کی موت کا غم و غصہ بھی شامل تھا۔

عمران اور میں اب بھی علیحدہ علیحدہ کمرے میں سوتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے عمران نے مجھے فون کیا۔ ''تابی! تیار ہو جاؤ، کل ہمیں کہیں جانا ہے۔''

''کہاں؟''

''وہ کام کرنے کے لئے جو ابھی تک پولیس نہیں کر سکی۔''

''پولیس نہیں کر سکی؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! بڑی کمزور یادداشت ہے تمہاری۔ اسی کمزوری کے بارے میں پشتو فلموں کی مشہور ہیروئن مسرت شاہین نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھا تھا کہ جن قوموں کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، ان پر ہر کوئی کاٹھی ڈال سکتا ہے۔''

''پتا نہیں کہاں کی بات کہاں جوڑ دیتے ہو۔ آج مسرت شاہین سے تحقیقی مقالہ لکھوا رہے ہو، کل کسی دانشور سے ڈانس کروا دو گے۔''

''تمہاری معلومات ناقص ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ کسی نامعلوم مضمون میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اس نے۔ علم الابدان کی ایسی ایسی تشریح کرتی تھی کہ لوگ سر دُھنتے تھے۔ خیر، چھوڑو اس موضوع کو۔ میں اس واردات کی بات کر رہا ہوں جو بدھ کی رات ہوئی۔''

''کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''یہ پوچھو، کیا کرنے کا ارادہ نہیں۔ تمہیں کل شام کے بعد جلالی صاحب سے رخصت لینی ہے اور تیار رہنا ہے۔''

وہ زبردست موڈ میں دکھائی دیتا تھا مگر اس نے زیادہ بات نہیں کی اور فوراً ہی فون بند کر دیا۔

رات کوئی تین بجے کا وقت ہو گا۔ میں کمرے میں اپنے فرشی بستر پر سو رہا تھا۔ اچانک نیند سے جاگ اٹھا۔ کچھ دیر بے حرکت لیٹا رہا پھر اندازہ ہوا کہ موبائل فون کی مدھم گھنٹی کی وجہ سے آنکھ کھلی ہے۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے اسکرین کو دیکھا اور مزید چونک گیا۔ آسٹریا کا نمبر تھا۔ یہ کال نصرت کے سیل فون سے تھی۔ ''ہیلو نصرت!'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

''ہیلو تابش بھائی!'' وہ بھی بالکل مدھم آواز میں بولی۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم تو خیریت سے ہو...... اتنی رات گئے فون؟''

''آپ بھول رہے ہیں جناب! یہاں بہت زیادہ رات نہیں ہوئی۔ صرف بارہ بجے

ہیں، تقریباً تین گھنٹے کا فرق ہے ٹائم میں۔'' وہ بدستور سرگوشیوں میں بول رہی تھی۔

''پھر بھی آدھی رات تو ہو گئی ہے۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یوسف بھائی اور چچا احمد تو چلے گئے ہیں۔ باجی آج میرے پاس اسپتال میں رہیں گی۔ یہاں اجازت تو نہیں ہوتی ہے ساتھ رہنے کی لیکن بعض اوقات مل بھی جاتی ہے۔ بہرحال، اس وقت باجی بھی ساتھ والے کیبن میں سو رہی ہیں۔''

''ہاں...... کیسے فون کیا؟''

''بھائی جان! آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، میری بات پر غور ضرور کرنا۔''

''نصرت! جب تم بات بتاؤ گی تو پھر ہی غور ہو سکے گا نا۔''

''بھائی جان! پتا نہیں کہ مجھے یہ بات آپ سے کہنی چاہئے یا نہیں لیکن اگر آپ کو برا بھی لگے تو مجھے چھوٹی بہن سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔ پلیز بھائی۔''

''دیکھو تم خواہ مخواہ الجھا رہی ہو۔ میں تم سے کبھی ناراض ہوا ہوں اور نہ اب ہوں گا۔ تم جو بھی کہنا چاہتی ہو بے دھڑک کہو۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ ''تابی بھائی! بہت کچھ بدل چکا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ ابھی تک نہیں بدلے۔ آپ...... اب بھی وہی تابی بھائی ہیں جو باجی کو دیوانوں کی طرح چاہتے تھے۔ رات دن بس باجی کو سوچتے تھے۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے پروگرام بناتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے اور اپنے اس یقین کی وجہ سے میرے اندر ایک خوشی سی پیدا ہوتی ہے تابی بھائی...... پتا ہے کیوں؟''

''تم اپنی بات مکمل کر لو، میں پھر جواب دوں گا۔''

''اس لئے تابی بھائی کہ میرے خیال میں آپ باجی ثروت کو اس دلدل سے نکال سکتے ہیں جس میں وہ گلے گلے دھنسی ہوئی ہیں۔ باجی نے ایک ایسے شوہر کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے جو اصل میں ان کا شوہر ہے ہی نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں تابی بھائی جان! میں یوسف بھائی کو دیکھتی ہوں تو میرے گلے میں دھواں سا بھرنے لگتا ہے۔ آج کل بھی یوسف بھائی ہر وقت باجی کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ میری تیمارداری پر بھی بڑی توجہ دے رہے ہیں، روز گلدستے آ رہے ہیں لیکن میں سب جانتی ہوں۔ یہ باجی کے ساتھ بنائے رکھنے کی کوششیں ہیں اور یہ کوششیں بھی بس اس وقت تک ہیں جب تک یوسف بھائی کا مطلب نہیں نکل جاتا۔ جس روز انکل فاروقی نے پراپرٹی ان کے نام کر دی، یا پھر انکل فاروقی

کی آنکھیں بند ہو گئیں، یوسف بھائی نے کسی کچرے کی طرح باجی کو اٹھا کر اپنے گھر سے باہر پھینک دینا ہے۔ میری ہیروں جیسی باجی کی کوئی قدر نہیں انہیں۔ آپ...... میری بات سن رہے ہیں نا؟''

''ہاں میں سن رہا ہوں۔''

''یوسف بھائی کے دو چہرے ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں باجی ثروت کو بس ایک چہرہ ہی نظر آتا ہے یا پھر نظر تو آتا ہے لیکن انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ وہ یوسف بھائی سے علیحدہ ہونے والا گناہ نہیں کریں گی اور اگر کریں گی تو کسی نہ کسی صورت سزا پائیں گی۔ وہ جانتی ہیں کہ طلاق ان کے لئے ضروری ہے لیکن وہ اس کو ایک گالی کی طرح سمجھتی ہیں۔''

''کیا اب کوئی نئی بات ہوئی ہے نصرت؟'' میں نے پوچھا۔

''روز ہی نئی باتیں ہوتی ہیں تابی بھائی!'' وہ بدستور سرگوشی میں بولی۔ ''یوسف بھائی نے اب یہاں ایک نئی ''تفتیش'' شروع کی ہوئی ہے۔ انہیں شک پڑ گیا ہے کہ میرے علاج کا خرچہ چچا احمد نہیں کر رہے بلکہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔ وہ اس بارے میں باجی کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ اپنے والد...... انکل فاروقی کو بھی باجی کی طرف سے بدظن کر دیں گے۔''

''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟''

''پرسوں وہ انکل فاروقی سے فون پر بات کر رہے تھے...... اتفاقاً ان کے ایک دو فقرے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ انکل سے کہہ رہے تھے...... کوئی رشتے دار ہے ثروت کا۔ شاید کوئی کزن ہے...... کبھی کبھی اس کا فون بھی آتا ہے۔ جواب میں انکل فاروقی نے کچھ کہا۔ یوسف بھائی بولے، کچھ بھی ہے ڈیڈی...... ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے...... ہم نصرت کا علاج اچھی سے اچھی جگہ پر کرا سکتے ہیں...... کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''تم نے یہ سب کچھ ثروت کو بتایا؟''

''تابی بھائی! ان کی آنکھوں پر تو جیسے پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ذرا سی بات کروں تو ڈانٹ دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ مجھے یوسف بھائی میں بس خامیاں ہی نظر آتی ہیں۔ میں جواب میں کہتی ہوں کہ آپ کو خوبیاں ہی نظر آتی ہیں جو کہیں نہیں ہیں۔ دراصل تابی بھائی! باجی کے سارے مسئلوں کی جڑ وہ خوف ہے جو انہوں نے لفظ ''طلاق'' سے جوڑا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، خوش قسمتی سے ہمارے خاندان میں طلاق کا کبھی کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ پچھلے چالیس پچاس

سالوں میں ہمارے قریبی عزیزوں میں شاید ہی کہیں ایک آدھ طلاق ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب باجی اس بارے میں سوچتی ہیں تو ان کو یہ ایک بہت ہی بُرا اور گھمبیر واقعہ لگتا ہے۔ انہیں گناہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس نے ایک جادو کی طرح انہیں جکڑ رکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے تابی بھائی! صرف آپ باجی کو اس ''گھیرے'' سے نکال سکتے ہیں۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ آپ باجی کے لئے اور میرے لئے بھی ایک مسیحا کی طرح آئے ہیں۔ آپ کے آنے سے بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ ہاں تابی بھائی! بہت کچھ۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''مجھے بتاؤ نصرت! میرے بس میں کیا ہے...... میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ کوشش کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے تابی بھائی! گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے...... تابی بھائی! ایک عورت دوسری عورت کے دل کا حال زیادہ اچھی طرح جانتی ہے...... اور باجی تو میری بہن ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ باجی کے دل کی گہرائی میں اب بھی آپ کی تصویر ہے۔ وہ آپ کو سوچتی ہیں لیکن ان کی سوچوں کے گرد دنیا اور رسم و رواج کے پہرے ہیں...... آپ کو یاد ہے نا چند دن پہلے میں نے فون پر آپ کو سالگرہ کی مبارک باد دی تھی۔ آپ کی سالگرہ کا دن مجھے باجی نے ہی یاد کرایا تھا لیکن ساتھ ہی کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے ان کا نام نہ لوں...... یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے تابی بھائی! ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نصرت! ابھی تم اپنے ذہن کو ان فکروں میں نہ ڈالو تو اچھا ہے۔ اپنی ساری توجہ اپنی صحت پر رکھو اور ہمیں جلد سے جلد بھلی چنگی ہو کر دکھاؤ۔''

وہ بولی۔ ''آپ باجی کو ٹھیک کر دیں تابی بھائی...... میں وعدہ کرتی ہوں، میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''نصرت! میرے خیال میں تم بالکل الٹ بات کہہ رہی ہو۔''

''میں سمجھی نہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ جب تم تندرست ہو جاؤ گی تو تمہاری باجی بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''نصرت! جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے، ثروت کے وہم کی بنیاد ہی تمہاری بیماری ہے۔ اس نے یوسف سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور انہی دنوں تمہاری بیماری ڈائیگنوز ہوئی۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھر کر چکی ہے کہ اس کی ''غلط

وہموں کا بوجھ تمہاری صحت اور زندگی پر پڑا ہے۔ بس یہی وہ نفسیاتی گتھی ہے نصرت جس نے ثروت کو بے طرح الجھا رکھا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی، ثروت کی یہ نفسیاتی گتھی بھی اپنے آپ کھل جائے گی۔ اس کی سوچوں کے سارے جکڑ بند ٹوٹ جائیں گے۔ پھر وہ ایک آزاد عورت کی طرح سوچنا شروع کر دے گی۔''

وہ میری بات خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کا انداز گواہ تھا کہ وہ میری بات کو اہمیت دے رہی ہے۔

میں خاموش ہوا تو وہ دبی آواز میں بولی۔ ''آپ کے پاس باجی کا نیا موبائل نمبر ہے؟''

''نہیں۔''

''اچھا، میں ابھی آپ کو بھیجتی ہوں۔ آپ کسی وقت باجی کے نمبر پر بھی بات کیا کریں۔ یوسف بھائی پرسوں واپس چلے جائیں گے۔ پھر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ پلیز، اپنی اس بیمار چھوٹی بہن کی یہ بات مان لیں۔ ان کو فون کریں۔'' اسی دوران میں کھٹ پٹ کی مدھم آواز آئی۔ وہ بولی۔ ''اچھا میں بند کرتی ہوں، باجی شاید جاگ گئی ہیں۔''

میں بے وقت جاگا تھا اور اس کے بعد جس طرح کی گفتگو ہوئی تھی، اس نے نیند آنکھوں سے اُڑا دی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پہرے دار باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ گشت پر تھے۔ رکھوالی کے کتوں کی آوازوں کے سوا تقریباً سناٹا ہی تھا۔ یوسف کا کردار اب واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد کو بھی ثروت کی غیر معمولی حمایت و تائید سے روکنا چاہتا تھا۔ نصرت نے جو کچھ بتایا، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے والد فاروقی صاحب کو ان کی بڑی بہو کے حوالے سے بدظن کرنا چاہتا ہے...... اس کی ہوشیاری بھی عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے فقط چند دنوں میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نصرت کے علاج کے لئے رقم چچا احمد نہیں دے رہے بلکہ کہیں اور سے مہیا ہو رہی ہے۔

ثروت کی تصویر میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ میرا عشق تھی، میرا وجدان، یقین، سب کچھ وہی تھی۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا تھا تو مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے بغیر میری زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ میں چار برس تک یہ آس سینے میں کسی جوت کی طرح جگا کر زندہ رہا تھا کہ ثروت میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہو گی۔ یہ آس پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ شادی شدہ ہو چکی تھی لیکن اس صورتِ حال میں بھی ایک زبردست پھیر موجود تھا۔ اور اس پھیر نے مجھے ایک نئے موڑ پر لا

کھڑا کیا تھا۔ اس موڑ پر گہری تاریکی تھی مگر تاریکی میں آس امید کی کچھ کرنیں بھی موجود تھیں۔ کیا اب بھی وقت میرے لئے پلٹ سکتا ہے؟ کیا اب بھی میں اور ثروت بیت جانے والے موسموں کو آواز دے سکتے ہیں؟ میں نے بڑی حسرت کے عالم میں سوچا اور سینے میں فروزاں آگ کچھ اور بھی تپش دینے لگی۔

○......❖......○

میں اور عمران فارم ہاؤس سے نکلے۔ یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ ہم نے ایک مشترکہ عزیز کی شادی میں شرکت کا بہانہ بنا کر جلالی صاحب سے چھٹی لی تھی۔ گارڈز کی ایک گاڑی شیخوپورہ سے شاہدرہ تک جا رہی تھی۔ ہم اسی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ ایک محفوظ طریقہ تھا۔ اگر ہم اپنے طور پر سفر کرتے تو یہ اندیشہ موجود تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جائے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

ہم شاہدرہ موڑ پر گارڈز کی جیپ سے اتر گئے اور ایک رکشا میں بیٹھ کر لاہور کے وسطی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور جگمگا رہا تھا۔ زندگی عروج پر تھی۔ ہم مینارِ پاکستان اور بادشاہی مسجد کے قریب سے گزرے۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں پہلی بار عمران سے ملا تھا۔ وہ مجھے جان لیوا مایوسی کے گھیرے سے نکال کر اپنے آشیانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ آج کی طرح تب بھی مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ آج بھی اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ ایک بندے کی دُم میں نمدہ فٹ کرنا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح میں اس سے پوچھتا ہی رہ گیا تھا۔ میری پینٹ کی جیب میں چھوٹے سائز کا لیکن ایک طاقتور پستول موجود تھا۔ عمران کی پنڈلی سے بھی ایک لوڈڈ پستول بندھا ہوا تھا۔ یہ دونوں ہتھیار عمران نے فارم ہاؤس کے اندر سے ہی حاصل کئے تھے، کیسے کئے تھے، یہ اس نے نہیں بتایا۔

فارم ہاؤس سے تو عمران میری طرح پتلون قمیص میں ہی نکلا تھا لیکن رکشا میں بیٹھنے کے بعد اس نے جیب سے ایک ٹائی نکالی اور نفاست سے باندھ لی۔ ”خیر ہے، آج کسی فلم ایکٹریس پر بجلی گرانے کا ارادہ ہے۔“

”بھئی، اپنے یار کی شادی پر جا رہے ہیں، بن ٹھن کر جائیں گے۔“

”یہ بہانہ تو جلالی صاحب کے لئے تھا۔ اصل بات کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ایک عجیب کام کیا۔ اپنی سیاہ پتلون کی جیب میں سے ایک نو دس انچ لمبا چاقو نکالا۔ اس چاقو کا دستہ پتلا لیکن مضبوط تھا۔ یہ چاقو اس نے اپنی ٹائی کے اندر کی طرف بنی پاکٹ میں اس طرح چھپا لیا کہ اسے سامنے سے دیکھنا ناممکن ہو گیا۔

اس نے تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”بتاؤ، کسی بالی لالی وڈ فلم میں تم نے کسی ہیرو میں اس طرح کی ذہانت دیکھی ہے؟“

”میں واقعی متاثر ہوا ہوں۔ اچھا طریقہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ پتلے دستے والا چاقو واقعی ٹائی کا حصہ بن گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن اتنی زیادہ احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟ کہیں ہماری خصوصی تلاشی ہونے والی ہے؟“

”تلاشی جیسی تلاشی۔ تم دیکھتے رہنا، ہر چیز ٹٹول لیں گے تمہاری۔“

”لیکن کون؟“

”ہمارے دوست۔ بڑے محتاط قسم کے لوگ ہیں۔“

”یار! اب تو کچھ بتا دو۔ کیوں امتحان لینے پر تلے ہوئے ہو؟“ میں نے عاجز لہجے میں کہا۔

اس نے اچھلتے کودتے رکشے میں میری صورت دیکھی اور بولا۔ ”چلو کیا یاد کرو گے، کس مہربان سے پالا پڑا ہے۔ ہم جاوا صاحب کے ایک اڈے پر جا رہے ہیں۔“

”جاوا کا اڈا؟ تمہیں کیسے معلوم؟“

”ایک ڈان کو دوسرے ڈان کا ٹھکانا معلوم نہ ہو گا تو کیا تم جیسے شریف کو ہو گا۔“

”خیر، اب اتنے ڈان بھی نہیں ہو تم۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اندھیرے میں کوئی تیر چلانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”اندھیرے میں نہیں اُجالے میں...... اور تیر بھی نہیں، توپ۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ تم جاوا سے ملتے رہے ہو؟“

”جاوا سے نہیں لیکن اس کے ایک بڑے گرگے سے۔ سلطان نام ہے اس کا...... سلطان چٹا۔ خطرناک بندہ ہے۔ کچھ عرصے سے زیرِ زمین ہے لیکن آج کل لاہور میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم آج اس کے ساتھ چائے پی سکیں گے۔“

”کہیں زیادہ ہی تیز چائے نہ ہو؟“

”تم بھی تو اب دودھ پتی کے مرحلے سے گزر چکے ہو۔ کتنی بھی تیز ہوئی، جارج گورے سے تو تیز نہیں ہو گی۔“

”بڑی رمزیہ باتیں کر رہے ہو۔ اللہ ہی خیر کرے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔

یقیناً ہم کسی خطرناک کام سے جا رہے تھے لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب خطرناکی میرے دل و دماغ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کرتی تھی۔ خاص طور سے عمران کا ساتھ ہوتا تھا تو یہ

سب کچھ ایک سنسنی خیز انجوائے منٹ کی طرح ہو جاتا تھا۔

رکشا، مال روڈ کے علاقے میں ایک دومنزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ عمارت کا مین گیٹ بند تھا۔ لان میں گھاس اُگی ہوئی تھی اور اسے مدت سے کاٹا نہیں گیا تھا۔ کھڑکیاں، دروازے بند اور فرش پر گرد وغبار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بلڈنگ عرصے سے بے آباد پڑی ہے۔

ہم عمارت کے اندر جانے کے بجائے سیدھے نکلتے چلے گئے تو مجھے شک گزرا کہ شاید عمران حسبِ عادت مذاق کر رہا تھا۔ ایک چکر کاٹ کر ہم مال روڈ کے بارونق علاقے کی طرف نکل آئے۔ مین سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ایک شاپنگ پلازا کے نیچے ایک نیم تاریک سا پارکنگ لاٹ تھا۔ ہم ڈھلوان اتر کر پارکنگ میں داخل ہو گئے۔ پارکنگ کی زیریں منزل پر بھی کافی تعداد میں گاڑیاں موجود تھیں۔ اِکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک لاری نما بس کے عقب میں پہنچ کر عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک چھوٹا سا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم ایک نیم تاریک کوریڈور سے گزرے۔ یہاں بھی زیادہ صفائی ستھرائی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے کھڑے ایک ہٹے کٹے شخص نے ہمیں کڑی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''سلطان چٹے سے کہو، تمہارا باپ ملنے آیا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ہٹے کٹے شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''باپ کا مطلب باپ ہی ہوتا ہے۔ بیٹے کی ماں کا خصم۔ جاؤ اسے بتا دو، وہ سمجھ جائے گا۔''

ہٹا کٹا شخص جز بز نظر آ رہا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ وہ عمران پر پھٹ پڑے گا، کبھی خوف زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے کندھے سے ریوالور جھول رہا تھا۔ عمران کو اور مجھے سر تا پا دیکھتا ہوا وہ دروازے کی دوسری طرف چلا گیا۔ بہرحال، جاتے ہوئے وہ دروازے کو دوسری طرف سے مقفل کر گیا تھا۔

اس کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں عمران سگریٹ پھونکتا رہا اور میں موبائل فون پر میسج وغیرہ چیک کرتا رہا۔ ہٹا کٹا شخص اب قدرے مرعوب اور مؤدب نظر آ رہا تھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''عمران دانش......ابوسلطان چٹا۔'' عمران نے کہا۔

''آیئے۔'' اس نے تیوری چڑھائی اور ہمیں راستہ دیا۔

یہ بھی ایک راہداری تھی مگر خاصی صاف ستھری تھی، قالین بچھا ہوا تھا۔ ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ چند قدم آگے گھنگریالے بالوں والا ایک کرخت صورت مکرانی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی۔ ساتھ میں ایک درمیانی عمر کا فربہ اندام شخص نظر آتا تھا۔ وہ بھی شکل سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔

''سوری۔'' اس نے کہا اور عمران کی جامہ تلاشی شروع کر دی۔ عمران کی پنڈلی سے لگا ہوا پستول نکال لیا گیا۔ بعدازاں میری تلاشی ہوئی اور میرا اٹیڈی پستول بھی ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ ''یہ دونوں ہتھیار واپسی پر آپ کو مل جائیں گے۔'' اس نے کہا۔

ہم آگے بڑھے۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک پانچ چھ فٹ چوڑا ساگوانی دروازہ تھا۔ یہاں دو مسلح افراد نے پھر ہماری تلاشی لی۔ اس مرتبہ ہمیں موبائل فونز سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ''سوری'' کے لفظ سے شروع ہونے والی یہ تلاشی خاصی باریک بینی سے کی گئی۔ پنڈلیاں اچھی طرح ٹٹولی گئیں اور جوتوں کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا گیا۔ عمران کا چہرہ تمتما رہا تھا لیکن وہ بہ وجوہ خاموش تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ عمران کی ٹائی ابھی تک اس تلاشی سے محفوظ تھی۔ میں نے غور کیا اور اندازہ ہوا کہ عام طور پر سخت ''سکیورٹی چیکنگ'' والی جگہوں پر بھی ٹائی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ عمران کی یہ ''ایجاد'' قابلِ غور تھی۔

ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہم تو اسی دومنزلہ بلڈنگ کے اندر آ گئے ہیں جو باہر سے مقفل اور بالکل بے آباد نظر آ رہی تھی۔

''یہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''آج کل ہر کام بیک ڈور سے ہو رہا ہے۔ اسے بیک ڈور ڈپلومیسی کہتے ہیں جگر۔''

بظاہر اجاڑ نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے مکمل آباد تھی۔ ایک لمبا تڑنگا گن مین قالین پوش راہداری میں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں ایک گول کمرے کے سامنے لے آیا۔ کمرے کا خوب صورت ساگوانی دروازہ بھی گولائی میں تھا۔ گن مین کی دستک پر جس خوبرو لڑکی نے دروازہ کھولا، وہ بھی سر تا پا خوبصورت گولائیوں کا مجموعہ تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دفعہ تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یقیناً عمران کو بھی حیرت ہوئی ہو گی۔ یہ لڑکی مشہور انڈین فلمسٹار کرشمہ کپور تھی...... یا پھر اس کی ہو بہو کاپی تھی۔ ''آیئے جی۔'' اس نے اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش کرتے ہوئے بازو لہرایا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ بیڈ نما صوفے سے ایک چوڑا چکلا شخص اٹھا۔ لال پری کے نشے سے اس کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند سیکنڈ تک عمران کو گھورتا

رہا پھر پُر تپاک انداز میں بولا۔ ''اتنی دیر کہاں رہے ہو ہیرو صاحب! مدت بعد شکل دکھائی ہے۔''

''تم بھی تو ''کتے'' کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھے۔'' عمران نے جان بوجھ کر غلط محاورہ بولا۔ دونوں نے زوردار مصافحہ کیا۔ شاید وہ عمران سے معانقہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کنی کترا گیا۔ اس کی وجہ عمران کی ٹائی بھی ہو سکتی تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ڈراؤنی آنکھوں میں چوڑے تھوبڑے والا یہی شخص جاوے کا گرگا سلطان چٹا ہے۔ سلطان چٹے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ عمران بولا۔ ''یہ میرا دوست تابش ہے۔ یہ بھی تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتا تھا۔''

''خوش آمدید، ویلکم۔'' سلطان نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کی سختی سے آشنا کرنے کی کوشش کی لیکن جو ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا، وہ بھی کچھ کم پتھریلا نہیں تھا۔

کرشمہ کپور ایک طرف خاموش و مؤدب کھڑی تھی۔ جمناسٹک کرنے والی لڑکیوں کی طرح اس کی ٹانگیں اور بازو لباس سے بے نیاز تھے۔ بیڈ نما صوفے کے قریب ہی مساج آئل اور تولیا وغیرہ پڑا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری آمد سے تھوڑی دیر پہلے سلطان چٹا کرشمہ کپور کے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے کھردرے پنڈے کی مالش کروا رہا تھا۔ سلطان چٹا کتنا بھی بڑا بدمعاش سہی مگر اتنا بڑا نہیں تھا کہ کرشمہ کپور اس کی مٹھی چاپی کرتی پائی جاتی...... اس بات کو دوسرے انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کرشمہ کپور کی مارکیٹ ویلیو کتنی بھی کم ہو گئی تھی مگر اتنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سلطان چٹے جیسے گرگے کی خلوت میں پائی جاتی۔ یہ یقیناً اس کی ہم شکل تھی۔ ذرا غور سے دیکھنے پر کرشمہ اور اس لڑکی کے خدوخال میں کچھ فرق بھی نظر آتا تھا۔ عام طور پر مشہور فلمی ستاروں کے دو چار ڈپلی کیٹ بھی ان کے اردگرد موجود رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اصل اداکاروں سے کافی مماثلت بھی رکھتے ہیں۔ یہ لڑکی بھی ان میں سے ایک تھی۔

سلطان نے کہا۔ ''ہاں جی، یہ تابش صاحب مجھ سے ملنے کا شوق کیوں رکھتے ہیں؟'' لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''اس کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے اور تمہارا باس تو بڑے بڑے نکموں کو ہیرو بنا دیتا ہے۔ تابش تو شکل کا بھی اچھا بھلا ہے۔ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ ایڈوانس لے کر بھول جاتا ہے۔ ریل گاڑی کی طرح کبھی وقت پر نہیں پہنچتا۔ سمجھو فلمسازوں کی ساری شرائط پوری

کرتا ہے۔''

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ''مسخری نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ ٹائم تمہارے پاس بھی زیادہ نہیں ہوگا اور میرے پاس بھی کم ہے۔''

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔''

''مجھے پتا ہے تم جیسے لوگ مرنے کے بعد بھی سنجیدہ نہیں ہوتے، ان کے تھوڑے بہت دانت ضرور نظر آتے رہتے ہیں۔ لیکن اتنا عرصہ تم رہے کہاں ہو...... اور تمہیں کیسے پتا تھا کہ میں یہاں ملوں گا؟''

''بس انڈیا میں تھا ایک لونڈیا کے چکر میں۔ اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے...... بلکہ کبھی کبھی تو راہ کے بجائے موٹروے ہوتی ہے۔ چیتا، کتے کی بو کافی دور سے سونگھ لیتا ہے۔''

وہ پھر زہرخند انداز میں بولا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ کتا، کتے کی بو سونگھ لیتا ہے۔''

''تم نے آدھی بات درست کہی ہے۔ چلو تمہارے جیسے کے لئے یہ بھی بڑی بات ہے۔''

سلطان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''میں اب یہاں سے نکلنے ہی والا تھا۔ مجھے بتاؤ، میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''کیا کیا خدمتیں ہیں تمہارے پاس؟''

''اچھا کھانا...... شراب...... لونڈیا...... اور اگر کوئی پیچھے لگا ہوا ہے اور ایک دو راتیں یہاں گزارنا چاہتے ہو تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں لونڈیا کے بجائے ایک لونڈے کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہارا وہ لمبو ساتھی، کیا نام ہے اس کا، نادر ڈی ڈی یا نادر ٹی ٹی۔''

''نادر ٹی ٹی نے کیا کر دیا ہے تمہارے ساتھ؟''

''یہی تو پتا کرنا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

سلطان کچھ دیر گہری نظروں سے عمران کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے کرشمہ کپور کی طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ ''نیتو! جاؤ نادر کو بلاؤ یہاں۔''

نیتو اپنی کمر کو بل دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دیوار پر شاندار ایل سی ڈی موجود تھا۔ کوئی انگلش فلم چل رہی تھی۔ فٹ بال میچ کے دوران میں بار بار تالیوں کی آواز گونجتی تھی۔ سلطان

کے سامنے میز پر تین سیل فون پڑے تھے۔ گاہے بگاہے کسی فون میں وائبریشن بھی ہو جاتی تھی مگر سلطان کوئی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ سلطان کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ چٹانی جسم کا مالک، ایک خطرناک صورت بدمعاش تھا۔ خاص طور سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھنے والے کو ہراساں کرتی تھیں۔

عمران اور سلطان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ''ہم پیشہ'' کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس سے پہلے بھی ان کی دو چار دھواں دھار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ سلطان نے تین فرنچ گلاسوں میں انڈین بیئر انڈیلی۔ سلطان اور عمران تو غٹا غٹ پی گئے، میرا گلاس وہیں دھرا رہا۔ چند منٹ بعد خوبرو نیتو پھر کمر لچکاتی آ گئی۔ اس نے شاید اپنی آنکھوں کا رنگ کرشمہ کپور سے ملانے کے لئے نیلے لینسز لگا رکھے تھے۔ نیتو کے عقب میں ایک دراز قد شخص چلا آ رہا تھا۔ اس کا قد یقیناً ساڑھے چھ سے نکلتا ہوا تھا۔ جسم اکہرا لیکن مضبوط تھا۔ اس نے گہرے رنگوں کی پینٹ قمیص پہن رکھی تھی۔

اس نے سپاٹ لہجے میں عمران کو سلام کیا۔ عمران نے جواب دیا۔ سلطان کی ہدایت پر یہ نادر نامی شخص ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران نے نادر کی آنکھوں میں دیکھا اور بغیر کسی تمہید کے اچانک کہا۔ ''پچھلے بدھ کی رات دس بجے کے بعد تم کہاں تھے نادر؟''

نادر کے سانولے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس نے تعجب سے پہلے اپنے باس سلطان اور پھر عمران کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' نادر نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''تم میری بات کا جواب دو نادرے...... اور دیکھو، بالکل سچ بولنا۔ جھوٹ بولو گے تو مجھے پتا چل جائے گا اور پھر جو کچھ ہوگا، وہ اچھا نہیں ہوگا۔''

سلطان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پولیس میں بھرتی نہیں ہو گئے ہو۔ بالکل تھانیداروں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ اگر حکم کرو تو ہم دونوں نیچے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ تم اچھی طرح تفتیش کر سکو۔'' سلطان کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

''ضرورت پڑی تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کم از کم تمہارے اس نادرے کے ساتھ تو ضرور ہو سکتا ہے۔''

''تمہیں شبہ کیا ہے؟''

''شبے تو بہت سے ہیں سلطان جی۔ فی الوقت میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بدھ کی

رات تمہارا یہ چمچہ کہاں تھا؟''

سلطان چٹے کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''تم بدھ کی رات کہاں تھے نادر؟''

نادر کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا ابھرا۔ وہ کچھ دیر تک سوچ کر بولا۔ ''بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی کوٹھی پر پروگرام تھا۔ چھوٹے وزیر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ میں آپ کے ساتھ ہی تھا۔''

سلطان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی چھوٹی بیٹی کا پہلا مجرا تھا۔ بڑے ہلے گلے والی محفل تھی۔ میں اور نادر وہیں تھے۔ صبح تین بجے کے قریب واپسی ہوئی تھی۔''

''تین کہاں جی، چار ساڑھے چار کا وقت تھا۔'' نادر نے کہا۔

''لیکن بات کیا ہے؟ نادر نے کسی کی ماں، بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟'' سلطان خشک لہجے میں بولا۔

''کسی کی ماں، بہن والا معاملہ بھی ہے لیکن یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس سے کہو اپنی قمیص اتارے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! فرانسیسی تو نہیں بول رہا۔ نہ ہی فرانسیسی گلاس میں بیئر پینے سے کوئی فرانسیسی بولنے لگتا ہے۔ اس سے کہو قمیص اتارے۔''

نادرے کی آنکھوں میں چنگاریاں نظر آنے لگیں۔ سلطان کی آنکھیں بھی کچھ اور ڈراؤنی ہو گئیں۔ وہ بولا۔ ''دیکھو ہیرو! تم ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ اس وقت تم میرے ڈیرے پر ہو۔ تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔ برداشت کا زیادہ امتحان نہ لو۔ معاملہ بتاؤ کیا ہے؟''

''معاملے کا پتا تو قمیص اتارنے سے ہی چلے گا۔ اس لمڈھینگ سے کہو قمیص اتارے۔''

عمران کا لہجہ حیران کن حد تک بے باک تھا۔

نادرے کو دوسری بار چمچے کا خطاب ملا تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ایک قدم آگے آ کر بولا۔

''اتار دیتا ہوں قمیص...... کہو تو پینٹ بھی اتار دیتا ہوں۔ کیا کیا دیکھنا ہے تم نے؟''

''بڑے بے غیرت ہو۔ اپنی اس ہمشیرہ کرشمہ کپور کے سامنے ہی سب کچھ دکھا دو گے۔'' عمران اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

عمران کا خطرناک انداز دیکھ کر سلطان چٹا ایک دم عمران کے سامنے آ گیا۔ ''ایک منٹ......ایک منٹ۔'' سلطان نے اپنے بے پناہ طیش کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

عمران پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ دراز قد نادر وہیں ساکت کھڑا رہا۔ اس کا سانولا سلونا چہرہ مختلف رنگ بدل رہا تھا۔ سلطان چٹے کے محتاط انداز سے صاف عیاں تھا کہ اس سے پہلے عمران سے اس کا واسطہ پڑ چکا ہے...... اور اسے پتا ہے کہ عمران کس ٹائپ کا بندہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بات کو بڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے دھیمے انداز میں نادرے کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کوئی بات نہیں نادرے، یہ مہمان ہے اپنا۔ چل کر ہمارے پاس آیا ہے۔ تُو کون سی لونڈیا ہے۔ مان لے بات اس کی۔''

نادرا کچھ دیر خشمگیں نظروں سے عمران کو تکتا رہا۔ کچھ دیر کے لئے تو لگا کہ وہ سلطان کی بات بھی نہیں مانے گا اور اچانک عمران پر حملہ کر دے گا۔ مجھے اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔ یہاں ہمیں مار کر دفن کر دیا جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ یہ عمران ہی تھا جو جنگلی جانوروں کی طرح اس کچھار میں گھسا تھا اور اب بڑے اطمینان سے کشیدگی بڑھا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد نادرے نے اپنا ہاتھ قمیص کی طرف بڑھایا۔ پہلے اسے پتلون کے اندر سے کھینچا پھر بٹن کھول کر اتار دیا۔

''بنیان بھی اتارو۔'' عمران نے تحکم سے کہا۔

اس نے بنیان بھی اتار کر پھینک دی۔

ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں تالیوں کی زوردار آواز گونجی۔ یوں لگا جیسے یہ تالیاں، نادرے کے بنیان اتارنے پر بجائی گئی ہوں۔

عمران اٹھا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں اس نے گھوم پھر کر نادرے کے جسم کا معائنہ کیا۔ اس کا سانولا جسم جیسے فولادی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ کمر پر ایک ٹیٹو بھی دکھائی دیتا تھا۔ عمران نے نادرے کی پتلون کے دونوں پائنچے پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچے اور گھٹنوں تک اس کی پنڈلیوں کا معائنہ بھی کیا۔ ایک دم مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے۔ اجتماعی زیادتی کا نشانہ بننے والی زرینہ نے بتایا تھا کہ رخشی نے دراز قد پٹھان کی زبردست مزاحمت کی تھی۔ رخشی کے ناخنوں میں اس کے گوشت کے ریزے بھی تھے۔ عمران شاید یہی ثبوت دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن یہ ثبوت یہاں موجود نہیں تھا۔

عمران واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''پہن لو قمیص۔'' اس نے نادر ٹی ٹی سے کہا۔

وہ غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر قمیص بنیان پہننے میں مصروف ہو گیا۔

''کچھ ہمیں بھی بتاؤ تھانیدار صاحب یہ کس چیز کی تفتیش ہو رہی ہے؟'' سلطان نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اسی چیز کی جو تم جلالی کے فارم ہاؤس میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو اور جس کی خاطر تم نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کرایا ہے۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''تمہاری سمجھ دانی اتنی چھوٹی نہیں۔ تم گھنے بن رہے ہو۔ جو کچھ تم اور تمہارا باس جاوا، فارم ہاؤس میں کر رہے ہو وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اپنے ایک بندے کی اتفاقیہ موت کا بدلہ لینے کے لئے تم نے فارم ہاؤس پر جو قیامت ڈھائی ہے، اس کا حساب بھی دینا ہو گا تمہیں۔ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں۔''

''تم ثبوتوں کے بغیر ایک بیکار بات کر رہے ہو ہیرو۔ اس طرح تو کسی پر کوئی بھی الزام لگایا جا سکتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ منگل کے روز سبزی منڈی میں جو بم دھماکا ہوا ہے، وہ تم نے کیا ہے...... تمہارا باس جان محمد بھی تمہارے ساتھ تھا۔ اور اس سے پہلے کوپر روڈ پر مارے جانے والے تین پولیس اہلکار بھی تمہاری ہی گولیوں سے چھلنی ہوئے تھے، وغیرہ وغیرہ۔''

''میں ہوائی باتیں نہیں کروں گا۔ ثبوت دوں گا اور جب ثبوت آ جائے گا تو پھر تمہارے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا اور نہ ہی کسی رو رعایت کی توقع رکھنا۔''

''ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ تم جیسوں سے رعایت مانگوں۔ اور تم اتنی بڑی بات کرو جتنا تمہارا منہ ہے۔ زیادہ وزن اٹھانے سے بندہ کبھی کبھی وزن کے نیچے بھی آ جاتا ہے۔''

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا سلطانے...... اور یہ بات اپنے گرو جاوے کو بھی بتا دینا۔ جلالی کی طرف آؤ گے تو سامنے مجھے کھڑا پاؤ گے۔''

''چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ہم جاوا صاحب کو تکلیف نہیں دیا کرتے۔ باقی تم نے اچھا کیا کہ بتا دیا کہ اب تم جلالی کے چوکیدار ہو۔'' سلطان نے کہا پھر ذرا وقفہ دے کر بولا۔ ''تم چل کر یہاں آئے ہو۔ تمہاری عزت کر رہے ہیں۔ ورنہ بہت سے لوگ یہاں آنے کے بعد کہیں جانے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ میں اب بھی تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ بدھ کی رات کو اگر کسی فارم ہاؤس میں کوئی واردات شاردات ہوئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ بدھ کی رات......''

"تم فیروزہ بائی کے بالاخانے میں تھے...... اور وہاں نوٹوں کی گڈیاں چھت والے پنکھوں میں مار رہے تھے۔" عمران نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا......

"یہ قصہ چہار درویش کسی اور کو سنانا سلطانے۔ تیرے جیسے وارداتیے واردات کی رات کو بھوت پریت بن جاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دو دو تین تین جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ ایسے بھوت پریتوں کو ڈنڈے مار مار کر ایک ہی قالب میں گھسانے کا فن مجھے آتا ہے......"

سلطان چٹے کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے انگارہ ہو گیا۔ اس نے چٹکی بجائی اور گرانڈیل گن مین سے کہا۔ "ان دونوں تھانیداروں کو عزت سے باہر لے جاؤ۔ ان کے ستارے گردش میں آ گئے تو بڑی مٹی پلید ہوتی ہے ان کی۔"

عمران کچھ دیر تک سلطان چٹے کی ڈراؤنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جا رہا ہوں لیکن اگلی ملاقات بھی جلد ہی ہو گی۔"

○......❖......○

ہم واپس مڑے۔ واپس مڑتے ہوئے عمران نے کرشمہ کپور کی ہم شکل کو آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ہم دروازے سے نکل کر قالین پوش کوریڈور میں پہنچے۔ دائیں طرف سنگِ مرمر کی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر بھی اکا دکا لوگ موجود ہیں۔ ویکیوم کلینر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اچانک ایک مدھم آواز نے عمران کو چونکا دیا۔ یہ بلی کی آواز تھی۔ چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ یوں لگا جیسے وہ بلی پکار رہی ہے۔ وہ کس کو پکار رہی تھی؟ یکایک میرے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بلی کی یہ خاص انداز کی آواز میرے لئے نئی نہیں تھی۔ میں نے یہ آواز پہلے بھی فارم ہاؤس میں سنی ہوئی تھی۔ پکارتی ہوئی سی یہ آواز پھر بلند ہوئی۔ یہ نایاب ایرانی بلیوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی۔ مجھے عمران کے چہرے پر ہیجانی تاثرات نظر آئے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور واپس سلطان کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب گرانڈیل گن مین نے عمران کی طرف گن سیدھی کرنا چاہی۔ میں گن مین سے قریب تھا۔ میں نے زور سے ٹانگ چلائی۔ گن اس شخص کے ہاتھ سے نکلی اور راہداری کا ایک شیشہ توڑتی ہوئی باہر جا گری۔

ایک دوسرے شخص نے اپنی کمر کے ہولسٹر سے پستول نکالنا چاہا مگر وہ عمران کی پھرتی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عمران چیتے کی طرح لپک کر اس پر جا پڑا۔ دونوں اوپر نیچے نیم عریاں لڑکی نیتا کے قریب گرے۔ وہ چلا کر صوفے پر چڑھ گئی۔ میں نے گرانڈیل گن مین کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور ٹکر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ دوسری ٹکر نے اس کے چہرے کا بھرتہ بنا دیا۔

یہی وقت تھا جب میں نے ایک دل ہلانے وال منظر دیکھا۔ عمران اپنے مدِمقابل کے اوپر تھا اور سلطان چٹا اسے اپنے پستول کی زد میں لے چکا تھا۔ کسی بھی وقت دھماکے کی آواز

سے گولی عمران کی کمر میں داخل ہوسکتی تھی لیکن اس وقت عمران کی ''کک'' نے پھر کام دکھایا۔ صوفے پر چڑھی ہوئی نیتو عرف کرشمہ کپور کو پتا نہیں کیا ہوا، اس نے بدحواسی میں چھلانگ لگائی اور عمران کو پھلانگ کر دروازے کی طرف جانا چاہا۔ سلطان کی چلائی ہوئی گولی نیتو کی برہنہ ٹانگ میں لگی اور وہ چلا کر دھڑام سے شیشے کی تپائی پر گری۔ عمران کے لئے اتنا وقت کافی تھا۔ اس نے اپنے جسم کی پیشہ ورانہ لچک کا بھرپور استعمال کیا...... بڑی تیزی سے خود کو قالین پر رول کیا۔ سلطان کے پاؤں سے ٹکرایا اور اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ سلطان نے گرتے ہوئے جو دوسرا فائر کیا، وہ نہ جانے کس طرف گیا۔ ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں ایک بار پھر زوردار تالیاں گونجیں اور نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا۔

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ مزید مسلح لوگ آ رہے تھے۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ گن مین کے ہاتھوں سے جو رائفل نکلی تھی، وہ باہر جا گری تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عمران ایک بدلا ہوا شخص نظر آیا۔ ایک لرزا دینے والی سفاکی نے اس کے چہرے کو ہی نہیں، پورے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پتلے دستے والا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا پھل سلطان چٹے کی شہ رگ پر دھرا تھا۔ عمران کے ہاتھوں میں سلطان چٹا یکسر بے بس نظر آیا۔ سلطان کا پسٹل بھی اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ ''خبردار!'' عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ ''کوئی آگے آیا تو یہ مارا جائے گا۔''

لپک کر آنے والے مسلح افراد جہاں کے تہاں رک گئے۔ ان میں نادر ٹی ٹی بھی تھا۔ عمران نے سلطان کو عقب سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ اس نے چاقو کا پھل اتنی سختی سے سلطان کی گردن پر رکھا ہوا تھا کہ وہاں کٹ لگ چکا تھا اور خون رِسنا شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑا سا دباؤ بھی بڑھتا تو یقیناً سلطان کی اہم رگیں کٹنا شروع ہو جاتیں۔ عمران عجیب انداز میں پھنکارا۔ ''دیکھو سلطانے! یہاں ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا لیکن تُو اسے دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہے گا۔ تیری زندگی کی ڈور بس کٹی کہ کٹی۔ اپنے ان پالتو کتوں سے کہہ، ہتھیار پھینک دیں اور چار چار قدم پیچھے ہٹ جائیں۔''

سلطان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ایک ''جنونی گرفت'' میں ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو جائے گا۔ اس کی پیشانی پر پسینا نمودار ہو چکا تھا۔ اس کی نیتو عرف کرشمہ کپور قالین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ سلطان نے نادر ٹی ٹی کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ نادر نے رائفل قالین پر پھینک دی۔ اس کے دو ساتھی گارڈز نے بھی تقلید کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ نادر کی حالت زخم کھائے ہوئے سانپ جیسی تھی۔ وہ دو تین قدم سے زیادہ پیچھے نہیں ہٹا

تھا۔ شاید اس کی نیت میں ابھی فتور تھا۔ عمران دہاڑا۔ ''اور پیچھے ہٹ۔ نہیں تو تیرا یہ باپ جا رہا ہے۔'' اس نے سلطان کی گردن پر تیز دھار چاقو کا دباؤ کچھ اور بڑھایا۔ سلطان مچلا۔ خون تیزی سے رِسنے لگا...... عمران کے تیور دہلا دینے والے تھے، چاقو کی کارکردگی بھی بے مثال تھی۔ نادر مزید پیچھے ہٹ گیا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا کہ میں نادر والی رائفل اٹھا لوں۔

میں نے رائفل اٹھا لی...... اور باقی دو رائفلوں کو پاؤں سے دھکیل کر صوفے کے نیچے پہنچا دیا۔ رائفل کو چیک کرتا ہوا میں الٹے قدموں دروازے کی طرف گیا اور اسے اندر سے لاک کر دیا۔

دروازہ بند ہو جانے کے باوجود ایرانی بلی کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچتی رہی۔ شاید اس نے عمران کی خوشبو پالی تھی اور اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی......

عمران نے سلطان کی جیب سے ایک اور پستول برآمد کر لیا تھا اور اب یہ پستول اس کی کنپٹی پر تھا۔ اپنا اسپیشل ڈیزائن کا چاقو اس نے بند کر کے پتلون کی سائیڈ پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔

کمرے میں گمبھیر سناٹا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ راہداریوں کے ساؤنڈ پروف دروازوں کی وجہ سے یہاں ہونے والے دو فائروں کی آواز باہر تک نہیں گئی۔ جن تین لوگوں تک یہ آواز پہنچی تھی، وہ یہاں آن موجود ہوئے تھے۔ عمران آتشیں لہجے میں بولا۔ ''سلطانے! لگتا ہے کہ جانوروں سے تجھے بھی تھوڑا بہت لگاؤ ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ شاید چاروں بلیاں، جنگلی کتوں نے پھاڑ ڈالیں۔ لیکن تُو نے بڑی نیکی کی۔ ایک دو کو شاید بچا لیا۔ کتنی بچی ہیں...... ایک یا دو؟''

سلطان بالکل خاموش رہا...... پتھر کی طرح ساکت۔

اچانک ایک شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ مجھ پر آنا چاہ رہا تھا۔ عمران نے گولی چلائی اور عین اس کی پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران کا پستول دوبارہ سلطان کی کنپٹی پر آ گیا۔ یہ سارا عمل شاید ایک سیکنڈ کے اندر مکمل ہوا تھا۔ بدنصیب شخص پٹ سے اوندھی پڑی نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر گرا اور تب ہمیں علم ہوا کہ وہ نازک بدن تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی ہے۔ عمران کی پھرتی اور نشانے کی سچائی نے باقی تینوں افراد کو مبہوت کر دیا تھا۔ عمران زہریلے انداز میں مسکرایا اور ایڈورٹائزمنٹ'' کے انداز میں بولا۔

''اسٹار سرکس...... لاجواب کھلاڑی...... بے مثال کمالات...... اور تمہارے لئے آخری وارننگ ٹی ٹی! کوئی حماقت نہ کرنا۔''

نادر ٹی جیسے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے سانولے رنگ میں ہلدی گھل گئی تھی۔ اس کے ساتھی کا حال بھی یہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں نے موت کے فرشتے کو مجسم حالت میں اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔

وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا۔ ہاں، اس کے رنگ میں ہلدی کی آمیزش کچھ اور بڑھ گئی۔ عمران نے مجھے اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا۔ ''جناب سلطان صاحب کے کھوپڑے پر رائفل کی نال رکھو اور چوں چراں کریں تو ایک سیکنڈ میں ان کا بھیجا فرائی کر دو...... بلکہ ایک سیکنڈ بھی نہیں لگنا چاہئے۔ میں ذرا نادر جی کی خبر لے لوں۔''

میں نے عمران کی ہدایت پر عمل کیا اور ٹرپل ٹو رائفل کی نال سلطان چٹا کے سر سے لگا کر چوکس کھڑا ہو گیا۔ انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران، نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''نادر جی! ذرا پینٹ اتار کر کچھ دکھائیے ہمیں۔ اب تو کرشمہ کپور صاحبہ بھی سو رہی ہیں۔ اب کون سی پردہ داری ہے؟''

نادر کے چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ سب کچھ بھول کر عمران پر جھپٹ پڑے گا، کبھی سکتہ زدہ نظر آنے لگتا۔ جب عمران نے دیکھا کہ نادر اپنے ہاتھ پتلون کی بیلٹ کی طرف نہیں بڑھا رہا تو اس نے پستول کا رخ نادر کی ٹانگ کی طرف کر کے بے دریغ گولی چلائی۔ دھماکے کے ساتھ ہی نادر لڑکھڑایا اور اپنی پنڈلی پکڑ کر جھک گیا۔ اس کی گرے پتلون دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہونا شروع ہو گئی۔

عمران کی سفاک آواز پھر کمرے میں گونجی۔ ''نادر جی! میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ اپنی پتلون اتاریئے۔ آپ کے یہ خادم کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ چلئے، جلدی کیجئے۔''

نادر ٹی مسلسل، کھا جانے والی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا لمبوترا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ عمران نے دوسری بار گولی چلائی اور یہ اس کی دوسری ٹانگ میں گھٹنے سے تین چار انچ اوپر لگی۔ اس بار وہ درد سے چلا اٹھا۔ اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

''جناب عالی...... آخری بار مؤدبانہ گزارش ہے۔ پتلون اتاریئے۔ اس بار آپ کا یہ خادم جو گولی چلائے گا، وہ آپ کے ناریل شریف میں لگے گی۔'' عمران نے پستول کا رخ نادر ٹی کے سر کی طرف کر دیا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ وہی کرے گا جو کہہ رہا ہے۔ نادر ٹی نے بھی شاید اس کی آنکھوں میں اپنی موت پڑھ لی تھی۔ اس نے تکلیف سے کراہتے اور بل کھاتے ہوئے اپنے ہاتھ بیلٹ کی طرف بڑھائے اور پتلون انڈر ویئر سمیت

گھٹنوں تک اتار دی۔ عمران کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جو وہ دیکھنا چاہتا تھا، اس نے دیکھ لیا تھا۔ نادرے کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ کی بائیں طرف دو کھرنڈ سے تھے۔ ایک بڑا تھا، دوسرا قدرے چھوٹا تھا۔ یہ دراصل کھرونچوں کے پانچ چھ دن پرانے نشان تھے۔ عمران نے ذرا قریب جا کر مزید دھیان سے ان کھرونچوں کو دیکھا۔

اب اس بات میں شبہے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ دراز قد ڈھاٹا پوش نادرے کے سوا اور کوئی نہیں تھا جس نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کیا۔ رخشی کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا اور اسے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلطان چٹا براہِ راست اس واردات میں شریک نہیں تھا مگر سب کچھ ہوا اسی کی پلاننگ اور آشیرباد سے تھا۔ عمران کے اشارے پر نادرے نے اپنی پتلون اوپر چڑھا لی۔

عمران اب نفسیاتی طور پر کمرے میں موجود تینوں افراد پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ تینوں اس کے سامنے ساکت و جامد موجود تھے۔ فقط سلطان چٹا میں تھوڑا بہت دم خم نظر آتا تھا مگر ٹرپل ٹو رائفل کی نال اس کی کھوپڑی سے لگی ہوئی تھی۔ نادر کو دو گولیاں لگ چکی تھیں اور خون اس کی دونوں ٹانگوں سے بہہ رہا تھا۔ قالین پر گل کاریاں کر رہا تھا۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''ذرا ہوشیار رہنا جگر! میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔''

میں نے سر ہلا کر عمران کو تسلی دی۔ وہ ساگوان کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران کی گود میں وہی شاندار ایرانی بلی تھی جس کی آواز پر ہم رکے تھے اور یہ سارا نقشہ تبدیل ہوا تھا۔ یہ نایاب حاملہ بلی عمران کی گود میں آ کر ایک دم شانت تھی، اس کے سینے سے اپنا سر رگڑ رہی تھی۔ اس کی ٹائی سے کھیل رہی تھی۔

عمران نے زہرناک نظروں سے نادر کو دیکھا...... اور بولا۔ ''نادر صاحب! اسی لئے مشہور باکسر محمد علی کلے نے اپنی سرائیکی شاعری میں کہا ہے، جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔ ایسی خوبصورت سرائیکی میں نے کہیں نہیں پڑھی اور تم نے تو بالکل بھی نہیں پڑھی ہو گی ورنہ تم واردات کی رات یہ بلی اٹھانے کی غلطی نہ کرتے۔ اب تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے نادر صاحب! تم نے اس رات ہر وہ کام کیا ہے جو تمہیں سزائے موت دینے کے لئے کافی ہے۔ تو کیوں نا اس سلسلے میں جناب کی تھوڑی سی مدد کی جائے۔ کتنا لمبا سفر کرنا پڑے گا جناب کو! تھانہ، عدالت، جیل، وکیل، وکیل کی فیسیں، اپیلیں، اپیلیں...... اور پتا نہیں کیا کچھ؟ تو کیوں نا آپ کو شارٹ کٹ لگوا دیا جائے۔ آپ کے رتبے اور مرتبے کے لحاظ سے بھی آپ کو یہ آسانی ملنی چاہئے۔''

نادر کا رنگ یکسر ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عمران کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا، جیسے بہ زبانِ خاموشی اسے مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ لیکن سلطان کیا کرتا؟ وہ تو خود موت کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا...... وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اچانک نادرے کا پندار ٹوٹ گیا۔ اس کی ساری اکڑفوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک دہشت زدہ عاجزی میں ڈھل گئی۔ موت کو سامنے دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ اس کہاوت کی حقیقت میں آج پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ نادرا گھگیایا۔ ''دیکھو...... مم...... میں بڑے کام کا بندہ ہوں۔ مجھے ایسے ضائع مت کرو۔ جو کچھ کر رہا ہوں روزی روٹی کے لئے کر رہا ہوں۔ میں...... تمہارے لئے کام کرنے کو تیار ہوں۔ میں...... وقت پڑنے پر جان دے سکتا ہوں۔''

''تو وقت پڑ گیا ہے نا جناب نادر صاحب! مجھے آپ کی روح قبض کروانی ہے۔''

عمران نے انگلی کا دباؤ پھر ٹریگر پر بڑھا دیا۔ نالی کا رخ نادرے کے سر کی طرف تھا۔ بہرحال، اس نے گولی چلائی نہیں۔ نادرا تڑپ کر اوندھے منہ عمران کے پاؤں میں گر گیا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں۔ مم...... میں نے بس سلطان کا حکم مانا۔ یہ سامنے کھڑا ہے۔ پوچھ لو اس سے۔ بس یہی میری غلطی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لئے معاف کر دو۔''

عمران پھنکارا۔ ''تم نے سلطان کا حکم مانا لیکن اس ڈیوٹی میں سارا مزہ تو تمہیں ہی آیا نا۔ رات بھر تم نے فارم ہاؤس میں مفت کی شراب پی۔ لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے رہے۔ بے وجہ قیمتی چیزیں برباد کر کے اپنے اندر کے جانور کو تسکین دیتے رہے، یہ سب کچھ تم نے کیا یا نہیں؟''

''مم...... میں اپنا یہ قصور مانتا ہوں۔ میں نے یہ سب کیا۔ میں نے زیادہ شراب پی لی تھی...... میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں سچے دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ تم جو کہو گے میں وہ کروں گا۔ بس مجھے ایک موقع دے دو۔ خدا کے لئے...... میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

عمران پھنکارا۔ ''اس طرح کی منت سماجت اس ملازمہ نے بھی کی ہو گی جسے تم نے زخم زخم کر کے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا ہے...... اور شاید اعجاز نے بھی کی ہو جس کے نئے نئے دولھا بنے بھائی کو تم نے دو بار سیڑھیوں سے گرا کر موت کے گھاٹ اتارا۔''

عمران نے ٹریگر پر دباؤ اور بڑھایا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب گولی کسی وقت چل سکتی ہے۔ پستول کا رخ نادرے کے عین سر کی طرف تھا اور عمران کے نشانے کی سچائی تھوڑی دیر

پہلے نادرا اور سلطان دیکھ ہی چکے تھے۔

سلطان ہمت کر کے بولا۔ ''دیکھ ہیرو اتنا ہی بوجھ اٹھا جتنا جھیل سکے۔ اگر تم نے......''

''چپ۔'' عمران دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی جو سلطان کے کان کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کان پر رکھ لیا۔ خون کی ایک دھار اس کی انگلیوں کی درز سے نکل کر ہاتھ کی پشت پر بہنے لگی۔ اس کا چہرہ تکلیف اور زلزلے کی آماجگاہ بن گیا۔ عمران نے اسی لہجے میں کہا۔ ''اگر بکواس کرو گے تو دوسرے کان میں بھی جھمکا ڈالنے کی جگہ بنا دوں گا۔''

کمرے میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ نادرے کی موت اب یقینی ہے۔ نادرا آخری کوشش کے طور پر بولا۔ ''میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ تمہارے کام کی باتیں...... بہت زیادہ کام کی باتیں۔'' اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''تم کیا بتاؤ گے۔ تم دونوں تو خود اندھے کتے ہو اور ہرن کا شکار کر رہے ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی۔ یہ گولی نادرے کی دائیں آنکھ اور ناک کے بانسے کے درمیان لگی، وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور پھر کروٹ کے بل گر کر ساکت ہو گیا۔ ایل سی ڈی پر چلنے والی فلم میں ایک بار پھر تالیوں کی گونج تھی۔

سلطان چٹا جیسے گنگ ہو چکا تھا۔ بس متوحش نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خون آلود ہاتھ بدستور اپنے زخمی کان پر تھا۔ قطرہ قطرہ خون اس کی بالوں بھری کلائی پر رینگ رہا تھا۔ اب کمرے میں ہمارے علاوہ بس دو افراد موجود تھے...... اور ان میں سے بھی ایک زخمی تھا۔ یعنی سلطان چٹا۔ اس کا ساتھی صم گم کی تصویر بنا دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اپنے بڑوں کا حال دیکھنے کے بعد اس کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ عمران کے ایک اشارے پر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ سامنے ہی ایک شوکیس کے بالائی خانے میں ایک ویڈیو کیمرا نظر آ رہا تھا۔ اس پر ایک بڑا سا لینس چڑھا ہوا تھا۔ سائز کے اعتبار سے بھی یہ کیمرا پروفیشنل ٹائپ نظر آتا تھا۔ عمران نے سلطان چٹے کے ساتھی کو حکم دیا کہ وہ شوکیس پر سے کیمرا اتارے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ عمران نے کیمرے کی چارجنگ وغیرہ چیک کی۔ وہ ورکنگ پوزیشن میں تھا۔

''کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''یار دیکھو! اتنا زبردست رومانی سین ہو رہا ہے بلکہ ''رومانی'' بھی چھوٹا لفظ ہے۔ دیکھو تو سہی۔'' عمران نے بے ہوش پڑی کرشمہ کپور کی طرف اشارہ کیا۔ عمران کی پہلی گولی سے ہلاک ہونے والا مشٹنڈا اوندھے منہ نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر ہی گرا تھا اور قدرتی طور پر یہ

ایک عجیب سا اسٹائل بن گیا تھا۔کوئی دور سے دیکھتا تو اسے یہی لگتا کہ جذبات سے مغلوب ایک جوڑا یہاں قالین پر ہی اپنی ''حسرتیں نکالنے'' کا ارادہ رکھتا ہے۔

عمران نے میرے ہاتھ سے گن لے کر مجھے کیمرا تھما دیا اور بولا۔''چلو جگر! تم ریکارڈنگ شروع کرواور اوپننگ سین اسی کرشمہ کپور کا رکھو۔چلو شاباش۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔اسی سے دنیا و آخرت میں بھلا ہوگا۔''

میں سمجھ گیا کہ اس ریکارڈنگ سے عمران کا کوئی خاص مقصد ہے۔میں نے ریکارڈنگ شروع کر دی۔بے سُدھ پڑی نیتو عرف کرشمہ کا ایک شاٹ لیا پھر کیمرے کو پین کر کے سلطان چٹا کو فوکس کیا۔اس کی کنپٹی پر رائفل کی نال تھی اور عمران کی انگشت شہادت ٹریگر پر تھی۔سلطان کے تاثرات کو ریکارڈ کرنے کے بعد میں کیمرے کو نادرے کی خونچکاں لاش پر لے آیا۔وہ کروٹ کے بل پڑا تھا۔چہرے کے علاوہ اس کی دونوں ٹانگوں سے بھی مسلسل خون بہہ رہا تھا۔اس کے صحت مند جسم میں خون کی خاصی فراوانی تھی۔شاید یہ فراوانی اور حرارت ہی نادرے جیسے بدمعاشوں کو درندہ صفت بناتی ہے۔وہ سرتاپا آتش بنتے ہیں۔لوگوں کو جلاتے ہیں اور پھر دو چار سالوں میں خود بھی بھسم ہو جاتے ہیں۔

ایرانی بلی عمران کی ٹانگوں میں لوٹ رہی تھی۔کبھی اس کے پاؤں سے سر رگڑنے لگتی، کبھی ایک دم رخ پھیر کر نادرے اور اس کے ساتھی کی لاشوں کو دیکھنے لگی......اور یوں محسوس ہوتا کہ یہ مناظر اسے حیران کر رہے ہوں۔

عمران نے بڑی تسلی سے سلطان چٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔''اب تم بتاؤ سلطانے! تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔''

''مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔'' سلطان چٹے نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل کہا۔

''لیکن اگر تم کو چھوڑ دوں گا تو تم اچھا نہیں کرو گے۔اس نادرے کا خون چہرے پر ملو گے اور مجھے مارنے کی قسم کھا لو گے۔''

''مم...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔میں وعدہ کرتا ہوں۔''

اس نے آخری الفاظ زور دے کر کہے۔

''تم سامنے نہیں آؤ گے تو تمہارا باپ جاوا آئے گا۔تم اس کی بات نہیں مانو گے تو لوگ تمہیں جاوے کی حرامی اولاد کہیں گے۔کیا تم حرامی کہلوانا پسند کرو گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی لگے ہاتھوں مجھ سے اپنا قصہ پاک کروا ہی لو۔یہاں بڑا لمبا چوڑا ٹکراؤ ہونے والا ہے۔تم

بڑی مصیبتوں سے بچ جاؤ گے۔بڑا فائیو اسٹار مشورہ دے رہا ہوں تمہیں۔''

سلطانے کی صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ یا تو وہ خودکشی کر لے گا، یعنی نتائج سے بے پروا ہو کر عمران سے بھڑ جائے گا یا پھر اسے کوئی ہارٹ اٹیک قسم کی چیز ہو جائے گی۔

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''اچھا سلطانے! تمہیں ایک موقع دیتے ہیں......امید ہے کہ تم خیرسگالی کے اس جذبے کی قدر کرو گے اور اپنے والد جاوے کو بھی ایسا کرنے کے لئے کہو گے۔جب تک میں فارم ہاؤس میں ہوں، جاوے نے یا اس کے کسی کتے نے جلالی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو سمجھو جنگ چھڑ گئی۔امید ہے کہ جاوا میرے بارے میں تھوڑا بہت تو جانتا ہوگا۔مزید تفصیل اسے تم بھی بتا سکتے ہو۔تمہارے ساتھ تو خاکسار کی دو چار ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔''

سلطانے نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔اس کی آنکھوں میں جمی ہوئی موت کی زردی میں زندگی کی چمک نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن اسے اب بھی پورا یقین نہیں تھا کہ وہ موت کے اس ناگہانی گھیرے سے نکل گیا ہے۔

عمران نے کہا۔''میں اپنے الفاظ پھر دہرا رہا ہوں۔جلالی کی طرف آؤ گے تو پہلے مجھ سے سامنا ہوگا......اور یہ سامنا معمولی نہیں ہوگا۔'' سلطان نے پھر مشینی انداز میں سر کو اثباتی حرکت دی۔اس کی قمیص کا ایک کندھا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

عمران نے ٹرپل ٹو رائفل کی مہلک نال بدستور سلطان چٹے کی کھوپڑی سے لگا رکھی تھی۔یہ بڑا ڈرامائی سا سین تھا۔یوں لگتا تھا کہ کسی لمحے کچھ بھی ہو جائے گا۔

عمران نے میری طرف دیکھا۔''چلو جگر! اب چلیں۔''

''لیکن کیسے؟'' سلطان صاحب کے گرگے ہمیں نکلنے دیں گے؟''

''نہ نکلنے دیں گے تو سلطان جی کا بھیجا بھی نادر صاحب کی طرح فرائی ہو جائے گا۔''

''لیکن اس کو گن پوائنٹ پر کہاں تک لے جائیں گے؟''

''اپنی گاڑی تک۔جب گاڑی پر بیٹھ کر ڈیڑھ دو سو فرلانگ آگے نکل جائیں گے اور یقین ہو جائے گا کہ کوئی کتا بلا ہمارے پیچھے نہیں آ رہا تو سلطان جی کی تشریف پر لات مار کر......نہیں......نہیں......یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔سلطان جی کو عزت کے ساتھ گاڑی سے اتار دیں گے اور خود شیخوپورہ پہنچ جائیں گے۔''

''شاید تم بھول رہے ہو۔ہم گاڑی پر نہیں، موٹر رکشا پر تشریف لائے تھے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا دماغ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔'' عمران نے مایوسی سے سر ہلایا۔ پھر سلطان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

''پارکنگ میں پہلے فلور پر۔ ستون نمبر 18 کے پاس۔ کالے رنگ کی ٹویوٹا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، چلو...... یہ گاڑی تمہارا ڈرائیور شیخوپورہ سے واپس لے آئے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یار! کیا کر رہے ہو؟ پارکنگ لاٹ میں لوگ ہوں گے۔ دو چار پولیس والے بھی وہاں ٹہل رہے تھے۔ چوکیدار بھی ہیں۔ وہ اس کو گن پوائنٹ پر دیکھیں گے تو شور مچ جائے گا۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو رہا ہے۔''

''یار! تم دیکھنا سارے نابینا ہو جائیں گے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

''تم ضرورت سے زیادہ بے پروائی تو نہیں کر رہے؟''

''تم ضرورت سے زیادہ ناسمجھی دکھا رہے ہو۔ ذرا غور کرو یار! تمہارے ہاتھ میں اتنا بڑا ویڈیو کیمرا ہے۔ تم باقاعدہ ریکارڈنگ کر رہے ہو۔ شکل وصورت سے بھی تم کسی پرائیویٹ پروڈکشن کمپنی کے ناکام ڈراما ڈائریکٹر ہی نظر آتے ہو۔ آج کل لوگ ایسی ریکارڈنگز کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔''

''یعنی تم......''

''ہاں، یعنی یہی کچھ......تم بس کیمرا آن رکھنا۔ باقی سب میرا کام ہے۔''

دو منٹ بعد ہم بڑی شان کے ساتھ سلطان چٹا کے اس خفیہ اڈے سے باہر نکل رہے تھے۔ ہم کم از کم دو ساؤنڈ پروف سلائڈنگ ڈورز میں سے گزرے۔ یہاں چوکس مسلح محافظ موجود تھے مگر اپنے باس کے سر پر رائفل کی نال دیکھ کر اور اس کا اُڑا ہوا رنگ اور رنگا ہوا کان دیکھ کر سب دم بخود رہ گئے۔ مزید احتیاط کے طور پر سلطان نے انہیں زبانی بھی کہہ دیا کہ وہ کسی طرح کی مہم جوئی نہ کریں۔ میں کیمرے کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ سلطان چٹا کے قدم کانپ رہے تھے اور اس کی گردن پر تیز دھار چاقو نے جو کٹ لگایا تھا، وہ بھی مسلسل خون افشانی کر رہا تھا۔

یہ بظاہر بے آباد کوٹھی اندر سے آباد تھی۔ یہاں ہر وہ انتظام کر دیا گیا تھا جس سے یہ بے آباد ہی نظر آتی۔ کچھ کھڑکیوں کے شیشوں پر گہرا سیاہ روغن پھیر دیا گیا تھا اور کچھ کھڑکیاں ویسے ہی بند کر دی گئی تھیں۔ مقصد یہی تھا کہ رات کے وقت یہاں ہونے والی روشنی سڑک پر سے نظر نہ آسکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آخری دروازے میں سے نکلے اور انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں پہنچ

گئے۔ ایرانی بلی عمران نے سلطان چٹے کو تھما دی تھی۔ وہ اس بلی کے ساتھ کسی انگریزی فلم کا زخمی ولن ہی نظر آ رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اب چہل پہل کافی بڑھ چکی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم آٹھ دس قدم آگے گئے تھے کہ لوگوں کی نگاہ ہم پر پڑنی شروع ہوگئی۔ دیکھنے والوں کو سب سے پہلے سلطان کے خونچکاں چہرے نے ہی متوجہ کیا ہوگا۔ پھر عمران کی رائفل پر نظر پڑی ہوگی۔ لوگ متحیر نظر آئے۔ عورتوں اور بچوں کے چہروں پر ہراس نمایاں تھا۔ پھر انہوں نے مجھے اور میرے کیمرے کو دیکھا۔ وہ متذبذب نظر آئے۔ ان میں سے زیادہ تر جلد ہی خود کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے کہ یہ کسی ڈرامے وغیرہ کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ چند پولیس والے صرف دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی بس دیکھنے...... چونکنے......اور مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس دن مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہم لوگ اپنے اردگرد کے حالات سے کتنے لاتعلق ہو رہے ہیں۔ بعض اوقات ہماری آنکھوں کے سامنے سنگین وارداتیں ہو جاتی ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا...... یا پتا چلتا ہے تو ہم کوئی مناسب ردِعمل ظاہر نہیں کر پاتے۔ عمران نے جو اندازہ لگایا تھا، سو فیصد درست تھا۔ لوگوں نے بس دور دور سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ پولیس والے بھی جوں کے توں کھڑے رہے۔ صرف ایک کیمرے نے واقعی ہر شخص کی نظر بندی کر دی تھی۔ سلطان کے ڈرائیور نے ٹویوٹا کار کا دروازہ کھولا۔ عمران اور سلطان پیچھے بیٹھ گئے۔ عمران نے رائفل بدستور سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خطرناک ترین جگہ پر ہے۔ یہاں ہمارے اردگرد درجنوں قاتل موجود تھے۔ وہ ذرا سا موقع ملنے پر مجھے اور عمران کو چھلنی کر سکتے تھے۔ میں کیمرے سمیت اگلی نشست پر آ گیا۔ کیمرے کا رخ بدستور عمران اور سلطان چٹے کی طرف ہی تھا۔ سلطان کے ڈرائیور کی تلاشی ہم روانہ ہونے سے پہلے ہی لے چکے تھے۔ اب اس کے پاس گاڑی کی چابی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔

''کیا میں سمجھوں کہ تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟'' سلطان نے پوچھا۔

''نہیں، ہم تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں مگر یہ رہائی مشروط ہے۔ میں نے تمہیں کوٹھی پر ہی بتا دیا تھا۔ اگر تیرے پالتو کتوں نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کی تو پھر ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑے گا۔''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ کوئی پیچھے نہیں آئے گا۔'' سلطان نے اپنا زخمی کان دبائے دبائے کہا۔

"لیکن تسلی تو ضروری ہے نا جنابِ عالی! ایک پچھلی ملاقات میں تم نے خود ہی تو ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے پیشے میں اعتبار کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح عام لوگوں کے لئے شراب اور پرائی عورت۔"

سلطان چٹا دانت پیسنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ آج کا دن اس دبنگ شخص پر قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا پہلے جب وہ اپنے کمرے میں نیتو عرف کرشمہ کپور سے اپنے گورے چٹے جسم کی مالش کروا رہا تھا اور ایک پُرسکون شب گزارنے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنے دو قیمتی ساتھیوں سے ہاتھ دھونے والا ہے بلکہ دادا گیر کی حیثیت سے یادگار رسوائی کا شکار بھی ہونے جا رہا ہے۔

عمران نے عقب پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میں بھی گاہے بگاہے جائزہ لے رہا تھا۔ ہم مال سے گزر کر لوئر مال روڈ پر آ گئے، وہاں سے ہمارا رخ پہلے داتا دربار اور پھر راوی کے پل کی طرف ہو گیا۔ شیخوپورہ روڈ پر پہنچ کر عمران نے واقعی خیرسگالی کا مظاہرہ کیا۔ سلطان چٹے کو گاڑی سے اتار دیا۔

اب خطرے کی شرح کافی کم ہو چکی تھی۔ سلطان چٹا کسی پی سی او سے فون کر کے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرتا اور انہیں ہمارے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا بھی تو اس میں آدھ پون گھنٹا تو لگ ہی جانا تھا۔ تب تک ہم یقیناً شیخوپورہ اور فارم ہاؤس کے آس پاس پہنچ جاتے۔ بہرحال، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم بحفاظت فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ حاملہ بلی عمران کی گود میں تھی...... اور ویڈیو کیمرا میری گود میں۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے پاس ہی رہیں۔ ہم نے سلطان کے ڈرائیور کو گاڑی سمیت واپس بھیج دیا، یہاں تک کہ ٹرپل ٹو رائفل بھی واپس بھیج دی۔

○......❖......○

ہم کوٹھی میں پہنچے تو وہاں ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ ملازم سہمے ہوئے تھے۔ ملازم وحید کوریڈور میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اسے جلالی صاحب کا تھپڑ سہنا پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی طرح جلالی صاحب کو ایرانی بلیوں کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ اس سلسلے میں ان سے سفید جھوٹ بولا گیا ہے۔ بدھ کی رات کوٹھی میں جہاں اور بہت سے سنگین واقعات ہوئے ہیں، وہاں لاکھوں روپے مالیت کی ایرانی بلیاں بھی جنگلی کتوں نے پھاڑ کھائی ہیں۔ ڈاکٹر مہناز نے ہراساں لہجے میں کہا۔ "بہت برا ہوا ہے۔ جلالی صاحب کا بلڈ پریشر ڈھائی سو سے اوپر چلا گیا تھا۔ ہارٹ بیٹ بھی دوگنا سے بڑھ گئی تھی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ

آج کچھ ہو جائے گا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ ابھی خطرہ ٹلا نہیں۔ میں نے انہیں سکون کا انجکشن دیا ہے اور بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والا کیپسول منہ میں نچوڑا ہے۔ کچھ دیر کے لئے غنودگی میں چلے گئے ہیں لیکن دل کی تکلیف کے سبب انہیں زیادہ غنودگی بھی نقصان دے سکتی ہے۔"

کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ عمران نے کہا۔ "لیکن انہیں پتا کیسے چلا ڈاکٹر...... بلیوں کے بارے میں آپ کے اور ندیم کے سوا کسی کو خبر ہی نہیں تھی؟"

"میں نے تو کسی کو کچھ نہیں بتایا...... اور مجھے یقین ہے کہ ندیم بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے فتح محمد کسی کام سے اوپر گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دوسری منزل کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے۔ وہ اندر چلا گیا۔ وہاں تین پنجرے ہیں۔ تینوں خالی تھے۔ فتح محمد نے آ کر جلالی صاحب کو بتا دیا۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا پھر جب یقین آیا تو قیامت آ گئی۔ وہ اتنا گرجے برسے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ خاص طور سے...... عمران صاحب آپ پر انہیں بہت غصہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آپ نے یا تابش صاحب نے بلیاں کہیں غائب کر دی ہیں یا اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ وہ آپ کے پیچھے بندے دوڑانے لگے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ کام زیادہ بگڑ گیا ہے تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا......"

"آپ نے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو کہنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ بدھ کی رات جہاں اور بہت کچھ ہوا ہے، وہاں ان بلیوں کی بھی موت ہو گئی ہے۔ یہاں گھسنے والوں نے جنگلی کتوں کے غول کو بلیوں والے پنجرے میں گھسا دیا تھا۔ انہوں نے انہیں مار کھایا۔ پنجرے میں بس بلیوں کے بچے کھچے حصے ہی ملے۔ عمران نے اور ہم نے اس خوف سے کہ آپ کو صدمہ ہوگا، یہ خبر آپ سے چھپا لی۔"

عمران سوچ میں پڑ گیا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحبہ! دوسری منزل کا دروازہ کھولا کس نے؟ میں نے وہاں تالا لگایا تھا۔ وہ تالا کس نے کھولا اور فتح محمد کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس نے کھلا ہوا تالا دیکھا ہے؟"

ڈاکٹر مہناز نے ایک ملازم سے کہا کہ وہ فتح محمد کو بلا کر لائے۔ کچھ دیر بعد فتح محمد آ گیا۔ یہ شخص پہلے دن سے مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ ایک دم خاموش اور گہرا شخص تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی بولا۔ "آپ لوگوں کو مجھ پر غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہی کچھ نہیں تھا۔ مجھے تو بس یہ بتایا گیا تھا کہ ایرانی بلیاں دوسری منزل کے پنجرے میں ہیں۔ میں بابے طفیل کے حقے کے لئے سوکھی لکڑیاں لینے اوپر گیا تھا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر پنجروں کی طرف چلا گیا۔ تینوں پنجرے خالی پڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر صاحب جی کو بتا دیا۔"

"دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ تالا تمہیں نظر نہیں آیا؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں، تالا دروازے میں تو نہیں تھا۔ آس پاس بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اگر اس کی چابی صرف آپ کے پاس ہے تو پھر ظاہر ہے کہ اسے کسی نے توڑ کر علیحدہ کر دیا ہوگا۔"

ہم نے دو چار سوال فتح محمد سے مزید پوچھے۔ اس نے جیسے سارے جواب پہلے سے تیار کر رکھے تھے۔

جلالی صاحب ابھی تو سوئے ہوئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ طوفان بہت دیر تک سویا نہیں رہے گا۔ وہ جلد ہی جاگ جائیں گے اور ایک بار پھر بلیوں کے حوالے سے زبردست واویلا مچے گا۔ اس واویلے کے کئی نتیجے نکل سکتے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "حضرت" کی حالت نازک ہو جاتی اور وہ اسپتال پہنچ جاتے۔ ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔

"بلی کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں؟"

"کیا یہ اکیلی بلی جلالی صاحب کے غصے اور صدمے کو کم کر سکے گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"لیکن یہ بچ کیسے گئی؟ ہمارا تو خیال تھا کہ چاروں کا صفایا ہو گیا ہے۔"

"یار! تمہیں محمد علی کلے کا سرائیکی شعر نہیں سنایا تھا جو چپ رہے گی زبان خنجر...... یہی بات مشہور فلم ڈائریکٹر ابولاثر حفیظ جالندھری نے اپنی ایک پشتو فلم میں ایک کردار سے کچھ اور طرح سے کہلوائی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قاتل اور چیچک کا دانہ اپنی نشانی ضرور چھوڑتا ہے۔ اور اگر قاتل کو چیچک بھی ہو تو پھر تو اس کا پکڑا جانا ایک دم یقینی ہے......"

"تمہاری معلومات پر اش اش کرنے کو دل چاہتا ہے۔ چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہو تم۔"

"لیکن میں نے کبھی غرور نہیں کیا۔ اکبر اعظم نے اپنے بڑے بھائی سکندر اعظم کو غالباً پانی پت میں شکست دینے کے بعد کہا تھا...... جو شاخ جتنی پھل دار ہوتی ہے، اتنی ہی جھکی ہوتی ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سکندر اعظم کافی پہلے پیدا ہوا تھا......کوئی پونے دو ہزار سال پہلے۔"

"اسی بات پر تو لڑائی ہوئی تھی۔ اکبر اعظم کا کہنا تھا کہ پہلے اس نے پیدا ہونا تھا۔ اکبر کا تو مطلب ہی ہوتا ہے "بڑا" یعنی بڑا بھائی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اس کا نام اصغر اعظم ہوتا......" وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ صرف دو تین گھنٹے پہلے ہم نہایت

سنگین حالات سے گزرے ہیں...... اور ان حالات میں کم از کم دو افراد کا قتل بھی شامل ہے۔

وہ سیلانی روح تھا اور اور مجھے بھی اپنے ساتھ سیلانی بناتا چلا جا رہا تھا۔ وہ تین منٹ بعد وہ چڑیا گھر والے پورشن کی طرف چلا گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی کام سے گیا ہے لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کوٹھی کے اندرونی حصے سے جلالی صاحب کے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کچھ آگے جا کر سنا۔ وہ اپنے ملازم وحید کو پھر سے بری طرح لتاڑ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ واردات کی رات وحید اور اس کا ایک ساتھی ZOO کی نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وحید پر جلالی صاحب کا غصہ بے وجہ تھا۔ واردات کے وقت جہاں پوری کوٹھی کے گارڈ بے بس ہو گئے تھے، وہاں وحید اکیلا کیا کرتا۔ حملہ آوروں نے رات بھر وہی کیا تھا جو ان کا دل چاہا تھا۔

آوازوں سے اندر کی صورت حال واضح ہو رہی تھی۔ جلالی صاحب گرج رہے تھے۔ گاہے بگاہے ڈاکٹر مہناز کی نرم ملائم آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ وہ جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی عاجزانہ کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جلالی صاحب کے غیظ و غضب کا رخ وحید سے جاوا وغیرہ کی طرف مڑ گیا۔ انہوں نے غائبانہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کو بے نقط سنائیں۔ پھر اندازہ ہوا کہ وہ مقامی ایس ایچ او اکرام کے لتے لینے لگے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص مجرموں سے ملا ہوا ہے۔ اسے ہر اونچ نیچ کی خبر ہے۔ وہ دہاڑ رہے تھے۔

"یہ حرام خور...... غدار ہے۔ جب تک یہ کتا اس تھانے میں موجود ہے، مجھے انصاف نہیں مل سکتا۔ اس نے میرا بیڑا غرق کیا ہے، میں اس کا بیڑا غرق کر دوں گا میں...... اسے ویسے ہی ختم کر دوں گا۔ میں ختم کر دوں گا۔" ان کی آواز غصے کی شدت سے اجنبی محسوس ہونے لگی۔

پھر شاید جلالی صاحب کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ دو تین منٹ بعد ڈاکٹر مہناز ہانپتی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ "تابش! بہت گڑبڑ ہے۔ جلالی صاحب رائفل لوڈ کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ایس ایچ او اکرام خان کی طرف جا رہے ہیں...... اور ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ پورچ تک بھی جا سکیں۔ وہ ضرور اپنا نقصان کر لیں گے۔ انہیں کسی بھی وقت برین ہیمرج یا ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔"

"کیا کیا جائے؟"

"ندیم کو بلاؤ۔ اس کے پاس ایس پی حمزہ صاحب کا فون نمبر ہے۔ شاید وہ جلالی

صاحب کو سنبھال سکیں۔"

اس سے پہلے کہ میں ندیم کی تلاش میں بالائی منزل کی طرف جاتا، عمران کمرے میں داخل ہوا۔ مہناز کا متغیر چہرہ دیکھ کر وہ چونکا۔ "خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

مہناز نے وہ سب کچھ عمران کو بھی بتا دیا جو مجھے بتایا تھا۔ آخر میں وہ بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا صبر اب جواب دے گیا ہے۔ وہ مرنے مارنے کی باتیں کر رہے ہیں اور یہ باتیں ان کی صحت کے لئے بہت خطرناک ہیں...... کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے جناب ابھی تھوڑی دیر میں خود کو کافی بہتر محسوس کریں گے۔"

"لیکن کیسے؟" مہناز نے پوچھا۔

"اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے۔ باقی جو تھوڑی بہت کسر رہ جائے گی، وہ میں ایک تازہ خبر سنا کر پوری کر دوں گا۔"

"تازہ خبر؟" ڈاکٹر مہناز نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں...... آیئے، میرے ساتھ آیئے۔" وہ بڑے ایکشن سے بولا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آگ بگولا جلالی صاحب کے سامنے تھے۔ جلالی صاحب بوٹ پہننے کے لئے موزے چڑھا رہے تھے اور یہی "مشقت" انہیں بری طرح ہانپنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، جلالی صاحب کی بوڑھی ناتواں آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا جیسے کوئی بریدہ پنچھی بے قراری کی انتہا کو چھو رہا ہو اور پھڑپھڑا رہا ہو۔ اس اضطراب کا تعلق یقیناً بدھ کی رات والے خونی واقعات سے تھا۔ جلالی صاحب کو اپنے تین وفادار ملازموں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ ایک درجن کے قریب سخت زخمی ہوئے تھے۔ دو عورتوں کی عزت پامال ہوئی اور بے زبان جانوروں تک کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ جلالی صاحب کا غم وغصہ سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن شدید غم وغصہ جلالی صاحب کی جسمانی حالت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہے تھے اور ان کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ پریشان حال مہناز بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ اس سے آگے میں تھا۔ میرے آگے عمران۔

"کیا بات ہے؟" وہ عمران کو اپنے سامنے دیکھ کر دہاڑے۔ "کیا اب کوئی اور جھوٹ بولنا چاہتے ہو؟"

"نہیں سر! اپنے ایک پہلے جھوٹ پر آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"سر! میں نے اور تابش نے کل شام غلط کہا تھا کہ ہمیں ایک دوست کی شادی پر جانا ہے۔ ہم ایک اور کام سے گئے تھے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس کام کے بارے میں سن کر ضرور خوش ہوں گے۔ دراصل ہم اس شخص کی طرف گئے تھے جس نے بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں قیامت مچائی اور آپ سمیت ہم سب کو بے حد دکھی کیا۔ ہم اس سے دو دو ہاتھ کرنے گئے تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں جی۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو...... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

عمران نے گہری سانس لی اور مسکین لہجے میں بولا۔ "جناب! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم کو گھوم پھر کر کام کرنے کی عادت ہے۔ ہمیں نئے نئے لوگوں سے ملنے میں مزہ آتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں کئی طرح کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ مدراس میں ہم نے سات آٹھ ماہ ایک گینگسٹر کے گھر میں بھی نوکری کی تھی۔ مجبوری تھی جناب! وہ ایک مشہور انڈین ایکٹر کا ماموں تھا۔ ہم نے ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے جناب! اس گینگسٹر سے بھی بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا، وہ آج رات بہت کام آیا ہے سر۔"

جلالی صاحب پھنکارے۔ "اگر تم مسخری کر رہے ہو تو میں بہت بری طرح پیش آنے والا ہوں اور اگر سیریس ہو تو پھر...... یقیناً تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"میں آپ کا خادم، ہوش میں ہوں سر! میں آپ کو زبانی بتاؤں گا تو شاید آپ یقین نہ کریں اور آپ کو مزہ بھی نہ آئے۔ میں آپ کو اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

جلالی صاحب کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مہناز بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تجسس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر عمران اتنا بول رہا ہے تو پھر اس کے پاس کوئی ٹھوس وجہ بھی ہوگی۔

جلالی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عمران نے ویڈیو کیمرے کو سامنے شیشے کی ایک خوبصورت میز پر رکھ دیا۔ ویڈیو کیمرے کی اسکرین تقریباً چھ ضرب چار انچ کی تھی۔ عمران نے ریکارڈنگ چلا دی۔ پہلا منظر ہی چونکا دینے والا تھا۔ سلطان چٹے کے ساتھی کی لاش نیتو عرف کرشمہ کے اوپر پڑی تھی اور بظاہر یوں لگتا تھا کہ کوئی جذبات انگیز کارروائی ہو رہی ہے۔ کیمرا پین کر کے عمران اور سلطان چٹے پر آیا...... عمران نے رائفل کی نال سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی اور کہہ رہا تھا کہ "دکھاؤ دکھاؤ اس کتے کو بھی دکھاؤ، جس نے صاحب کے گھر گھسنے کی

حماقت فرمائی۔"

کیمرے نے حرکت کی اور فرش پر پہلو کے بل پڑے نادرے کی لاش دکھائی۔ اس کا کھوپڑا ٹوٹ چکا تھا اور ٹانگیں خون چکاں تھیں۔ خون ابھی اس کے جسم سے بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ پس منظر میں عمران کی آواز ابھری۔ "اب تم بتاؤ سلطانے تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔"

"مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔" سلطانے نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ کیمرا اس کے تاثرات کو بڑی خوبی سے دکھا رہا تھا۔ سلطان چٹا کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ جاوا جیسے شخص کا قریبی ساتھی تھا۔ ایسے لوگوں کو مرعوب کرنا آسان کام نہیں ہوتا مگر وہ مرعوب ہو چکا تھا اور اس کی وجہ یہ یقین تھا کہ عمران اس کو مار سکتا ہے۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" سلطان چٹے کی ریکارڈ شدہ آواز ابھری۔

"تم نہ آؤ گے تو تمہارا باپ جاوا آئے گا......" عمران نے کرخت لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس کمرے میں دو خون چکاں لاشوں کے درمیان عمران اور سلطانے نے جو بات چیت کی، اس نے بہت کچھ واضح کر دیا۔

جلالی صاحب حیرت سے گنگ سن رہے تھے۔ مہناز کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ہم دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ یہ ایک مکمل فلم بندی تھی۔ عمران نے سلطان کو گن پوائنٹ پر رکھا اور پھر پارکنگ لاٹ میں آ گیا۔ درجنوں لوگوں اور پولیس والوں کے سامنے اس نے زخمی سلطان کو گاڑی میں بٹھایا اور شاہراہِ قائداعظم کی جگمگاتی روشنیوں میں آ گیا۔

عمران نے ہاتھ آگے بڑھا کر کیمرا آف کیا تو جلالی صاحب چونک کر اس ریکارڈنگ کے سحر سے باہر نکل آئے۔ ان کا غیظ و غضب اب ایک طرح کی حیرت میں ڈھل چکا تھا۔

"یہ سب کیا تھا؟" وہ لرزاں آواز میں بولے۔

عمران نے انہیں بتا دیا کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے تھا۔ یہ جان کر جلالی صاحب ششدر رہ گئے کہ ہم کل شام یہاں سے روانہ ہونے کے بعد سیدھے جاوا کے ایک اڈے پر پہنچے تھے اور ہم نے اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے جس نے بدھ کی رات یہاں زبردست خون خرابا کیا۔ عمران نے جلالی صاحب کو یہ نکتہ بھی وضاحت سے بتایا کہ وہ لمبا شخص نادرا ہی تھا جو پشتو لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے پشتو لہجے کا سوانگ رچایا تھا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں

تھی کہ وہ تفتیش وغیرہ کا رخ ریان ولیم کے گروہ کی طرف موڑنا چاہتا تھا۔

ریکارڈنگ میں گاہے بگاہے ایرانی بلی بھی جلالی صاحب کو نظر آئی تھی۔ ان بلیوں میں جلالی صاحب کی جان تھی۔ وہ بلی کو دیکھ کر جذباتی ہو گئے اور بہت سے دیگر سوالوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے۔ "یہ بلی بچ گئی ہے؟"

"جی سر! یہ اکیلی ہی بچی ہے۔"

"کہاں ہے؟" انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

"یہیں میرے پاس ہے۔"

"اور باقی؟"

"وہ اب نہیں ہیں۔" عمران کا لہجہ دکھ آمیز تھا۔ "جنگلی کتوں نے انہیں مار ڈالا۔"

جلالی صاحب کے چہرے پر ایک بار پھر گہرے کرب کے آثار نظر آئے۔

عمران نے کہا۔ "لیکن سر! میں نے آپ سے ایک اچھی خبر سنانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"کیسی......خبر؟"

عمران نے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ "ڈاکٹر! کیا سر جی ہمارے ساتھ Zoo تک جا سکتے ہیں؟"

مہناز نے کہا۔ "ان کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں جانے سے سر جی کی طبیعت میں بہتری آئے گی۔"

مہناز کے اجازت دینے سے پہلے ہی جلالی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے Zoo کے صاف ستھرے پنجرے تک لے آئے۔ رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا لیکن کوٹھی میں بیشتر لوگ جاگ رہے تھے۔ سکیورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز پوری طرح چوکس تھے اور ان کی سائرن بجاتی ایک گاڑی فارم ہاؤس کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہی تھی۔ ایک روشن پنجرے کے سامنے جا کر عمران رک گیا۔ خود مجھے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور ہم اندر چلے گئے اور تب ہم سب بری طرح چونک گئے۔ پنجرے کے ایک گوشے میں نرم پرالی کا بچھونا سا بنا ہوا تھا۔ اس بچھونے پر نایاب ایرانی بلی کے چار خوبصورت بلونگڑے موجود تھے اور ان کی ننھی منی رنگ دار آنکھیں نگینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایرانی بلی انہیں چومنے چاٹنے میں مصروف تھی۔ یہ ایک نہایت خوش کن منظر تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کچھ دیر پہلے عمران مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک کدھر چلا گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بچوں کی ڈیلیوری کا

وقت قریب ہے۔

اس منظر نے واقعی جلالی صاحب پر حیران کن اثر مرتب کیا۔ ان کا جسم پھر کانپنا شروع ہو گیا لیکن اب یہ جسم غصے کی شدت سے نہیں، خوشی سے کانپ رہا تھا...... وہ بچوں کے قریب اکڑوں بیٹھ گئے۔ انہیں انگلی سے چھو چھو کر دیکھتے رہے۔ ان کی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ وہ بھی اپنا جسم جلالی صاحب کے بازوؤں سے رگڑتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ واقعی قابلِ دید تھے۔ ان رنگوں میں وہ اطمینان بھی تھا جو نئی زندگی کو وجود دینے کے بعد کسی ماں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

اچانک جلالی صاحب چونک گئے۔ وہ جیسے کسی سحر سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ بغور مجھے اور عمران کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظریں خاص طور سے عمران کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''آؤ چلیں۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور پنجرے سے نکل آئے۔

پنجرے کو بند کر کے ہم بھی جلالی صاحب کے ساتھ چل دیئے۔ پورچ کی تین چار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ لڑکھڑائے تاہم ڈاکٹر مہناز نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ڈاکٹر مہناز ان کا بی پی چیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ہم دونوں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔

''دیکھو، مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میں سچ سننا پسند کروں گا...... تم کون ہو؟''

عمران نے کہا۔ ''آپ کے...... خادم سر۔''

''ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن تم دونوں باورچی تو ہرگز نہیں ہو۔''

''میں تو سمجھتا ہوں سر...... ہم آپ جیسے بڑے آدمی کے باورچی بننے کے لائق بھی نہیں ہیں۔''

''بات کو گھماؤ پھراؤ مت...... کیا تم بھی اسی چکر میں ہو جس میں دوسرے ہیں؟''

''میرا خیال ہے سر کہ آپ کا اشارہ مورتی والے باکس کی طرف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جناب! اگر ایسا ہوتا تو تابش اس رات آپ کے پیچھے بھاگ کر آپ کو روکتا نہ، جب آپ باکس چیک کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ ہم ان لالچیوں میں نہیں ہیں سر اور نہ ہی کسی حوالے سے آپ کا برا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر کون ہو تم؟''

عمران نے بڑے مطمئن انداز میں اپنی ٹھوڑی کو کھجایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم جلالی صاحب کو بتاؤ تابش!''

''نہیں، تم ہی بتاؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

عمران نے ایک لمبی سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''سر! کہا جاتا ہے کہ دشمن کا دشمن، دوست ہوتا ہے۔ اس حوالے سے آپ ہم ناچیزوں کو دوست بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہمیں آپ کا خادم کہلانا زیادہ اچھا لگتا ہے اور آئندہ بھی لگتا رہے گا۔''

''تم میرے کس دشمن کی بات کر رہے ہو؟''

''انڈین گینگسٹر جاوا کی سر! ہم نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر چھلانگ لگائی ہوئی ہے۔ ایک عرصے سے اس حرامزادے کے ساتھ ٹکر لی ہوئی ہے۔''

جلالی کی سفید بھوؤں کے نیچے ان کی گدلی آنکھوں میں ایک بار پھر شدید حیرت ابھری۔ مہناز بھی حیران تھی اور توجہ سے یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ ''اس حرامی سے تمہارا واسطہ کیسے پڑا؟'' جلالی صاحب نے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے سر! اگر آپ اجازت دیں تو یہ پھر کسی وقت آپ کو سنا دیں گے۔ فی الحال صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چند ہفتے پہلے ہمیں آپ کے اسمِ گرامی کا پتا چلا تھا اور باقی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ باقی باتوں سے میرا مطلب یہی باکس والا چکر ہے جناب! ہمیں اطلاع ملی تھی کہ جاوا اور اس کی پرانی رکھیل دُرِشہوار کسی وجہ سے بار بار فارم ہاؤس کے چکر لگا رہے ہیں اور آپ پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ بس ہماری رگِ عداوت پھڑک اٹھی۔ میں سیدھے سچے لفظوں میں یہی کہوں گا جناب! ہمیں اس بندے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ تین چار سال پہلے اس شخص نے ہمارا جینا حرام کیا تھا، اب ہم اس کا جینا حرام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ عمران اس معاملے میں ریان ولیم کا نام لینا نہیں چاہتا اور اس نے جاوا کے حوالے سے جلالی کو سنانے کے لئے کوئی کہانی گھڑی ہوئی ہے۔ باتوں کے فن میں وہ یکتا تھا۔ اس نے فقط پانچ دس منٹ کے اندر جلالی صاحب کو بڑی حد تک شیشے میں اتار لیا۔ اس نے جلالی صاحب کو باور کرایا کہ ہم دونوں جاوے کی ٹکر کے لوگ ہیں اور اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، فی سبیل اللہ کر رہے ہیں۔ ہمیں جلالی صاحب کے باکس یا کسی اور چیز سے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں نے بھی وقتاً فوقتاً اس گفتگو میں حصہ لیا۔

جلالی صاحب اپنی پتلون کی گیلوس درست کرتے ہوئے بولے۔ ''تم دونوں کی باتوں پر یقین کرنا کافی مشکل ہے لیکن جو ثبوت تم دے رہے ہو، انہیں جھٹلانا بھی آسان نہیں۔ یہاں

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تم جو کچھ جاوے کے ساتھیوں کے ساتھ کر آئے ہو، اس کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ اگر وہ وحشی ہو کر یہاں چڑھ دوڑے تو تم کیا کرو گے؟"

عمران نے جلالی صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "سر! آپ اپنے اس خادم کا پچھلا ریکارڈ دیکھ لیں۔ پچھلے دو چار ہفتوں میں، میں نے جو کچھ کہا ہے، اللہ کے کرم سے درست نکلا ہے۔ اب یہ بات بھی درست نکلے گی کہ جاوا اور سلطان وغیرہ کوئی فوری ردِ عمل ظاہر نہیں کریں گے۔ انہوں نے ہمارے بازو آزمائے ہوئے ہیں اور ہم نے بھی ان کے حوصلے دیکھے ہوئے ہیں۔ ہم چاہتے جناب تو جاوے کے "خصوصی چمچے سلطان" کے علاوہ پانچ چھ مزید بندے بھی پھڑکا سکتے تھے لیکن ہم نے انہیں اتنی ہی سزا دی ہے جو بہت ضروری تھی۔ اس بات کو سلطان اور جاوا بھی ضرور سمجھیں گے۔"

جلالی نے عمران کو گھورا۔ "تم کیا چیز ہو؟ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ میں نے جب اخبار میں باورچی کے لئے اشتہار دیا تھا، مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس اشتہار کے نتیجے میں تم جیسا شخص میرے گھر میں گھس آئے گا۔ تم باورچی بھی ہو۔ جانوروں کے ٹرینر اور ڈاکٹر بھی ہو۔ میراثی بھی ہو اور گینگسٹر بھی...... اور بھی نہ جانے تمہارے کون کون سے روپ سامنے آنے ہیں۔"

عمران نے کمال بے تکلفی سے جلالی صاحب کے استخوانی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا۔ "سر! ہمارا جو روپ بھی ہوگا، وہ آپ کی بھلائی کے لئے ہوگا۔ آپ یقین کریں۔ خاص طور سے جاوا اور اس کے گینگ کے خلاف آپ جو بھی حکم کریں گے، ہم اس کے لئے حاضر ہیں۔ ہمارے اندر ان لوگوں کے لئے آگ ہے۔ ہم ان کے دانت ان شاء اللہ اس طرح کھٹے کریں گے کہ ان کے پاس...... دانت نکلوانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔"

جلالی صاحب کا پارا چڑھتے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگتا تھا۔ عمران نے جس طرح ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا، وہ بھڑک بھی سکتے تھے لیکن مجھے اور مہناز کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جلالی صاحب خاموش رہے۔ شاید وہ ٹھیک کہتا تھا کہ جس کو چھوتا ہے، اسے موم کر دیتا ہے۔ اگر نہ کر سکا تو اس لڑکی کو نہ کر سکا جو اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی تھی۔ جلالی صاحب نے اپنا دوسرا ہاتھ عمران کے ہاتھ پر رکھا اور قدرے کمزور لہجے میں بولے۔ "میں جانتا ہوں، تم بہت سی غلط بیانیاں کر رہے ہو مگر اوور آل تم برے نہیں ہو...... کیونکہ جو برائی کو ختم کرتا ہے، وہ عموماً خود برا نہیں ہوتا۔ اس لمبے شیطان کو مار کر تم نے ایک بڑی برائی کو ختم کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کام ان حرام خور پولیس والوں کے کرنے کا تھا، وہ تم نے کیا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ

میں اپنا کلیجا ٹھنڈا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں اپنے ملازموں اور ساتھیوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کر سکتا ہوں۔"

پھر جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہوئے۔ "وہ کہاں ہے رخشی...... اور دوسری زرینہ؟"

"مہناز نے کہا۔ "سر! رخشی تو ابھی اسپتال میں ہے۔ تین چار دن تک ہی آ سکے گی۔ زرینہ یہیں ہے اپنے کمرے میں۔ اس کا بچہ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اسے کافی زیادہ مقدار میں کف سیرپ پلایا گیا تھا۔ ابھی تک اس کا پیٹ خراب ہے۔"

جلالی صاحب نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ ریکارڈنگ ان دونوں لڑکیوں کو ضرور دکھانی ہے۔ کم از کم اس کے وہ حصے جن میں تم دونوں کی شکلیں نظر نہیں آتیں۔ اس سے ان بے چاریوں کے زخموں پر تھوڑا بہت مرہم رکھا جائے گا۔"

ہم ابھی تک کھڑے تھے، جلالی صاحب کو اس کا احساس ہوا۔ انہوں نے ہمیں اپنے سامنے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ ہم بیٹھ گئے۔ انہوں نے ملازم کو بلایا اور چائے کا آرڈر دیا۔ ملازم پریشانی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ جلالی صاحب بھول رہے تھے کہ وہ جن کے لئے چائے منگوا رہے ہیں، انہوں نے ہی تو چائے بنانی ہے۔

جلالی صاحب کے روکتے روکتے عمران اٹھا اور ملازم کے ساتھ کچن میں آ گیا۔ چائے وغیرہ تیار کر کے اس نے ٹرالی میں رکھی اور اسے خود ہی دھکیلتا ہوا لے آیا۔ ایسے کاموں کے لئے اس میں بے پناہ انکساری موجود تھی۔

اس دوران میں جلالی صاحب نے سیکیورٹی گارڈز کے انچارج اور دوسیکنڈ انچارج کو فون کئے اور انہیں کوٹھی کی سیکیورٹی ہائی الرٹ کرنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے انچارج سے یہ بھی کہا کہ اے گریڈ کے کم از کم دس گارڈز کا مزید انتظام کیا جائے۔

چائے کے دوران میں جلالی صاحب نے ہمارے بارے میں کئی سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے لئے ہم دونوں پہلے سے تیار تھے۔ دو تین سوالات کا جواب دینے سے عمران نے بڑی معذرت کے ساتھ احتراز کیا۔ جلالی صاحب زبردست موڈ میں تھے۔ انہوں نے اس معذرت کو قبول کیا۔

عمران نے کھنکھار کر گلا صاف کیا لیکن پھر خود بولنے کے بجائے ڈاکٹر مہناز کو بولنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو دیکھا۔ وہ اپنے ٹیڈی کتے کو پچکارنے میں مصروف تھے۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ "سر! چند دن پہلے ایک اور اہم واقعہ ہوا تھا......

ہم نے آپ کو اس کے بارے میں صرف اس لئے نہیں بتایا کہ آپ کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں تھی۔''

جلالی صاحب چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''تم لوگوں نے جو جو کچھ چھپایا ہوا ہے، وہ آج بتا ہی دو تا کہ یہ ٹینشن ختم ہو۔''

مہناز نے کہا۔''سر! میں آپ کو مختار ملک کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ وہ...... وہ سیڑھیوں سے گر کر نہیں مرا تھا۔''

''تو پھر؟''

مہناز نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران اپنی جادو اثر آواز میں بولا۔''سر! مختار ملک دراصل جاوے کا مخبر تھا۔ وہ چھپ کر تابش اور ڈاکٹر مہناز کی باتیں سن رہا تھا۔ تابش کو پتا چل گیا۔ اس خبیث نے ایک چھرے سے تابش پر قاتلانہ حملہ کیا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور اس کی جان چلی گئی۔''

عمران نے اس واقعے کی دیگر تفصیل بھی جلالی صاحب کے گوش گزار کی۔ آخر میں جلالی صاحب بولے۔

''بہت خوب بھئی، بہت خوب۔ تم لوگ میرے ہی گھر میں رہ کر مجھ سے راز داریاں برت رہے ہو۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے حکومت کے اندر حکومت قائم کر لی جائے۔''

''معافی چاہتے ہیں جناب۔'' عمران لجاجت سے بولا۔''ہمیں پتا تھا، آپ بڑے دل کے مالک ہیں۔ اس گستاخی کو درگزر کریں گے۔ ڈاکٹر مہناز تو ہر صورت آپ کو آگاہ کرنا چاہتی تھی مگر ہماری پُر زور درخواست پر انہوں نے چند دن چپ رہنے کی ہامی بھری۔''

''کچھ اور بتانا ہے تو وہ بھی بتا ڈالو۔'' جلالی کا لہجہ نارمل ہی تھا۔

عمران مسکرایا۔''بس ایک چھوٹی سی بات اور تھی۔ تابش کو کنگ وغیرہ بالکل نہیں جانتا۔ اس حوالے سے ہماری درخواست پر ڈاکٹر مہناز، تابش کی مدد کر رہی ہیں۔''

جلالی نے چشمے کے پیچھے سے مہناز کو گھورا اور بولے۔''اس بات کا تو مجھے بھی شک تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ جو ہر وقت کچن میں گھسی رہتی ہے، اس میں کوئی چکر ہے۔''

جلالی صاحب کا اچھا موڈ دیکھتے ہوئے عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے کہا۔''سر! ایک التجا ہے۔ یہاں ایک دو بندے ایسے ضرور موجود ہیں جو ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ فی الحال ہماری باورچیوں والی حیثیت برقرار رکھئے۔ اس حیثیت سے ہم زیادہ محفوظ رہیں گے اور زیادہ کارآمد بھی ثابت ہوں گے۔''

جلالی بولے۔''تمہاری اس آخری بات میں وزن ہے۔ تم لوگ مار دھاڑ کے ماہر لگتے ہو۔ اور مار دھاڑ کا ماحول یہاں کسی بھی وقت بن سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عمران کی ضرورت Zoo میں ہے۔ بہر حال، مجھے اس بارے میں سوچنے کا موقع دو۔ میں تمہیں کل صبح تک اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گا۔''

مختار ملک والے واقعے کے بارے میں انہوں نے ہم تینوں سے مزید پوچھ گچھ کی اور اس واقعے پر حیرت آمیز غصے کا اظہار کرتے رہے۔ بہر حال، اس غصے میں ایک طرح کی ستائش بھی چھپی ہوئی تھی۔ درحقیقت ان کا موڈ بتدریج بہتر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عام حالات میں بھی انہیں تھانے کچہری کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھے، جب بندہ اکثر اندیشوں اور خطروں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

باتیں کرتے ہوئے، جلالی صاحب کا ہاتھ...... ڈاکٹر مہناز کے کندھے پر تھا۔ وہ جیسے بے دھیانی میں گاہے بگاہے اس کے گداز کندھے کو مسلنے لگتے یا اس کے بالوں کو سہلانے لگتے۔ جلالی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو ہمارے لئے ابھی تک پُر اسرار تھا۔ ان کے اندر جیسے کوئی خلا سا تھا، کوئی طلب، کوئی بھوک سی۔ وہ حسن پرست بھی تھے۔ اپنے اردگرد خوب صورت ملازماؤں کو جگہ دیتے تھے اور رخشی جیسی کچھ لڑکیاں ان کے بہت قریب بھی رہی تھیں۔ اس سب کے باوجود ان کے طرزِ عمل میں گناہ یا ہوس کاری کا عمل دخل نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے بھی وہ عمر کے اس دور میں تھے جہاں انسان کی کیمسٹری بہت حد تک بدل جاتی ہے۔

اس روز جلالی صاحب کافی حد تک مطمئن بلکہ خوش نظر آئے۔ انہوں نے اپنے Zoo میں جا کر تادیر عمران سے بھی ملاقات کی۔ بلی کے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ ناتوانی کے باوجود اپنے ٹیڈی کتے کے ساتھ شام کے وقت باغیچے کی روش پر چہل قدمی کرتے رہے۔ مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ عام لوگوں کے سامنے وہ مہناز کے ساتھ کسی خصوصی لگاؤ کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر میں جان چکا تھا کہ یہ لگاؤ موجود ہے۔

اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا اور اس نے مجھے چونکایا۔ یہاں کے دستور کے مطابق ٹھیک نو بجے ڈنر کر لیا گیا تھا۔ کوٹھی کے اردگرد پہرے داروں کا گشت شروع ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، ڈاکٹر مہناز معمول کے مطابق جلالی صاحب کو دوا وغیرہ کھلا کر ان کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور گورے چٹے بازو دودھیا بلب کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ اسٹیتھو اسکوپ اس کے گلے میں تھا۔ کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے وہ ذرا رکی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے دائیں

بائیں دیکھا۔ جیب سے ایک رومال نکالا اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ دودھیا بلب دیوار پر قریباً سات فٹ کی بلندی پر لگا ہوا تھا۔ اس نے گرم بلب کو رومال کے ذریعے ہولڈر میں سے نکالا۔ کوریڈور میں تاریکی چھا گئی۔ مہناز کا ہیولا آگے بڑھ گیا۔

میں حیران ہوا۔ دو تین دن پہلے بھی ایسا واقعہ ہوا تھا۔ میں نے ایک ملازمہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ کوریڈور کا بلب نہیں ہے۔ تو کیا وہ بلب بھی ڈاکٹر مہناز نے اتارا تھا؟ خیر، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ بلب چوری کرتی ہو گی۔ یہ یقیناً کوئی اور چکر تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ شاید رات کسی وقت اسی کوریڈور سے گزر کر مہناز کو پھر سے جلالی صاحب کے کمرے میں جانا ہوا اور وہ اس آمدورفت کو دوسروں سے چھپانا چاہتی ہو۔

ایک بار یہ بات میرے ذہن میں آ گئی تو پھر تجسس بڑھتا چلا گیا۔ میں اپنے کمرے کی نیم تاریک بالکونی میں آ گیا۔ یہاں بیٹھ کر میں ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا اور امید تھی کہ ڈاکٹر مجھے دیکھ نہیں سکے گی۔ دس بجے کے قریب ایک ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ مہناز نے دروازہ کھولا، اب وہ براؤن پھولوں والی ایک گلابی نائٹی میں نظر آ رہی تھی۔ بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ رکھے تھے۔ ملازمہ نے رات کی رانی اور نرگس کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا دستہ مہناز کو تھما دیا۔ اس نے پھولوں کی سونگھا اور شکریہ ادا کر کے دروازہ بند کر لیا۔

میں بالکونی کی تاریکی میں سمٹا بیٹھا رہا۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتوں کا شور تھا۔ دور فاصلے پر پیٹرولنگ گاڑی کی نیلی روشنی بھی حرکت کرتی نظر آتی تھی۔ Zoo کی طرف سے کسی بندر کی طویل آواز ابھرتی اور سناٹے کو چیر جاتی۔ میرے اردگرد مچھر منڈلا رہے تھے۔ میں بے سکونی محسوس کر رہا تھا، اس کے باوجود اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ رات کا ایک بج گیا تھا مجھے مایوسی ہونے لگی۔ شاید میرا اندازہ غلط تھا۔ میں دس پندرہ منٹ بعد اٹھنے کا سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور میں نے ڈاکٹر مہناز کا ہیولا دیکھا۔ وہ کہیں جا رہی تھی۔

میں نے بھی بالکونی چھوڑی اور کمرے میں آ گیا۔ اب میں نے آنکھیں کھڑکی کی اس درز سے لگا دیں جہاں سے دس بجے کے قریب میں نے مہناز کو گزرتے دیکھا تھا...... کوریڈور تاریک تھا۔ بہت کوشش کر کے میں اس کا بس مدھم سا ہیولا ہی دیکھ پایا...... وہ جلالی صاحب کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرا شک درست نکلا تھا۔ میں نے تقریباً آدھ گھنٹا وہیں انتظار

کیا۔ مہناز کی واپسی نہیں ہوئی۔ میں نے عمران کو فون کیا۔ وہ چڑیا گھر والے پورشن کے لگژری اپارٹمنٹ میں ہی سوتا تھا۔ شاید وہ سویا ہوا تھا۔ میری دوسری کوشش میں اس نے کال اٹینڈ کی۔ ''کیا کھایا تھا تم نے جو آدھی رات کو مروڑ اٹھ رہا ہے؟'' اس نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بکواس نہ کرو۔ ایک اہم اطلاع دے رہا ہوں تمہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''کیا ہوا؟ ریما جی نے نرگس کو شوٹ کر دیا؟'' وہ بھی سرگوشی میں بولا۔

''وہ دونوں مل کر تمہیں شوٹ کریں گی۔ اس وقت یہاں ایک اور چکر چل رہا ہے......''

میں نے عمران کو ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا، کہنے لگا۔ ''تمہاری سراغ رسانی تو اچھی جا رہی ہے۔ کیا کچھ اور پتا چل سکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کمرے کے اندر کے حالات۔ کسی بہانے تم بزرگوار کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے ہو یا کوئی اور طریقہ......''

''بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔'' میں نے موبائل آف کیا اور ایک بار پھر کوریڈور کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں تاریکی اور سکوت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہیں کوئی آہٹ، کوئی حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔ میرے کمرے میں وال کلاک کی ٹک ٹک کی آواز تھی۔

میں نے سلیپر پہنے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ تاریک کوریڈور میں سے گزر کر جلالی صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ دروازے کی نچلی درز سے پتا چلتا تھا کہ اندر بہت ہلکی روشنی والا نیلگوں بلب آن ہے۔ گراموفون یا کیسٹ پلیئر پر سہگل کا کوئی بہت پرانا گیت دھیمی آواز میں پلے ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس بیڈروم کا ایک چھوٹا دروازہ عقبی برآمدے کی طرف بھی ہے۔ اس دروازے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اگر جلالی صاحب کو کسی وقت فوری طبی امداد کی ضرورت ہو تو انہیں یہیں سے نکال کر فوراً گاڑی میں پہنچایا جا سکے۔

میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ کسی کمرے سے بابے طفیل کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ عقبی صحن میں کوئی آوارہ بلی کسی ساتھی کو آواز دے رہی تھی۔ میں برآمدے پہنچا، یہاں تاریکی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں اردگرد دیکھا پھر دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ مجھے کمرے کا ایک چوتھائی حصہ نظر آنے لگا۔ اس چوتھائی حصے میں قالین اور ایک سینٹر

ٹیبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے ٹیبل پر وہی گلدستہ پڑا نظر آیا جو کچھ دیر پہلے ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے میں پہنچایا تھا۔ پھر ایک اور چیز نظر آئی اور اس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ بے شک میں کمرے میں اور کچھ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس ایک "چیز" کی دید نے کمرے کا ایک غائبانہ نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا اور یہ نقشہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

سینٹر ٹیبل کے ساتھ ہی نیچے قالین پر براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی پڑی تھی۔ بابے طفیل کی کھانسی کی آواز پھر ابھری۔ ساتھ ہی اس کی بیوی کی مدھم آواز سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے بابا طفیل اٹھ کر پانی وغیرہ پینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرا یہاں رکنا اب مناسب نہیں تھا۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹا اور جس طرح یہاں آیا تھا، اسی طرح دبے پاؤں واپس چلا گیا۔

کمرے میں آ کر میں بستر پر نیم دراز ہوا اور اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی آنکھوں کے سامنے کھلتی چلی گئی جس طرح کسی درخت کا ایک پتا دیکھنے کے بعد سارے درخت کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، صرف اس ایک نائٹی کے منظر نے پورے کمرے کا ماحول آشکار کر دیا تھا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مہناز اپنے انوکھے مریض کے ساتھ موجود تھی اور عجیب انداز سے موجود تھی۔

کیا ڈاکٹر مہناز اس حد تک جا سکتی ہے اور اگر جا سکتی ہے...... اور چلی گئی ہے تو کیوں؟ وہ ہر لحاظ سے ایک معقول لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور دانش مند بھی تھی۔ اس کے کردار کی کوئی کمزوری ابھی تک میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ہر لحاظ سے غلط ہے؟ اس کے لئے کوئی جواز بھی پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کتنی بھی رعایت برتی جائے، بطور ڈاکٹر اور معالج بھی مہناز کو اس طرح کی کوئی "گنجائش" نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ گنجائش پیدا کی ہوئی تھی۔

مہناز کی واپسی رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ جس خاموشی سے آئی تھی، اسی خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ میں نے فون پر عمران کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی میری ہی طرح جاگ رہا تھا۔ صبح میں نے دیکھا تو کوریڈور میں بلب پھر سے موجود تھا۔

پچھلی رات کا بیشتر حصہ تناؤ اور سنسنی کی کیفیت میں ہی گزرا تھا۔ ایک تو یہ ڈاکٹر مہناز والی سنسنی تھی، دوسری اس کارروائی والی جو ہم پیر کی رات کو لاہور میں انجام دے کر آئے تھے۔ عمران نے نہایت دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاوا کے قریبی ساتھی نادر کو

اس کے ایک ہمنوا سمیت ان کے ڈیرے میں گھس کر ہلاک کیا تھا اور با قاعدہ اس کی ویڈیو فلم بھی بنائی تھی۔ کچھ بھی تھا، میرے ذہن میں یہ شدید اندیشہ موجود تھا کہ جاوا کی طرف سے کوئی نہایت سخت ردِعمل ظاہر ہوگا لیکن عمران مطمئن تھا۔ کل رات بھی جب میں نے سے مہناز کے بارے میں بتانے کے لئے موبائل پر کال کی تو وہ اطمینان سے سو رہا تھا۔ کوٹھی اور فارم میں سکیورٹی ہائی الرٹ تھی۔ کوئی شخص بھی مکمل شناخت اور دو تین جگہ تلاشی دینے کے بعد ہی فارم کی حدود میں داخل ہو سکتا تھا۔

دوپہر گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے دیکھا، ڈاکٹر مہناز سبز رنگ کا سلکی سوٹ پہنے، خوش رنگ ربن میں بال باندھے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے، اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ جلالی صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ میری اور مہناز کی نگاہیں ملیں۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ہم دونوں نے سر کے اشارے سے ایک دوسرے کو سلام کیا پھر وہ شڑاپ سے چھوٹے ڈرائنگ روم میں اوجھل ہو گئی۔

میں کچن کے اسٹول پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ انسان بھی کیا الجھی ہوئی پیچ در پیچ شے ہے۔ اب اس دُھلے دُھلائے چہرے والی ڈاکٹر مہناز کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کل شب ایک اور ساڑھے تین بجے کے درمیان وہ کہاں تھی؟

جلالی صاحب پر یہ بات اب عیاں ہو چکی تھی کہ ہم دونوں باورچی نہیں ہیں بلکہ میں تو کوکنگ کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہوں اور اب تک ڈاکٹر مہناز میری مدد کرتی رہی ہے۔ اب جلالی صاحب نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کو میری مدد کے لئے کچن کی ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ کل سے کچن کا بیشتر کام وہی کر رہی تھی۔ میں نے کندھوں میں اور دونوں کہنیوں میں شدید درد کا بہانہ کیا ہوا تھا اور ڈاکٹر مہناز کی ہدایت کے مطابق مکمل آرام ہی کر رہا تھا۔ اس وقت بھی رضیہ دو عدد دیسی چوزوں کا گوشت بھوننے میں مصروف تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مائیکروفون آن کر کے جلالی اور مہناز کی گفتگو سننے کی کوشش کروں۔ جونہی گوشت بھونا گیا اور رضیہ نے اس میں پانی ڈالا، میں نے اس سے کہا کہ وہ مٹن کا پیاز بنانے کے لئے برآمدے میں بیٹھ کر پیاز وغیرہ کاٹ لے۔ میں مرغی کا سالن دیکھ لوں گا...... وہ باہر چلی گئی تو میں نے کچن کیبنٹ کھول کر ڈیکوریشن پیس میں چھپائے ہوئے ریسیور کو آن کیا اور آواز کو مطلوبہ حد تک کھول لیا۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں، پھر مائیکروفون کے بالکل قریب سے مہناز کی نکھری ہوئی واضح آواز سنائی دی۔ "سر! میں دعوے سے کہتی ہوں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے اور میرے ساتھ......"

"کیا، میرے ساتھ؟" جلالی نے پوچھا۔

"میرے ساتھ ہنی مون پر کاغان اور ناران چلیں گے۔"

"تم ایک بے وقوف...... احمق لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔ ایک ایسے شخص پر محبت کرنے کا دعویٰ کر رہی ہو جو مدت ہوئی مر چکا ہے۔"

"محبت مردہ جسموں میں زندگی دوڑاتی ہے سر...... ناممکن کو ممکن کرتی ہے۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ جو درخت جڑوں سے اکھڑ کر ہزار سال تک ریت میں دبا رہا ہو اس پر ہرے بھرے پتے کون لگا سکتا ہے؟"

"جناب! آپ درخت نہیں ہیں اور نہ ہزار سال سے ریت میں دبے ہوئے ہیں۔" جلالی صاحب نے کھانستے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس انوکھی شادی کے ذریعے اپنا نام گنیز بک آف ریکارڈز میں درج کرانا چاہتی ہو تو تمہیں زبردست ناکامی ہونے والی ہے۔"

"محبت کسی شہرت کی محتاج نہیں ہوتی سر! یہ تو اپنے آپ میں ایک اعزاز ہوتی ہے۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر جلالی صاحب کی بوڑھی آواز سنائی دی۔ "میرا خیال ہے اپنی ماں کو اس نکاح کے بارے میں بتا ہی دو تو اچھا ہے۔"

وہ الھڑ انداز میں بولی۔ "سر! آپ کیوں اتنی جلدی رنڈوا ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ وہ میرا سر توڑ دیں گی...... لیکن مجھے اپنے سر کی اتنی پروا نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ آپ سے کوئی سخت بات نہ کہہ دیں۔ میں سچ کہتی ہوں سر! آپ کی ذرا سی...... بالکل ذرا سی توہین بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم ایک بے وقوف ضدی لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔"

"کیا ایک ڈاکٹر بھی نہیں ہوں؟"

خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد جلالی صاحب کی آواز ابھری۔ "ڈاکٹر تو ہو۔"

"تو پھر جناب! چپ چاپ بیٹھ جائیے۔ میں نے آپ کا ٹمپریچر لینا ہے اور بی پی چیک کرنا ہے۔"

مائیکروفون کے ریسیور پر خاموشی چھا گئی۔ میں ششدر تھا۔ اپنی سماعت پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جو کچھ سنا تھا، اس سے انکشاف ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز نے خفیہ طور پر جلالی صاحب سے نکاح پڑھوالیا ہے اور یہ تعجب خیز واقعہ شاید پچھلے دو چار دن کے اندر ہی عمل میں آیا تھا اور یہ سنسنی خیز خبر جلد از جلد عمران کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

اسی دوران میں ریسیور سے پھر مدھم آوازیں ابھرنے لگیں۔ پہلے ڈاکٹر مہناز نے قدرے فاصلے سے کچھ کہا جو واضح سنائی نہیں دیا...... پھر جلالی کی بالکل صاف آواز ابھری۔

''ان دونوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے مہناز؟''

مہناز نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''سر! جو کچھ انہوں نے کہا ہے، وہ تو واقعی حیران کن ہے۔ اگر ویڈیو ثبوت نہ ہوتا تو اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ نادر کے جسم پر وہ کھرونچے والی بات بھی انہوں نے بالکل درست بتائی ہے۔ میں نے خودرخشی کے ناخنوں میں خون اور گوشت کی آلائش دیکھی تھی......''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر معمولی نہیں ہیں تو پھر ہمیں بھی ان کی طرف سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے گھر میں ہیں اور ہر وقت ہمارے قریب موجود ہیں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟''

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد مہناز نے کہا۔ ''سر پتا نہیں کیوں، اس بارے میں میری رائے بری نہیں ہے۔ اگر میری رائے بری ہوئی تو میں اسی روز آپ کو سب کچھ بتا دیتی جب مختار ملک کی موت والا واقعہ ہوا تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ سر کہ یہ لوگ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''تو کیا پھر ان کی یہ بات درست سمجھی جائے کہ یہ جاوے کے گروپ سے اپنی پرانی دشمنی کی وجہ سے یہاں موجود ہیں؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔'' مہناز نے کہا۔

''لیکن اگر ایسا ہے تو پھر یہی مطلب ہوا نا کہ یہ بھی گینگسٹر ہیں۔ پھر ان کی اس بات پر کیسے اعتبار کیا جائے کہ انہیں یہاں کے دیگر حالات سے کوئی دلچسپی نہیں...... جن میں مورتی والے باکس کا معاملہ بھی ہے۔''

''ہاں، اس بات پر پوری طرح یقین کرنا تو مشکل ہے سر۔''

''میں نے آج بھی عمران سے دیر تک بات کی ہے۔ اس بندے میں بہت سے ''گٹس'' ہیں۔ اگر اس کے بارے میں بلکہ ان دونوں کے بارے میں ''چھپے رستم'' والی بات کہی جائے تو شاید غلط نہ ہو......''

اچانک رضیہ کے بھاری اور تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ مجھے مائیکروفون کا ریسیور آف کرنا پڑا۔ وہ ایک بڑی ٹرے میں پیاز اور ٹماٹر وغیرہ کاٹ کر لے آئی تھی۔ پیاز کی وجہ سے اس کے آنسو نکل رہے تھے۔ مجھے عمران کی بات یاد آ گئی۔ اس نے شروع میں کہا تھا کہ

میں تو یہاں پیاز کاٹ کاٹ کر مینا کماری بن گیا ہوں۔ یہاں پیاز واقعی بہت استعمال ہوتی تھی۔

موقع ملتے ہی میں نے عمران کو وہ دھماکا خیز خبر سنائی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ تک پہنچی تھی۔ عمران اور میں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر ڈاکٹر مہناز نے واقعی ایک انوکھا کام کیا تھا۔ ایک ایسی باغیانہ روش جو رسموں، روایتوں اور معاشرتی بندھنوں کو چیرتی ہوئی گزرتی تھی۔ شاید یہ سب کچھ ایک حادثے کا ردِعمل تھا۔ اس کی جڑیں اس المیے میں تھیں جو منگنی ٹوٹنے کی صورت میں مہناز کے ساتھ ہوا تھا۔ ڈاکٹر لائبہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت خوبرو لیکن گھمنڈی نوجوان تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ تن سازی کا شوق بھی رکھتا تھا۔ پنجاب کی سطح پر اس نے کافی نام کمایا تھا۔ پھر وہ کراچی کے ایک مال دار میمن کی بیٹی سے شادی کر کے کینیڈا چلا گیا......

شام تک کا وقت بخیریت گزر گیا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس کی سکیورٹی بدستور ہائی الرٹ تھی۔ جاوا گروپ کی طرف سے فوری ردِعمل کا خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر اندیشے بدستور موجود تھے۔ ان میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ شاید کسی طرح پولیس میں دہرے قتل کی رپورٹ کر دی جائے گی اور متعلقہ پولیس نادرے کے ''قاتلوں'' کو پکڑنے کے لئے یہاں فارم ہاؤس میں آ دھمکے گی۔ بہرحال، ان اندیشوں میں سے کسی نے ابھی تک حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا اور عمران کا سکون و اطمینان دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید یہ اندیشے حقیقت کا روپ دھاریں گے بھی نہیں۔ عمران نے ایک بات کی تاکید مجھے ضرور کی تھی اور وہ یہ کہ میں ابھی فارم ہاؤس کی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اس سلسلے میں محتاط تھا۔ شام کے فوراً بعد جلالی صاحب سے بڑے اچھے ماحول میں طویل گفتگو ہوئی۔ عمران کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر مہناز کے سوا کوٹھی میں موجود کسی شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اب ہماری حیثیت ''باورچی'' کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جلالی صاحب نے یہ میٹنگ ایک بند کمرے میں رکھی تھی اور کسی کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سیکرٹری ندیم ویسے ہی فارم ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔ وہ بلی کے نومولود بچوں کے لئے کچھ ادویات اور ویکسین وغیرہ لینے کے لئے لاہور گیا ہوا تھا۔ ویٹرنری ڈاکٹر عدیل بھی اس کے ساتھ تھا۔

آج ہم جلالی صاحب کے برابر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ جلالی صاحب کا موڈ اچھا تھا اور ان کا رویہ بھی ہمارے ساتھ دوستانہ تھا۔ انہوں نے عمران سے کہا۔ ''جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ تم دونوں کی نظر میں کیسا ہے؟ میرا مطلب ہے باکس کے حوالے سے؟''

عمران نے کہا۔ ''آپ کا رویہ سو فیصد قابلِ تعریف ہے۔ اور جناب! یہی وجہ ہے شاید کہ ہم ناچیز بھی اپنی ہمت کے مطابق آپ کی مدد کے لئے یہاں موجود ہیں۔ اس سارے کام میں آپ کا اپنا کوئی لالچ نہیں۔ آپ نے اس بات پر اسٹینڈ لیا ہے کہ وہ باکس آپ کے پاس کسی نامعلوم بندے کی امانت ہے اور جب وہ بندہ آپ سے رابطہ کرے گا تو آپ اسے لوٹا دیں گے۔''

مہناز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''لیکن سر! اس امانت کی حفاظت کے لئے آپ کو جو مشکلات اٹھانا پڑ رہی ہیں، وہ آپ کی صحت پر بہت بھاری ہیں۔ آپ...... اپنی ہمت سے زیادہ...... مزاحمت کر رہے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے میری ہمت کو...... کیا میں چلتے چلتے گر پڑا ہوں؟ کیا میں نے بستر پر پیشاب کر دیا ہے؟ تم بھی ان لوگوں جیسی باتیں کرتی ہو جو سمجھتے ہیں کہ میری ٹانگیں قبر میں جھول رہی ہیں۔''

''نہیں سر...... خدانخواستہ ایسی بات نہیں لیکن آپ بیمار تو ہیں نا۔'' مہناز نے جلدی سے کہا۔

لیکن جلالی صاحب ہتھے سے اکھڑ چکے تھے۔ گرج کر بولے۔ ''بیمار...... بیمار...... بیمار! میں عاجز آ چکا ہوں اس لفظ سے۔ تمہاری صورتیں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ تم کفن اور صابن تولیا لے کر میرے سرہانے بیٹھے ہو۔ میری سانسیں گن رہے ہو۔ میں زندہ ہوں...... ابھی میں زندہ ہوں۔ میں اپنے سارے فیصلے خود کروں گا۔ مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ نہ مجھے کسی سے مشورہ کرنا ہے......''

''سر! میں تو کہہ رہی تھی......''

''میں جانتا ہوں تم کیا کہہ رہی تھیں۔ تم لوگ میرے منہ پر کچھ اور کہتے ہو، میرے پیٹھ پیچھے کچھ اور...... مجھے ناکارہ اور سنکی سمجھتے ہو۔ منافق ہو تم لوگ، جھوٹے ہو۔ مجھے ایسے لوگوں کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ...... اٹھ جاؤ......''

مہناز کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میرے اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران جلدی سے بولا۔ ''سر! ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں لیکن بلیوں کے بارے میں جو ضروری بات میں نے آپ سے کرنی تھی...... وہ تو یہیں رہ جائے گی۔''

جلالی صاحب کی دکھتی رگ پر ہاتھ آیا تھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر اب طیش کے ساتھ ساتھ الجھن اور تجسس بھی نظر آیا۔ وہ خاموش رہے۔

عمران نے کہا۔''اگر آپ کی اجازت نہیں تو میں صبح آ جاؤں گا۔''

جلالی صاحب نے عجیب تاثرات کے ساتھ عمران کو دیکھا، جیسے نہ چاہنے کے باوجود کوئی کڑوی دوا پی رہے ہوں۔''کیا بات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''سر! ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو گیا ہے کہ یہ چاروں بلونگڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک بلونگڑا ہے۔ میں پوری تفتیش کر کے آیا ہوں۔ اگر تھوڑا بہت شک ہے بھی تو صبح تک دور ہو جائے گا۔ یہ دیکھیں جی...... یہ ڈیجیٹل کیمرے سے میں نے بلونگڑے کے پچھلے پورشن کی تصویریں بھی لی ہیں۔'' اس نے جیب سے کیمرا نکالا اور اسے آن کر کے ڈس پلے اسکرین (مانیٹر) پر جلالی صاحب کو تصویریں دکھانے لگا۔''یہ دیکھیں سر اس تصویر کو زوم کریں...... کچھ اور زوم کریں...... یہ دیکھیں نر کی نشانی۔ کافی بڑی ہے لیکن سیاہ دھبے کی وجہ سے پتا ہی نہیں چل رہا تھا......''

''ہاں...... یہاں سیاہ دھبا تھا نا۔'' جلالی صاحب نے اپنی مڑی ہوئی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

دو تین منٹ بعد یہ کیفیت تھی کہ جلالی صاحب اور عمران کندھے سے کندھا بھڑائے بیٹھے تھے۔ تصویریں دیکھ رہے تھے اور مہناز کی موجودگی میں ہی بلونگڑوں کی زنانہ مردانہ صفات پر سیر حاصل بحث کر رہے تھے۔ جلالی صاحب کے ماتھے کے بل بتدریج کم ہو رہے تھے...... عمران کی جادو بیانی کام کر رہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عمران نے ایک دم پلٹا مارا اور بولا۔''سر! مجھے یقین ہے ایسی خوبصورت آنکھوں والی بلیاں تو ایران میں بھی اب شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہوں گی۔ آپ ان کی ملکیت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی جب یہ باکس والی پریشانی دور ہو جائے گی تو آپ صحیح طور پر ان بلونگڑوں اور ان کی ماں کی محبت سے لطف اندوز ہو سکیں گے......''

باکس کے ذکر پر جلالی صاحب نے کیمرا ایک طرف رکھ دیا اور پھر سے گہری سنجیدگی نے ان کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ شاید چار پانچ منٹ پہلے کی ساری باتیں انہیں یاد آ گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ان کا غصہ پھر حرارت اور رفتار پکڑتا، میں نے ہمت کر کے کہا۔

''سر! میں باکس کے حوالے سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔''

''کیا ہے؟'' انہوں نے ماتھے کی تیوریاں برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''سر! ہم جانتے ہیں کہ باکس کے حوالے سے آپ کے بہت سے اندیشے ہیں اور یہ بالکل بجا اندیشے ہیں۔ مثلاً انتظامیہ کی بات ہی لیں۔ پولیس کا حال ہی دیکھیں۔ ان پر کسی طرح کا اعتبار بھلا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان پر اعتبار کیا جا سکتا تو میرا خیال ہے کہ آپ کب کے اس باکس والی ذمے داری سے فارغ ہو چکے ہوتے لیکن اس کا کوئی درمیانی حل تو نکالا جا سکتا ہے۔''

جلالی صاحب کے تاثرات نارمل ہی رہے۔ اس کا مطلب تھا کہ خراب ماحول کے باوجود میری ایک آدھ بات ضرور ان کے دل کو لگی ہے۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے ''ویل ڈن'' کا اشارہ کیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''جناب! میں صرف اپنی معلومات کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ معزز لوگوں یا پھر میڈیا والوں کے سامنے یہ باکس کسی اہم حکومتی عہدے دار کے حوالے کر دیا جائے اور یہ تب تک وہاں رہے جب تک اس کا اصل مالک سامنے نہیں آ جاتا؟''

جلالی صاحب نے برا سا منہ بنایا۔''اہم عہدے دار کون ہو گا؟ کوئی وزیر، مشیر یا پھر کوئی بڑا پولیس افسر۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ اعتبار کے قابل ہیں؟ ہرگز نہیں، یہ لوگ گرم توے پر اپنی پیٹھ رگڑیں تو بھی ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور میڈیا میں بھی ابھی اتنی ذمے داری کہاں پیدا ہوئی ہے۔ یہ لوگ شکاری جانوروں کی طرح ایک خبر کے پیچھے بھاگتے ہیں، اس کو دبوچتے ہیں، اس کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ ابھی وہ ''خبر'' تڑپ پھڑک ہی رہی ہوتی ہے کہ انہیں کوئی اور خبر نظر آ جاتی ہے۔ وہ پہلی کو چھوڑ کر اس کے پیچھے لپک جاتے ہیں اور پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔''

''یہ بات تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' عمران نے فرمائشی انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلایا۔

میں نے بھی تائیدی انداز میں کہا۔''آپ یقیناً اس معاملے کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں سر! اور یقیناً اس سلسلے میں آپ نے کوئی مناسب پلاننگ بھی کر رکھی ہو گی۔''

''پلاننگ کوئی نہیں ہے...... کوئی پلاننگ نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، بس اس پر قائم ہوں۔ وہ باکس میرے پاس امانت کے طور پر موجود ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک اس کا اصل مالک مجھ سے رابطہ نہیں کرتا۔ اس امانت کی حفاظت کرتے ہوئے اگر مجھے جان بھی دینا پڑے تو میں دے دوں گا۔'' جلالی کا لہجہ اٹل تھا۔

اب یہ بات ان سے کون کہتا کہ حضرت! اگر آپ نے واقعی جان دے دی اور داغ

اجل کو لبیک کہہ ڈالا تو مورتی والے باکس کو کیسے ڈھونڈا جائے گا؟ وہ تو آپ کے ساتھ ہی لحد میں اتر جائے گا۔

میں اور عمران کچھ دیر تک اشاروں کنایوں میں بات جلالی صاحب کو باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ انہیں کسی طرح کا کوئی لالچ ہی نہیں ہے تو پھر وہ کسی طرح اس باکس والی ذمے داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔ لیکن ڈاکٹر مہناز نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

''وہ اپنے مؤقف پر فولاد کی طرح سخت رہتے ہیں۔ کسی بھی طرح کے دلائل سے ان کے مؤقف میں لچک پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اگر کبھی یہ لچک پیدا ہوئی ہو تو پھر ان کے اندر سے ہی ہوتی ہے۔''

اس ملاقات میں کچھ اور امور ضرور طے ہو گئے۔ جلالی صاحب نے اتفاق کیا کہ یہاں کوٹھی میں ہم موجودہ حیثیت سے ہی موجود رہیں۔ ضرورت پڑنے پر رضیہ کے علاوہ عمران بھی کچن میں خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں موجود کالی بھڑوں کا سراغ لگایا جائے اور یہ کام جلد سے جلد ہو۔ سیکرٹری نیدم کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے اور اسے ہدایت کی جائے کہ وہ ہم دونوں کو بھی سکیورٹی کے انتظامات اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھے۔ جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی، میں نے سانولی رنگت والے فتح محمد کی آواز سنی۔ وہ کسی ملازمہ کو آواز دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اردگرد موجود ہے حالانکہ جلالی صاحب نے کسی کو بھی اس طرف آنے سے منع کیا تھا۔ یہ فتح محمد اس کوٹھی اور فارم ہاؤس میں یقیناً ایک مشکوک شخص تھا۔ میں اور عمران جلد از جلد اس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو میں نے پھر ایک عجیب منظر دیکھا۔ ڈاکٹر مہناز اپنی والدہ سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھی۔ عمران نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا تھا اور اب وہ ڈاکٹر عدیل کا ہاتھ بٹانے کے لئے Zoo کی طرف چلا گیا تھا۔ بارہ بج چکے تھے اور جلالی صاحب کا کھانا لے جانے والا ملازم وحید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پھر ایک ملازمہ نے مجھے بتایا کہ جلالی صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اس نے تفصیل نہیں بتائی۔ میں جلالی صاحب کو دیکھتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں پہنچا تو یہاں ایک عجیب منظر دیکھا۔ جلالی صاحب ایک صوفے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ اسے نیم دراز ہونا کہا جا سکتا تھا۔ بیس بائیس سال عمر والی دو قبول صورت ملازمائیں ان کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دیگر لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے جلالی صاحب کو اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا۔ جلالی صاحب کے دونوں ہاتھ دونوں ملازماؤں کے ہاتھ میں تھے اور انہوں نے جلالی صاحب کی انگلیوں کو یوں دبا رکھا

تھا جیسے وہ سن ہو چکی ہوں اور لڑکیاں انہیں اپنی مٹھی میں دبا کر حرارت پہنچانا چاہتی ہوں۔ جلالی صاحب کی آنکھیں بند اور چہرے پر عجیب سی بے چینی تھی۔ پھر میں نے ملازمہ زرینہ کو دیکھا۔ وہ ایک طرف سے آئی۔ جلالی صاحب کے پاؤں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی اور ان کے پاؤں کی انگلیوں کو اپنے گداز ہاتھوں سے ہولے ہولے دبانے لگی۔

میں کچن میں واپس آ گیا۔ اس چاردیواری میں جلالی ایک ایسا معما تھا جو ابھی تک پوری طرح ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ صرف دو دن پہلے ہم پر یہ حیرت ناک انکشاف ہو چکا تھا کہ اس کوٹھی میں جلالی اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی نوعیت یکسر بدل چکی تھی۔ وہ بڑی رازداری سے خفیہ شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ جلالی صاحب کے قریب ترین لوگ بھی اس نئے تعلق سے بے خبر ہیں۔ یقیناً میرے کانوں میں بھی اتنی جلدی اس تعلق کی بھنک نہ پڑ سکتی اگر ڈرائنگ روم میں مائیکروفون نصب نہ ہوتا۔ آجا کے بابا طفیل اور اس کی بیوی دو ایسے افراد تھے جن کے بارے میں شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس نئے تعلق سے آگاہ ہیں۔ کسی وقت تو مجھے شک ہوتا تھا کہ شاید جلالی اور مہناز کے نکاح کی کارروائی بھی بابے طفیل نے ہی انجام دی ہو گی۔

بابا طفیل بھی فتح محمد کی طرح اس کوٹھی کا ایک خاموش اور گہرا کردار تھا۔ وہ سفید ریش اور جھکی کمر والا شخص تھا۔ وہ اور اس کی بیوی پنج وقت کے نمازی تھے۔ اس کی بیوی کے ہاتھ میں اکثر تسبیح بھی نظر آتی تھی۔ ان کا بیٹا اور بہو رضیہ بھی یہاں ملازمت کرتے تھے۔ بہرحال وہ دونوں سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے۔ اس کے برعکس بابے طفیل اور اس کی بیوی کو یہاں گھر کے افراد جیسی حیثیت حاصل تھی۔ سہ پہر کے وقت جلالی صاحب کی طبیعت سنبھل گئی۔ انہوں نے Zoo کا ایک راؤنڈ بھی لگایا۔ ایرانی بلی اور بلونگڑوں کی حفاظت کے لئے ایک مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے موجود تھا۔ چار بجے کی چائے کی جگہ جلالی صاحب نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر لاہور ٹیلی فون کر کے اپنے زخمی ملازموں کی عیادت کرنے کے بعد سو گئے۔

ڈاکٹر مہناز کی واپسی پانچ بجے کے قریب ہوئی۔ وہ کچھ تھکی تھکی اور کچھ روئی روئی سی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ والدہ سے مل کر آئی ہے اور حسبِ معمول والدہ سے اس کی جھڑپ بھی ہوئی ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ والدہ نے اسے الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ دو ہفتے کے اندر جلالی صاحب کے لئے کسی دوسرے ڈاکٹر کا انتظام کر کے کوٹھی چھوڑ دے، ورنہ وہ زندگی بھر اس کی شکل نہیں دیکھیں گی۔

والدہ بے چاری کو کیا پتا تھا کہ ڈاکٹر بیٹی اب کوٹھی نہیں چھوڑے گی کیونکہ وہ اس

ملازمت کو باقاعدہ ایک رشتے میں بدل چکی ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو آشکار ہو گیا تو زبردست قسم کی جگ ہنسائی اور طعنہ زنی کا سبب بنے گا۔ مطلع دوپہر سے ابر آلود تھا۔ شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور تیز بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنے اور مہناز کے لئے چائے بنائی۔ چائے سے بھرے ہوئے مگ لے کر ہم ایک برآمدے میں آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ مجھے اور مہناز کو ساتھ دیکھ کر دیگر ملازموں کو حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ ڈاکٹر مہناز میری شوقیہ شاگرد بنی ہوئی ہے اور مجھ سے کوکنگ سیکھ رہی ہے۔

میں نے مہناز کو آج دوپہر والی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ آج میں نے جلالی صاحب کو کس حالت میں دیکھا ہے۔

میرے اس بیان میں ایک طرح کا تجسس تھا اور کئی ایک سوالات تھے۔ میں اس تجسس کا اظہار پہلے بھی دو تین بار مہناز سے کر چکا تھا مگر وہ کنی کترا گئی تھی۔ آج میں چاہتا تھا کہ وہ کنی نہ کترائے اور مجھے کچھ نہ کچھ بتائے۔ میں کوشش کرتا رہا، آخر مہناز کو نیم آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اس کوٹھی میں دو تین جگہوں پر سی ٹی وی کیمرے موجود تھے مگر ہم جس جگہ بیٹھے تھے، وہاں اس طرح کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔

مختار ملک والے واقعے کے بعد سے مہناز مجھ پر خاصا بھروسا کرنے لگی تھی۔ وہ میری جسمانی فٹنس اور فائٹنگ اسپرٹ سے بہت متاثر تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے بھی چند دن پہلے اسے اپنی کایا کلپ کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں لڑکپن سے مارشل آرٹ کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں لیکن کبھی اس میدان میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ ادنیٰ کھلاڑیوں میں بھی شامل نہ ہو سکا لیکن پھر حالات کی سختیاں میرا ہانکا کر کے مجھے ایک ایسے شخص تک لے گئیں جو شاید مرنے سے پہلے میری آمد کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میں نے مہناز کو باروندا جیکی کی کہانی سنائی تھی اور اس کے بارے میں دیگر باتیں بتائی تھیں۔

تو میں ذکر کر رہا تھا ڈاکٹر مہناز کی نیم آمادگی کا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ جلالی کے اسرار پر سے سارا نہیں تو تھوڑا بہت پردہ ضرور اٹھا دے گی۔ بادل برس رہے تھے اور ہوا کی سرسراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''تابش صاحب! ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست اور...... ہمراز ہیں۔ آپ کو وعدہ کرنا ہو گا کہ جو کچھ آپ کو بتاؤں گی، آپ صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں ڈاکٹر مہناز۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

کچھ دیر توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''تابش! جلالی صاحب بچپن سے...... سمجھیں

کہ تین چار سال کی عمر سے زبردست اکیلے پن کا شکار رہے ہیں۔ ان کا یہ اکیلا پن زندگی کے کسی حصے میں دور نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری دور میں داخل ہو گئے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں ڈاکٹر مہناز! آپ کس اکیلے پن کی بات کر رہی ہیں؟ بابا طفیل بتا رہا تھا کہ جلالی صاحب نے اپنا بچپن اور جوانی ایک بھری پُری فیملی میں گزارے ہیں۔ پھر ان کے والدین نے بڑے چاؤ سے ان کی شادی بھی کی۔ انہوں نے تیس سال تک ایک اچھی ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کے تین بچے بھی ہوئے۔''

مہناز عجیب پھیکے انداز سے مسکرائی۔ ''اس کے باوجود تابش صاحب...... جلالی ہمیشہ تنہا رہے، یکسر اکیلے۔ بابے طفیل نے آپ کو ایک خاص بات نہیں بتائی اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے...... جلالی صاحب تین چار سال کی عمر سے ایک بیماری کا شکار رہے ہیں۔ یہ جلد کا ایک متعدی مرض تھا۔ نہایت تکلیف دہ...... نہایت ضدی۔ اس مرض نے جلالی صاحب کی زندگی تو اجیرن کی ہی، ان کے قریبی رشتوں کو بھی ہمیشہ ایک سخت امتحان سے دوچار رکھا۔ ماں سے زیادہ قریبی بھلا کون ہوتا ہے۔ اس ماں کے دل پر کیا گزرتی ہو گی جو اپنے تین چار سال کے بچے کو چھو بھی نہیں سکتی ہو اور اس بچے کے دل کا کیا حال ہوتا ہو گا جو اپنے ماں باپ کے لمس کو ترستا رہتا ہو۔''

''یہ بیماری کب تک رہی۔'' میں نے پوچھا۔

''سمجھو ہمیشہ رہی۔'' مہناز نے افسردگی سے کہا۔ ''عام طور پر جلدی امراض کا دورانیہ طویل ہوتا ہے لیکن یہ بیماری تو جلالی صاحب کی تقریباً تین چوتھائی زندگی کو نگل گئی۔ اس نے قریباً ساٹھ سال تک جلالی صاحب کو اپنے پنجوں میں جکڑے رکھا۔ جلالی صاحب کے پورے جسم پر بہت باریک باریک سے دانے نکل آتے تھے...... گرمی دانوں جیسے...... لیکن یہ گرمی دانوں کی طرح خشک نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سرخی اور گیلا پن ہوتا تھا۔ جلالی صاحب کی والدہ اور ان کی بڑی بہن کے ہاتھ بھی اس بیماری کا شکار ہو گئے تھے اور اگر وہ دونوں ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل نہ کرتیں تو شاید وہ بھی پوری طرح اس کی لپیٹ میں آ جاتیں۔''

''جلالی صاحب کی بیماری کا علاج بھی ہوا؟''

''کیوں نہیں...... جلالی صاحب چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ ان کا تعلق ایک خوش حال زمیندار گھرانے سے تھا۔ لاہور اور شیخوپورہ کے نواح میں ان کی سیکڑوں ایکڑ زرعی زمین تھی۔ جلالی صاحب کے والد ایک پڑھے لکھے شخص تھے۔ انہوں نے ننھے جلالی کا علاج اندرونِ ملک ہی نہیں، بیرون ملک بھی کرایا۔ انہیں انگلینڈ اور جرمنی

تک لے کے گئے۔ جلالی صاحب کی تکلیف کنٹرول ضرور ہو جاتی تھی مگر ختم نہیں ہوتی تھی۔ یہ چھوت کے زبردست اثرات بھی رکھتی تھی۔ معالجوں کی ہدایت کے مطابق جلالی صاحب کو دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ چار پانچ سال کا بچہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لمس کو ترستا رہتا تھا لیکن ایسی کوئی راحت اس کے نصیب میں نہیں تھی۔‘‘

’’جلالی صاحب کے خاندان میں پہلے بھی یہ تکلیف موجود تھی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں...... نہ پہلے تھی نہ بعد میں کسی کو ہوئی۔ یہ واحد کیس تھا۔ بابے طفیل اور اس کی بیوی کو ان وقتوں کا سارا حال معلوم ہے لیکن وہ دونوں کسی کو بتاتے نہیں۔ ایک طرح سے وہ دونوں جلالی صاحب کے پرانے رازدار بھی ہیں۔ بہرحال، میرے ساتھ انہوں نے کافی کچھ شیئر کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اِس بیماری میں چھوت کے اثرات اتنے شدید تھے کہ کوئی بھی جلالی صاحب کے قریب نہیں جاتا تھا۔ انہیں پیاز کا زیادہ استعمال کرایا جاتا تھا تاکہ چھوت کے اثرات کم ہوں اور بیماری میں بھی افاقہ رہے۔ وہ جلن کی وجہ سے ساری ساری رات تڑپتے رہتے تھے۔ ماں انہیں دو دو گھنٹے بعد دوا پلاتی تھی...... اور دیگر تدبیریں کرتی تھی۔ کسی وقت وہ انہیں گلے سے بھی لگاتی تھی لیکن اس طرح کہ جلالی صاحب کے جسم کا کوئی ننگا حصہ اس کے جسم سے چھو نہ پائے۔ خاص طور سے بیماری سے متاثرہ حصوں کو چھونا تو بہت خطرناک تھا۔ ان حصوں پر دوا وغیرہ لگاتے وقت دستانے استعمال کئے جاتے تھے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’لیکن ڈاکٹر! ہم جانتے ہیں کہ جلالی صاحب کی شادی ہوئی۔ ان کے صحت مند بچے بھی ہوئے۔‘‘

’’مگر میں سمجھتی ہوں کہ شادی جیسا رشتہ بھی جلالی صاحب کی تنہائی اور اکیلے پن کو ختم نہ کر سکا۔ ان کی ازدواجی زندگی عام لوگوں سے بہت مختلف تھی۔ یہ ازدواجی زندگی ڈری سہمی اور کپڑوں میں لپٹی لپٹائی...... پتا نہیں کس طرح گرتی پڑتی چلتی رہی...... وہ بھی کسی متوسط گھرانے کی صابر شاکر عورت تھی، اس نے یہ سب کچھ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اسے دنیا کی ہر خوشی نصیب تھی لیکن میاں بیوی کے بھرپور تعلق سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہی ہوگی۔‘‘

’’پھر جلالی صاحب ٹھیک کیسے ہوئے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اسکن کی کچھ بیماریاں عجیب ہوتی ہیں۔ یہ سالہا سال مریض کو پریشان رکھتی ہیں لیکن عمر کے کسی دور میں یہ خود بخود مریض کا پیچھا چھوڑ دیتی ہیں یا پھر نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ جلالی صاحب کی تکلیف کے بارے میں بھی ڈاکٹروں کا یہی کہنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی وقت خود ہی ٹھیک بھی ہو سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا...... لیکن بہت دیر سے ہوا۔ یہ

انیس بیس سال پہلے کی بات ہے۔ جلالی صاحب کی وائف کو بھی فوت ہوئے پانچ چھ سال گزر چکے تھے۔ جلالی صاحب کی تکلیف بغیر کسی خصوصی علاج یا دوا کے کم ہونے لگی اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں ناپید ہو گئی۔ اب وہ اس حوالے سے بالکل صحت مند ہیں لیکن اس طویل ترین بیماری نے ان کی شخصیت پر جو منفی اثرات ڈالے ہیں، وہ موجود ہیں اور شدت سے موجود ہیں۔‘‘

بارش برس رہی تھی لیکن اس کی ساری خوب صورتی تاریکی میں دفن تھی، بس مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمارے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی یا پھر پانی کی بوچھاڑوں کی آواز۔ آسمان پر بجلی چمکی تو جیسے برآمدے میں بھی ایک بجلی چمک گئی۔ مہناز کا پُر شباب کمان کی طرح کسا ہوا جسم ایک لمحے کے لئے روشن ہو کر نیم تاریکی میں اوجھل ہو گیا...... کہا جاتا ہے کہ بادو باراں میں عورت کا حسن نکھر جاتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ’’کیا آپ یہی کہنا چاہ رہی ہیں کہ جلالی صاحب کو اپنی بیماری کی وجہ سے عمر بھر لمس کی جو کمی رہی ہے، وہ اب انہیں نفسیاتی طور پر دق کر رہی ہے؟‘‘

’’بالکل ایسا ہی ہے۔ آج دوپہر آپ نے ان کی جو کیفیت دیکھی ہے، وہ اکثر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اپنے وجود کا اکیلا پن بڑی شدت سے ان کے اندر ابھرتا ہے۔ ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں میں ایک تکلیف دہ سنسناہٹ ماتھے پر پسینا آتا ہے۔ میڈیکل زبان میں اس تکلیف کے لئے لمبے چوڑے اور مشکل نام ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ شدید اعصابی بے قراری کی ایک شکل ہے۔ آپ کو میں ایک مثال دیتی ہوں۔ آپ نے پالتو جانوروں مثلاً بلیوں وغیرہ کو دیکھا ہوگا...... وہ اپنے جسم کو کسی جان دار جسم کے ساتھ ٹچ کرنا پسند کرتی ہیں۔ پاؤں میں لوٹتی ہیں۔ اپنا آپ اپنے مالک کی ٹانگوں سے رگڑتی ہیں...... یہ بھی اسی قسم کی اعصابی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ پچھلے چالیس پچاس برسوں میں جلالی صاحب کو جانوروں سے جو خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی ہے، اس کی وجہ بھی شادی یہی اکیلا پن ہے...... مگر کچھ بھی ہے تابش صاحب...... اپنے جیسے انسان کی کمی پالتو جانوروں سے تو پوری نہیں ہو سکتی۔ یقیناً دیکھنے والوں کو بہت برا لگتا ہوگا کہ یہ عمر رسیدہ شخص جوان ملازماؤں کو اپنے اردگرد رکھتا ہے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ قریب ہونا اور لیٹنا بھی پسند کرتا ہے۔ وہ اسے ایک بوڑھے کی کج روی اور شاید رنگین مزاجی سے تعبیر کرتے ہوں گے لیکن وہ اس مسئلے کی دردناک بنیاد سے واقف نہیں ہیں۔‘‘

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’ڈاکٹر مہناز! آپ نے تو اس تصویر کا ایک

بالکل دوسرا رخ پیش کر دیا ہے...... آپ کا کیا خیال ہے، اس حوالے سے جلالی صاحب کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"شاید کچھ بھی نہیں۔ اب بڑھاپے کی کئی بیماریاں جلالی صاحب کو چٹ چکی ہیں...... آپ جانتے ہی ہو، ان کے تین بائی پاس ہو چکے ہیں۔ زندگی کا تو پل بھر کا بھروسا نہیں لیکن ظاہری حالت سے بھی پتا چلتا ہے کہ جلالی صاحب اب زیادہ عرصہ نہیں گزاریں گے۔ شاید دو تین سال...... یا اس سے بھی کم۔ اب تو کوئی ایسا شخص ہو جو پورے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ جلالی صاحب کے ان آخری دنوں کو...... خوشگوار اور کم اذیت ناک بنا سکے۔"

میں نے کنکھیوں سے مہناز کی طرف دیکھا۔ ہوا کی وجہ سے اس کا آنچل سرک گیا تھا اور ملائم بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک ایسے شخص کا ذکر کر رہی تھی جو جلالی کی زندگی کے آخری حصے کو خوش گوار بنا سکے...... اور وہ "شخص" وہ خود تھی۔ وہ بڑی رازداری سے ان کی زندگی میں آ چکی تھی۔

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر مہناز! شاید آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کوئی ایسی عورت ہو جو جلالی صاحب کو قربت مہیا کر سکے۔ لیکن یہ قربت تو وہ اپنے اردگرد موجود عورتوں سے حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ بھی تو ادھوری قربت ہی ہوتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ...... میاں بیوی والی قربت...... مگر اس عمر میں اور اتنی بیماریوں کے ساتھ......؟"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" اس نے ہولے سے کہا پھر جلدی سے موضوع بدل کر بولی۔

"آپ کے اور میرے درمیان گہرے اعتماد کا رشتہ ہے تابش! میں پھر کہوں گی کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوں، وہ ہمارے درمیان ہی رہنی چاہئیں۔ یہی اعتماد ہے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری یہ ڈسکشن جلالی صاحب کو ان کے مسئلوں سے چھٹکارا دلانے میں معاون ثابت ہو۔ کتنا اچھا ہو کہ کسی طرح ہم جلالی صاحب کو باکس والی ذمے داری چھوڑنے پر آمادہ کر لیں۔"

میں نے کہا۔ "مہناز! میں اپنی طرف سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس اعتماد کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ بس اس حوالے سے میں عمران کی بات ضرور کرنا چاہوں گا۔ آپ اس معاملے میں مجھے اور عمران کو ایک "اکائی" سمجھ لیں تو آپ کی مہربانی ہو گی...... میں حلفیہ کہتا ہوں ڈاکٹر مہناز! میں اس شخص پر اپنی ذات ہی کی طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔"

میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوئی اور میں اسے قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ تب گفتگو کا رُخ ایک بار پھر جلالی کے عجیب وغریب کردار کی طرف مڑ گیا۔ مہناز ان کی تعریفیں کرنے لگی...... اور یہ تعریفیں بے جا بھی نہیں تھیں۔ جلالی صاحب ایک نہایت پڑھے لکھے، بین الاقوامی شہرت کے حامل شخص تھے۔ جنگلی حیات کے معاملات پر انہیں اتھارٹی مانا جاتا تھا۔ غیر ملکی اور ملکی سلیبس کی کتابوں میں ان کا ذکر موجود تھا۔ بے شک وہ غصے کے بہت تیز تھے اور اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت میں کجروی تھی مگر ان کے کردار کے اخلاقی پہلو بھی قابلِ ذکر تھے۔ انہیں غیر ملک شہریت کی آفرز ہوئیں لیکن وہ پکے پاکستانی تھے، انہوں نے اپنی مٹی نہیں چھوڑی۔ وہ ماضی کی خوب صورتیوں میں زندہ رہنے والے شخص تھے۔ وہ جوانی میں اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے لیکن ان کا نام ہر قسم کی آلائش سے پاک رہا۔ وہ سچ کی حمایت میں بولنے والے اور پھر ڈٹ جانے والے شخص تھے۔ ایک ایسا بندہ جس کے کمزور جسم کے اندر ایک طاقتور مزاحمت کار موجود تھا۔ مہناز نے ذہانت اور معاملہ فہمی کے حوالے سے بھی جلالی کی تعریف کی۔

میں نے کہا۔ "اس میں تو کوئی شک نہیں مہناز! اب ان کا یہ فیصلہ ہی دیکھو کہ انہوں نے "باکس" کے بارے میں اپنے سوا اور کسی کو بتایا ہی نہیں۔ اگر بتایا ہوتا تو باکس کب کا ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا۔"

"ہاں یہ انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ باکس کی خاطر فارم ہاؤس کے مکینوں پر تشدد کی راہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ خود ان پر بھی تشدد ہو سکتا تھا لیکن صرف ایک حد تک۔ تشدد کرنے والے انہیں زندگی سے محروم کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے اور وہ اب بھی نہیں لے سکتے...... وہ اب جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کے سوا باکس کا علم اور کسی کو نہیں۔ اور وہ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کئی بیماریوں کے نشانے پر ہیں، انہیں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے اور اگر کچھ ہو گیا تو وہ باکس آرا کوئے سمیت ہمیشہ کے لئے لاپتا ہو سکتا ہے۔"

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔ "ہم یہی فرض کر لیں گے کہ جلالی صاحب نے باکس، کسی درخت کی جڑوں میں گڑھا کھود کر دبا دیا ہے۔ اب فارم ہاؤس کے اردگرد ہزاروں درخت ہیں...... کوئی کہاں تک ڈھونڈ سکتا ہے؟"

ڈاکٹر مہناز نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میں کل رات بھی دیر تک سو نہیں سکی۔ بار بار تم دونوں کی بنائی ہوئی ویڈیو کے منظر نگاہوں میں گھومتے رہے ہیں۔ ماننا پڑتا ہے، یہ واقعی دل گردے کا کام تھا۔ بغیر کسی حفاظتی انتظام کے تم لوگ جاوے جیسے شخص کے ٹھکانے

میں گھسے اور اس کے دو بندوں کو قتل کر کے دندناتے ہوئے واپس آ گئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ میں تم دونوں کے بارے میں الجھتی جا رہی ہوں۔ تم...... بہت خطرناک لوگ ہو۔ کسی وقت ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"دشمنوں کو تو ڈرنا چاہئے لیکن یہ ہمارے لئے بڑی شرمندگی کی بات ہے کہ دوست ہم سے ڈر رہے ہیں؟"

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ "انجانی چیز کا ڈر زیادہ ہوتا ہے۔ تم دونوں اپنے بارے میں کھل کر بتاتے بھی تو نہیں ہو۔"

"کیا تم نے اپنے بارے میں سب کچھ کھل کر بتا دیا ہے؟" میرے سوال پر وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ یقیناً اس کے چہرے پر رنگ بھی گزرا ہوگا جو نیم تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے جلدی سے بات بدلی۔ "یہی کہ ہم ایک دوسرے پر جتنا زیادہ بھروسا کریں گے، اتنا ہی جلالی صاحب کا فائدہ ہوگا بلکہ یہاں موجود ہر شخص کا فائدہ ہوگا۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔"

مہناز کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "ویڈیو کے منظر یاد آتے ہیں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ جاوے جیسا شخص چپکا بیٹھا رہے گا۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کا ردِعمل جتنا تاخیر سے ہو، اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر! تمہاری بات کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔" اب ہم دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے "تم" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے آگے کو جھک کر اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے پیالے میں رکھی اور اس کی کلائیوں کی چوڑیاں، چھن چھنا کر کہنیوں کی طرف چلی گئیں۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ "کل تم نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی تھی کہ ہمیں دیکھنا چاہئے...... مختار ملک جیسی کوئی اور کالی بھیڑ تو کوٹھی یا فارم ہاؤس میں موجود نہیں۔"

"بالکل ڈاکٹر...... سیانے یہی کہتے ہیں کہ کھلے دشمن سے چھپا دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

O......❖......O

نصرت نے فون پر مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ثروت سے ٹیلی فونک رابطہ رکھوں لیکن پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی جھجک مانع ہوتی جا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، میں اس کی بے رخی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی اور کی تھی مگر تصورات میں تو وہ میری ہی تھی۔ میں اپنے تصورات کا یہ شیش محل برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رات کا وقت تھا، موبائل فون میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ثروت کو کال کروں یا نہیں......

اچانک فون پر بیل ہوئی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا۔ یہ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے "ہیلو" کہا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک جوان مردانہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو! آپ تابش صاحب بول رہے ہیں؟"

"آپ کون؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام یوسف ہے...... یوسف فاروقی۔ میں آپ کی کزن ثروت کا شوہر ہوں"

دوسری طرف سے مسکراتی آواز میں کہا گیا۔

میں ایک لمحے کے لئے سناٹے میں رہ گیا۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ "جی...... جی...... میں نے آپ کے بارے میں سنا تھا لیکن آپ کے پاس میرا نمبر کیسے آیا؟"

"بس ایسے ہی آ گیا۔ دو تین دن پہلے تک میں آسٹریا میں تھا۔ ایک دن ویسے ہی نصرت کا موبائل دیکھ رہا تھا۔ "کال لوگ" میں دو تین جگہ "تابش بھائی" کی کال تھی۔ میں نے نصرت سے پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گئی۔ شاید آپ سے ملانا نہیں چاہتی تھی لیکن ہم تو جناب یاروں کے یار ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھے لوگوں سے ملتے ہیں۔ سوچا خود رابطہ کر کے دیکھتے ہیں۔"

مجھے نصرت پر غصہ آیا۔ اس سے بے پروائی ہوئی تھی۔ اپنے بہنوئی کی متجسس طبیعت کا اسے پتا ہی تھا۔ اسے میری کال Delete کرنی چاہئے تھی۔ میں نے کہا۔ "خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ نصرت کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری تو چند دن سے بات نہیں ہوئی اس کے ساتھ۔"

"آپ کو تو باخبر ہونا چاہئے تابش صاحب! میرے اندازے کے مطابق تو آپ خاصے "انوالو" ہیں نصرت کے علاج میں۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں......"

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے نا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں سے

نہیں۔ ورنہ یہ تو نمود و نمائش کا دور ہے۔ اور تو اور لوگ آٹے کی بوری ضرورت مند کے سر پر رکھتے ہیں اور تصویر کھچواتے ہیں۔"

"لیکن......"

"میں سب جانتا ہوں تابش صاحب! آپ چھوڑیں اس موضوع کو۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ ہی نے نصرت اور ثروت کو منع کیا ہوگا کہ اس سلسلے میں آپ کا نام نہ آئے۔ بزرگوں نے درست کہا ہے کہ کسی کے کام آیا جائے تو اس طرح کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے کو پتا نہ چلے...... ویسے آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہے؟"

وہ واقعی چرب زبان شخص تھا۔ میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ "آپ تو غالباً لاہور میں ہیں لیکن میں لاہور سے باہر ہوں اور ابھی مصروف بھی ہوں۔ چند دن بعد کوئی وقت رکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن ملاقات ہونی بہت ضروری ہے۔" اس نے "ہونی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ آپ کو ایک دو غلط فہمیاں ہیں جو دور ہونی چاہئیں۔" میں نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔

کچھ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ہماری گفتگو ختم ہوگئی۔

میں نے فوراً نصرت کو فون کیا۔ "ہیلو تابش بھائی، کیسے ہیں؟" اس کی ہشاش آواز سنائی دی۔

"میں زیادہ ٹھیک نہیں ہوں۔" میں نے ناراض لہجے میں کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے یوسف بھائی جان کا فون آیا تھا۔"

وہ حیران رہ گئی۔ میں نے اسے تفصیل بتائی اور ساتھ ہی غصے کا اظہار بھی کیا کہ اس نے میری کالز کا ریکارڈ حذف کیوں نہیں کیا۔ وہ ٹپٹائی آواز میں بولی۔ "لیکن تابش بھائی! یہ بھی تو سراسر غلط ہے نا۔ یوسف بھائی کیوں جاسوسیاں کرتے پھر رہے ہیں؟ انہیں میری اجازت کے بغیر میرا موبائل دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں ابھی انہیں فون کر کے پوچھتی ہوں۔"

"یہ تم غلطی کے اوپر ایک اور غلطی کرو گی۔" میں نے کہا۔ "اب اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ تمہاری کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کوئی "ٹاپ سیکرٹ" تھا جو افشا ہو گیا ہے۔ یوسف اس بارے میں تم سے بات کرے گا لیکن تم نے ہرگز یہ تسلیم نہیں کرنا کہ میں نے علاج کے لئے کوئی رقم وغیرہ دی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ علاج کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ

وغیرہ ہوتا تھا۔ میرے اور ثروت کے پرانے رشتے کے بارے میں بھی از خود کچھ نہیں بتانا۔ اگر اسے اپنے آپ پتا چل جائے تو اور بات ہے۔"

وہ بے پروائی سے بولی۔ "میں تو کہتی ہوں بھائی جان...... یوسف بھائی کو جو پتا چلنا ہے، چل جائے۔ انہوں نے جو بم پھوڑنا ہے پھوڑ لیں۔ ہم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ گناہ وہ کر رہے ہیں۔ باجی کو اپنے مطلب کے لئے بیدردی سے استعمال کر رہے ہیں۔"

میں نے نصرت کو سمجھایا بجھایا کہ وہ جذباتی رویہ نہ اپنائے۔ اس کا پارا نیچے آ گیا۔ وہ مجھے اپنی صحت اور علاج کے بارے میں بتانے لگی۔ دیگر معاملات پر باتیں کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "ثروت کہاں ہے؟"

وہ پورا نقشہ کھینچتے ہوئے بولی۔ "باہر لابی میں بیٹھی ہیں۔ میں کھڑکی سے انہیں دیکھ سکتی ہوں۔ سرخ سویٹر پہن رکھا ہے، کندھوں پر ہلکی گلابی شال ہے۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا کی وجہ سے ان کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری پڑھ رہی ہیں۔ اتنی پیاری لگ رہی ہیں، کہ کیا بتاؤں۔ وہ گریس، باجی کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ پلیز...... پلیز! آپ ایک کام کریں۔ اسی وقت باجی کے نمبر پر کال کریں...... پلیز۔" اس کے لہجے میں دنیا بھر کی التجا سمٹی ہوئی تھی۔

"لیکن اگر اس نے جواب نہ دیا تو؟"

"وہ دیں گی...... ضرور دیں گی۔ اچھا، اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ آپ جلدی سے انہیں کال کریں۔" اس نے فون بند کر دیا۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہمت کر کے ثروت کا نمبر ملایا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی۔ ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے لیکن اب اسے کال کرتے ہوئے میں اندر سے کانپ رہا تھا۔ بیل ہوئی اور پھر ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف سے کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔

میں نے پھر کوشش کی...... پھر ناکامی ہوئی۔ تیسری کوشش بھی ناکام ہوئی تو میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ میں نے خود کو ایک دم معمولی اور بے وقعت محسوس کیا۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ وہ نہ سن سکے گا تیری صدا...... جو چلا گیا اسے بھول جا۔

تیس چالیس منٹ بعد پھر بیل ہوئی۔ میں نے دیکھا، نصرت کا نام تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ "کیا کر رہے ہیں بھائی جان؟"

"بیٹا افسوس کر رہا ہوں کہ میں نے کیوں کال کی۔"

"ایسی بات نہیں ہے بھائی جان۔ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ آپ نہیں دیکھ رہے۔ جب آپ کی کال آ رہی تھی، باجی کے، چہرے کے رنگ دیکھنے والے تھے۔ انہوں نے خود کو پتا نہیں کس طرح کال ریسیو کرنے سے روکا۔ پھر ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر نکلی ہیں تو آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے پتا ہے روتی رہی ہیں لیکن کہہ رہی تھیں کہ الرجی ہو رہی ہے، چھینکیں آ رہی ہیں۔ بھلا کوئی آواز کے بغیر بھی چھینک مارتا ہے تابش بھائی جان؟" وہ ذرا شوخی سے بولی۔

"اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟"

"اس میں خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ خوش ہونے کی بات دوسری ہے۔" وہ اسی ترنگ میں بولی۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور سے یوسف بھائی کا فون آیا تھا۔"

"پھر؟"

"باجی نے ان کا فون بھی نہیں سنا۔" نصرت بہت خوش تھی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔ "میرے خیال میں یہ پہلا موقع ہے تابش بھائی جان کہ باجی نے اس طرح یوسف بھائی کی کال ریجیکٹ کی ہے۔ دن میں کم از کم چھ کالیں تو کرتے ہیں وہ۔ پتا نہیں، آج کل کیا ہو گیا ہے انہیں۔ اتنی فکر کیوں پڑی ہوئی ہے باجی کی؟ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ادھر لاہور میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ فاروقی انکل وہاں آئے ہوئے ہوں۔ کسی طرح وہاں کے حالات کا پتا چلے نا۔"

نصرت نے حالات کا پتا چلنے کی بات کی تو میرے ذہن میں فوراً ملازمہ حمیدن کی صورت ابھر آئی۔ اس سے پہلے لاہور میں عمران کے ساتھ جیلانی نے یوسف کی اس ملازمہ کو بڑی خوبی سے شیشے میں اتارا تھا اور گراں قدر معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے نصرت سے تو نہیں کہا لیکن دل میں سوچا کہ ضرورت پڑنے پر حمیدن کو پھر متحرک کیا جا سکتا ہے۔

نصرت کی صحت کے معاملات پر کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا۔ اس کوریڈور میں ایک بار پھر تاریکی چھائی ہوئی تھی جہاں سے گزر کر مہناز بڑی رازداری سے جلالی صاحب کے کمرے میں پہنچتی تھی۔ اپنی آمد و رفت سے پہلے وہ اس بلب کو یہاں سے اتار لیتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آج وہ پھر اپنے عمر رسیدہ شوہر کے پاس موجود ہے۔

اگلے روز جب سہ پہر کے وقت جلالی صاحب عمران کے ساتھ اپنے چڑیا گھر کا دورہ کرنے کے بعد فارم کے سکیورٹی انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے، ڈاکٹر مہناز سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ اس نے خلافِ معمول ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں ہفت رنگ چوڑیاں تھیں۔ تاہم وہ کچھ سُست سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "کیا بات ہے ڈاکٹر! لگتا ہے کہ رات کو آپ کی نیند پوری نہیں ہوئی۔"

اس کے خوش نما چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ تاہم فوراً بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو تابش! رات کافی دیر تک جاگتی رہی ہوں۔ وہ تمہاری خون خوار ویڈیو ذہن سے نہیں نکلتی۔ بہتر ہے کہ تم لوگ اسے ضائع کر دو۔ وہ تمہارے خلاف دو بندوں کے قتل کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔"

"وہ بندے نہیں تھے مہناز...... خونی جانور تھے۔ ایسے جانوروں کو جہنم واصل کرنے پر تو یار لوگوں کو انعام ملا کرتے ہیں۔"

"ویسے اندر سے جلالی بھی فکرمند ہیں۔ وہ سکیورٹی مزید سخت کروا رہے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ جاوا نچلا نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے کہا۔ "سکیورٹی سے بھی زیادہ یہ بات اہم ہے کہ ہم اندر سے محفوظ ہوں۔ ہمیں پتا چلے کہ کوئی دوسرا "مختار ملک" تو یہاں موجود نہیں...... اور...... اور لگتا ہے کہ وہ ہے۔"

"مجھے بھی یہی پریشانی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہر وقت کوئی ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔"

یہ وہی موضوع تھا جس پر ہم کل بھی "ڈسکس" کرتے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "مہناز! اگر میں تم سے کہوں کہ کسی ایک شخص کا نام بتاؤ تو تم کس پر شک کر سکتی ہو؟"

اس کی چمکیلی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔ "کیا کہوں اس بارے میں...... سیکرٹری ندیم تو ہر طرح بھروسے کا بندہ ہے۔ بابا طفیل اور فتح محمد وغیرہ خاندانی ملازم ہیں۔ ڈاکٹر عدیل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دیگر ملازموں میں وحید اور مصطفیٰ کے بارے میں، میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔"

میرے ذہن میں بار بار وہ ہیولا ابھر رہا تھا جسے میں نے چند روز پہلے جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے پاس دیکھا تھا۔ وہ کس کا ہیولا تھا؟ یقیناً کسی ایسے شخص کا جو ہمارے اردگرد موجود تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی لاہور سے مہناز کی والدہ کی کال آ گئی۔ یقیناً ماں اور بیٹی کے درمیان وہی موضوع شروع ہونے والا تھا جو اس سے پہلے بھی زیرِ بحث رہا تھا۔

لیکن ماں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ رسموں رواجوں سے باغی بیٹی اس حوالے سے انتہائی قدم اٹھا چکی ہے۔

وہ بہار کی ایک بڑی خوشبودار شام تھی۔ سہ پہر کو ہلکی پھوار پڑی تھی، اس کے بعد چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ اس دھوپ نے گل لالہ، گل عباسی، گلاب اور نرگس کے اَن گنت پھول قرب و جوار میں مہکا دیئے تھے۔ احاطے میں سفیدے اور سائپرس کے لاتعداد درخت تھے۔ ان دھلے دھلائے درختوں کے نیچے پھول دار بیلیں بہار دکھا رہی تھیں۔ Zoo کی طرف سے موروں کی ''می آؤں'' اور کوئل کی کوک سنائی دیتی تھی۔ ایک دم میرے سینے میں گھونسا سا لگا۔ یہ اپریل کی 18 تاریخ تھی۔ پچھلے چند سالوں میں یہ تاریخ مجھے بھی نہیں بھولی تھی۔ یہی تاریخ تھی جب میں نے آخری بار ثروت کو چھوا تھا، اسے پیار کیا تھا۔ مجھے وہ منظر آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ ثروت کے کپڑوں کا رنگ، اس کی لگائی ہوئی خوشبو، اس کی کی ہوئی باتیں، اس کا پیار، اس دن اسے کتنی بار چوما تھا، کتنی بار گلے لگایا تھا، کچھ بھی تو بھولا نہیں تھا۔ ان دنوں کتنے قریب آ چکے تھے ہم۔ اپنے گھر کے لئے پردوں کے رنگ بھی ہم نے چن لئے تھے۔ وہ پکوان بھی منتخب کر لئے تھے جو ہمیں اپنے مہمانوں کو کھلانے تھے اور وہ تفریح گاہیں بھی جہاں جہاں ہمیں پہنچنا تھا اور وہ موسم جو ہمیں دریافت کرنے تھے۔ مجھے آج بھی یاد تھا، 18 اپریل کو ہونے والی اس آخری ملاقات میں ہم نے ان پھولوں کے نام لئے تھے جو ہم نے اپنے باغیچے میں لگانے تھے۔ گل خیرو کے ذکر پر ہمارے درمیان تھوڑی سی پیار بھری لڑائی بھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ پھول زیادہ پسند نہیں تھا مگر ثروت کو اچھا لگتا تھا...... اور پھر وہ پھول رہا، نہ وہ پکوان، نہ وہ موسم جو ہم نے مل کر دریافت کرنے تھے۔ وہ ملاقات، پیار بھری آخری ملاقات ثابت ہوئی تھی۔ پیار کی کہانیوں میں یہ ''آخری'' کیوں آتا ہے......؟ کیوں آخری خط؟ کیوں آخری کال؟ کیوں آخری بوسہ؟ کیوں؟ رب کائنات نے پیار کے ساتھ جدائی کیوں لکھی ہے...... یہ ''آخری'' کیوں لکھا ہے؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب پیار کرنے والوں کی زندگی میں یہ ''آخری'' آتا ہے، تو وہ اس کی موجودگی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ آخری ملاقات ہو رہی ہوتی ہے اور وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ آخری ہے۔ آخری کال ہو رہی ہوتی ہے اور پتا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آوازیں دم توڑ جائیں گی۔ آخری بار چوما جا رہا ہوتا ہے اور خبر نہیں ہوتی کہ اب ہونٹوں کو عمر بھر ترسنا ہے...... میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس خوشبودار شام کو جانے نہ دیتا۔ اس شام کو اور اس میں موجود ساری دلکشیوں کو ثروت سمیت اپنے سینے میں چھپا لیتا اور کہیں دور نکل جاتا۔ واجی، تھانے دار اشرف اور سیٹھ سراج جیسے

بدفطرت لوگوں کی دنیا سے بہت دور۔

سیٹھ سراج کا سراپا نگاہوں کے سامنے آیا تو میرا پورا وجود جلنے لگا۔ وہ میری محبت کا قاتل تھا، میری ماں کا قاتل تھا...... اور وہ زندہ تھا۔ انہی گلی کوچوں میں کہیں دندنا رہا تھا۔ اپنی تمام تر خباثت اور فرعونیت کے ساتھ۔ اب وہ بونے سے دیو بن چکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کچھ اور پھیلا لئے تھے۔ اب وہ ایک ملک گیر شہرت کا حامل نہایت بااثر بدمعاش تھا۔ میرے اندر وہی شعلے دہکنے لگے جو مجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھاگتا چلا جاؤں، یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑوں۔ کوٹھی کے ارد گرد مٹی کا ایک ٹریک موجود تھا۔ غالباً جب جلالی صاحب کی صحت قدرے بہتر تھی تو وہ یہاں چہل قدمی کیا کرتے ہوں گے یا پھر جاگنگ۔ میں شوز پہن کر اس ٹریک پر آیا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ میں 'غیر دم لئے بھاگتا رہا...... چکر پر چکر لگاتا رہا، یہاں تک کہ سانس نے سینے میں سمانے سے انکار کر دیا۔ پسینا مساموں سے دھاروں کی صورت بہہ نکلا۔ یوں لگا کہ ٹانگیں بے جان ہو جائیں گی، میں لڑکھڑا کر گروں گا اور پھر اٹھ نہ سکوں گا۔ یہ برداشت کی انتہا تھی اور بارونڈا جیکی نے کہا تھا، جہاں برداشت کی انتہا ہونے لگتی ہے، وہیں سے کچھ حاصل ہونا شروع ہوتا ہے، وہیں سے معجزے پھوٹتے ہیں۔

ایک جگہ میرے قدم ڈگمگائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی گر پڑوں گا۔ میں رک گیا اور سفیدے اور شیشم کے درختوں کے درمیان گھاس پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے فتح محمد نظر آیا۔ ہاں، وہ فتح محمد ہی تھا، وہ ایک دوسرے ملازم کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہوا درختوں کے اندر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کے جثے اور چلنے کے انداز سے پہچانا۔ چند دن پہلے حملہ آوروں نے فارم میں گھس کر کھدائی کی تھی۔ مٹی کے وہ ڈھیر ابھی تک فارم میں موجود تھے۔ ایک ایسے ہی ڈھیر کے پیچھے ایک جگہ رک کر وہ دونوں رازداری سے باتیں کرتے رہے پھر فتح محمد نے اپنے ساتھی کا کندھا تھپتھپایا اور اس سے رخصت ہو کر آگے بڑھ گیا۔ گارڈز کے قریب پہنچ کر فتح محمد نے ان سے بھی تھوڑی سی بات چیت کی اور کوٹھی کے ایک عقبی دروازے کی طرف چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا دروازہ میں نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا لیکن آج یہ کھل گیا۔ اس کی چابی فتح محمد کے پاس موجود تھی۔ دروازے سے نکل کر اس نے باہر سے تالا لگا دیا۔ میرے ذہن میں ہلچل شروع ہو گئی۔ فتح محمد باہر جانے کے لئے یہ عقبی دروازہ استعمال کر رہا تھا اور اس کا انداز بھی مشکوک تھا۔ ''وہ کہاں جا رہا ہے؟'' یہ سوال شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔

میرا دل چاہا کہ اس کے پیچھے جاؤں لیکن سکیورٹی ایجنسی کے نہایت چوکس گارڈز کی نظر میں آئے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی عمران نے اس سلسلے میں احتیاط برتنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور گارڈز کے پاس پہنچ گیا۔ صرف تین چار دن پہلے جلالی صاحب ان گارڈز کے تین اہم افسران کو یہ ہدایات دے چکے تھے کہ سکیورٹی کے حوالے سے مجھے اور عمران کو آگاہ رکھا جائے اور ہمارے ساتھ تعاون کیا جائے۔ یہ ہدایات اس وقت بہت کام آئیں۔ میں نے ایک سکیورٹی انچارج فراست شاہ کو بتایا کہ میں فوری طور پر کوٹھی سے باہر جانا چاہتا ہوں اور عقبی دروازے سے جانا چاہتا ہوں...... وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی اہم معاملہ ہے۔ اس نے نہ صرف کوٹھی کی چاردیواری پھلانگنے میں میری مدد کی بلکہ کوٹھی سے باہر موجود دوسرے سکیورٹی انچارج کو بھی میرے بارے میں واکی ٹاکی کے ذریعے آگاہ کر دیا۔ اب تک سکیورٹی ایجنسی کے تقریباً سارے لوگ اچھی طرح جان چکے تھے کہ میری اور عمران کی اصل حیثیت باورچیوں کی نہیں ہے۔

میں نے باہر نکلتے ہی فارم ہاؤس کے سکیورٹی انچارج قادر خان سے پوچھا کہ فتح محمد کس طرف گیا ہے۔ وہ فتح محمد کو اس کے نام سے نہیں جانتا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔ ''جو ملازم ابھی نکلا ہے، وہ ادھر فش فارم کی طرف گیا ہے۔''

یہ فش فارم بھی فارم ہاؤس کا حصہ تھا۔ اس کے قریب ہی فارم ہاؤس کا بہت بڑا مرغی خانہ بھی تھا۔ میں فش فارم کی طرف لپکا۔ جلد ہی میں نے فتح محمد کو دیکھ لیا۔ وہ ایک ٹریکٹر ٹرالی کے پیچھے موجود تھا اور ایک پرانی موٹر سائیکل کو مسلسل ککیں مار رہا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو کر نہیں دے رہی تھی اور اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسٹارٹ ہوگی بھی نہیں۔

میں فتح محمد سے کافی فاصلے پر تاریکی میں موجود رہا تھا اس کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔ وہ سخت جھلایا ہوا نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے موٹر سائیکل کو ایک طرف کھڑا کیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا پیدل چلنے لگا۔ یہ صورتِ حال میرے لئے بہتر تھی۔ اگر موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو جاتی اور وہ آناً فاناً کسی طرف نکل جاتا تو میرے لئے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ میں ایک محفوظ فاصلے سے فتح محمد کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس وہی یادگار چاقو تھا جس کی دھار نے چند ماہ پہلے جارج گورا جیسے فرعون صفت شخص کا خون چکھا تھا۔ اپنے پاس اس چاقو کی موجودگی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

میری چھٹی حس نے کہا کہ آج کی رات فتح محمد کے لئے کچھ اچھی ثابت نہیں ہونے

والی۔ آج میں بہت برے موڈ میں تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے تک سیٹھ سراج کی منحوس صورت میری آنکھوں میں تھی اور میرا خون اچھالے مار رہا تھا۔ سیٹھ سراج تو نہیں ملا تھا تاہم اس کرخت چہرہ فتح محمد سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا اور اپنے تعاقب سے لاعلم تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایسے راستے اختیار کر رہا ہے جن پر سکیورٹی گارڈز سے ملاقات ہونے کا امکان کم سے کم ہو...... کچھ آگے جا کر اسے سکیورٹی والوں کی پیٹرولنگ جیپ کی نیلی بتی نظر آئی تو وہ دو تین منٹ کے لئے گھنی جھاڑیوں میں ٹھہر گیا۔ جیپ آگے نکل گئی تو اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ آج میں اس بندے کی حقیقت جاننے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اپنے سیل فون کے ذریعے عمران کو بھی آگاہ کر سکتا تھا اور ممکن تھا کہ وہ بھی میری اس کوشش میں شریک ہو جاتا لیکن پتا نہیں کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ شاید میرے اندر یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں ہر کام میں عمران کا سہارا نہ لوں، عمران خود بھی تو یہی چاہتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد فتح محمد اچانک اس پختہ سڑک پر آ گیا جو آگے جا کر لاہور جانے والی مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ اس تیس فٹ چوڑی سڑک پر زیادہ تر تانگے، ٹریکٹر ٹرالیاں اور سائیکل یا موٹر سائیکل ہی نظر آتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کھٹارا لوکل بس بھی گزر جاتی تھی۔

مجھے پھر پریشانی لگ گئی۔ اگر یہاں فتح محمد کسی گاڑی پر سوار ہو جاتا تو میں اس کا تعاقب جاری نہ رکھ سکتا۔ ابھی اس اندیشے نے ذہن میں سر اٹھایا ہی تھا کہ اس کی عملی صورت سامنے آ گئی۔ فتح محمد نے ایک ٹریکٹر ٹرالی والے کو ہاتھ دے کر روکا۔ ٹریکٹر ٹرالی والا رک گیا۔ غالباً اس نے فتح محمد کو جلالی فارم ہاؤس کے ملازم کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ اردگرد کے دیہاتی جلالی صاحب کے نام کی توقیر کرتے تھے۔ فتح محمد ٹریکٹر پر ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ٹرالی روانہ ہوگئی۔ میں نے تیزی سے سوچا، اب میرے پاس راست اقدام کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا، ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ اس نے کیریئر پر کوئی وزنی شے باندھ رکھی تھی۔

میں اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور ہاتھ دے کر اسے روک لیا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک گوالا ٹائپ شخص تھا۔ قد ساڑھے چھ فٹ سے کیا کم ہوگا۔ اس نے موٹر سائیکل کی دونوں جانب دودھ والے برتن لٹکائے ہوئے تھے۔ ''کیا بات ہے بھئی؟'' اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

''دیکھو...... میں پولیس والا ہوں۔ مجھے تمہاری موٹر سائیکل چاہئے...... تھوڑی دیر کے لئے۔ نیچے اترو۔''

''اوئے تم کون سے پولیس والے ہو؟ یہاں کے پولیس والوں کو میں جانتا ہوں۔''

وہ لمبی بحث کرنے کے موڈ میں تھا اور خاصا اکھڑ مزاج بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا جثہ تو عام ہی تھا اس وجہ سے اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔ میرے پس وقت نہیں تھا ورنہ شاید میں اس سے یہ سلوک نہ کرتا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور سخت جھلاہٹ کے عالم میں کھینچ کر سڑک سے نیچے نشیبی جگہ پر لڑھکا دیا۔ موٹر سائیکل پہلو کے بل گر گئی تھی۔ وہ مزاحمت کے موڈ میں تھا، گر کر فوراً ہی کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس پر جست لگائی اور جبڑے پر دو شدید ضربیں لگا کر اسے انٹاغفیل کر دیا۔ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔

میں بھاگ کر واپس سڑک پر آیا۔ ایک برتن سے دودھ بہہ کر سیاہ سڑک پر لکیریں بنا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے سڑک خالی ہی تھی۔ دور اس ٹرالی کی عقبی بتیاں نظر آ رہی تھیں جس پر لفٹ لے کر فتح محمد بڑی سڑک کی طرف گیا تھا۔ گرنے کے باوجود موٹر سائیکل ابھی اسٹارٹ ہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور ٹریکٹر ٹرالی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ احتیاطاً میں نے ہیڈ لائٹ آف کر دی تھی۔

یہ تعاقب زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ بڑی سڑک سے ڈیڑھ دو کلو میٹر پہلے ہی ٹرالی رکی اور فتح محمد اس پر سے اتر آیا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل درختوں کے نیچے روک دی۔ یہ فیکٹری ایریا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر چند ایک کوٹھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ فتح محمد ان کوٹھیوں کی طرف چل دیا۔ میں نے موٹر سائیکل سڑک کی ڈھلوان پر جھاڑیوں کے اندر چھپائی اور فتح محمد کے پیچھے روانہ ہوا۔ اب مجھے فتح محمد سے اپنا فاصلہ کم کرنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ یکا یک اوجھل ہو جاتا اور میں منہ دیکھتا رہ جاتا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا۔

فتح محمد کوٹھیوں کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر کافی آگے جا کر وہ درختوں میں گھری ہوئی دو تین کنال کی ایک کوٹھی کے پاس پہنچ گیا۔ کوٹھی کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس ایک دو کھڑکیوں میں ہی روشنی دکھائی دیتی تھی یا پھر گیٹ کے قریب ایک بلب جل رہا تھا۔ فتح محمد کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ کوٹھی کی دس بارہ فٹ اونچی باؤنڈری وال پھلانگنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں کیکر کے درختوں میں چھپ کر اس کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک

کھیت میں پرالی کے گٹھے پڑے تھے ور ایک گدھا گاڑی بندھی ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے فتح محمد نے ساری منصوبہ بندی پہلے سے کر رکھی ہے۔ وہ پرالی کا ایک گٹھا اٹھا کر لایا اور کوٹھی کی چار دیواری کے پاس رکھ دیا۔ پھر وہ دوسرا اور تیسرا گٹھا اٹھا لایا۔ اس نے کل پانچ گٹھے دیوار کے قریب رکھے اور اوپر چڑھنے کا انتظام کر لیا۔ وہ قدرے بھاری جسم کا تھا اور فارم ہاؤس میں سستی کا شکار نظر آتا تھا مگر اب اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ دیوار پر چڑھ کر کوٹھی کے اندر اوجھل ہو گیا۔

میں اپنی جگہ جامد کھڑا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ فتح محمد کے پاس کوئی ہتھیار موجود ہے اور وہ اس کوٹھی کے مکینوں کو آڑے ہاتھوں لینے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ کوٹھی کے اندر فتح محمد کا کوئی ساتھی پہلے سے موجود ہوتا۔

ایک طرف سے دو بندے نمودار ہوئے۔ انہوں نے درخت سے گدھا کھولا اور اسے ریڑھی میں جوتنے لگ گئے۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ایک بولا۔ ''اب بتا فلم دیکھنی ہے کہ بازارِ حسن جانا ہے؟''

دوسرا بولا۔ ''تُو تو اسٹیج ڈرامے کی بات کر رہا تھا۔''

پہلے نے کہا۔ ''اوئے بھوتنی دے۔ یہ اسٹیج ڈراما بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے نا۔''

دونوں گندے انداز میں ہنسنے لگے اور ان واہیات گالیوں کی بات کرنے لگے جنہیں لوگ غلطی سے جگت کہہ دیتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور لڑکا بھی اس ''فلمی بحث'' میں شریک ہو گیا۔ اس نے ماں بہن ایک کر دینے والی کچھ تازہ ''جگتوں'' کا ذکر کیا اور ایک ایسے گانے کی تشریح کی جسے سن کر بچہ بالغ اور بالغ آگ بگولا ہو سکتا تھا۔

ان تینوں نے وہاں سے ٹلنے میں دس پندرہ منٹ لگا دیئے۔ میرے اندر جو چنگاریاں بھڑک رہی تھیں، انہوں نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں کوٹھی کے اندر جانا چاہتا تھا اور پرالی کے وہ گٹھے ابھی تک وہیں موجود تھے جنہیں فتح محمد چھوڑ گیا تھا۔ گدھا گاڑی پر تفریح کے لئے روانہ ہونے والے تینوں لڑکوں میں سے کسی کی نظر ان گٹھوں پر نہیں پڑی تھی۔ چند منٹ بعد میں اردگرد سے پوری طرح مطمئن ہو گیا اور پھر ان گٹھوں پر چڑھ کر کوٹھی کے احاطے میں کود گیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اپنا سیل فون آف کر کے لمبی گھاس میں چھپا دیا تھا۔

دوسری طرف مکمل تاریکی تھی اور یوں لگتا تھا کہ کوئی متنفس موجود نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اچانک پورچ کی طرف سے کتوں کی آواز سنائی دی اور

دو عدد دیوہیکل کتے برق رفتاری سے میری طرف بڑھے۔ ان کے عقب میں مجھے چند افراد کے ہیولے بھی دکھائی دیئے۔ مجھے لگا جیسے یہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔

کتوں کو اپنی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھنا ایک لرزہ خیز تجربہ تھا۔ مگر آج 18 اپریل کے حوالے سے میرے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی، اس نے میرے ہر خوف کو طیش کی دبیز تہوں کے اندر چھپا دیا تھا۔ میں بھاگنے یا پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج گورا کے سینے میں اترنے والا چاقو میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ جونہی بھاری جسم والے بپھرے ہوئے کتے نے مجھ پر جست کی، میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے ساتھ ساتھ میں تھوڑا سا بائیں جانب بھی ہٹا۔ میں نے چاقو کو حرکت دی۔ وہ کتے کی گردن کو سینے تک چیرتا چلا گیا۔ ایک لرزہ خیز آواز کے ساتھ کتا، کچی زمین پر دور تک لڑھک گیا۔ دوسرا کتا میرے پہلو سے ٹکرایا۔ یوں لگا کہ کسی بھینسے نے اپنے سینگوں سے مجھے ضرب لگائی ہو۔ اس طاقتور دھکے نے مجھے کروٹ کے بل گرایا۔ کتا میرے اوپر تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے خارج ہونے والی تیز حیوانی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کی خونی آنکھیں ایک لحظے کے لئے میری نگاہوں میں چمکیں۔ مجھے ایک ساعت کی دیر ہوتی تو وہ اپنے دانتوں میں میرا نرخرہ دبوچ لیتا۔ میں نے تیز دھار چاقو کو افقی رخ پر حرکت دی اور قریباً ایک فٹ تک کتے کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ پھر اسے اپنے پاؤں پر اچھالا اور دور پھینک دیا......

دو سائے مجھ پر جھپٹے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے سر پر خون سوار ہے اور میرے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جو میری رگوں میں سیال آگ دوڑا دیتا ہے۔ آگے آنے والے شخص نے میرے سر پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور چاقو دستے تک اس کی ناف میں گھسا دیا۔ وہ دردناک آواز میں چلایا۔ پیچھے آنے والے شخص نے جو کچھ کیا اور جواب میں، میں نے جو کچھ کیا، وہ بالکل ایکشن ری پلے جیسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس شخص کی رائفل پر سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سنگین سے نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے جھک کر یہ وار خالی دیا اور اس کی ناف میں بھی دس انچ کا پھل اتار دیا۔

ایک گولی چلی لیکن اس نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ دو تین افراد مجھ پر جھپٹے...... میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ مجھے یہ افراد مٹی کے پتلوں کی طرح نظر آئے۔ میں نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میری وحشت ان پر حاوی ہو گئی۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھاگتے ہوئے افراد

کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں۔ ان میں سے ایک اوندھے منہ پورچ کے فرش پر گرا۔ پورچ میں کھڑی ہنڈا اکارڈ کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔

بھاگنے والے افراد نے کوٹھی میں گھس کر دروازے بند کر لئے۔ وہ جیسے مورچا بند ہو گئے تھے۔ میں نے بہت سنا تھا کہ سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ آج سچ مچ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں مار دینا چاہتا تھا اور مر جانا چاہتا تھا۔ یہ دنیا زندہ رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ سیٹھ سراج جیسے لوگوں نے اسے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اور آج 18 اپریل تھی۔ میری موت شاید اسی دن واقع ہو گئی تھی۔ آج دوبارہ میں لاش میں تبدیل ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ سیٹھ سراج میرے سامنے نہیں تھا لیکن سیٹھ سراج جیسے لوگ تو تھے۔

پاس ہی ایک لینڈ روور جیپ کھڑی تھی، اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ غالباً میری آمد سے پہلے بوگیر کتے اور مسلح افراد اس جیپ پر بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ اب بوگیر کتے باؤنڈری وال کے پاس نیم مردہ پڑے تھے اور تین افراد بھی شدید زخمی حالت میں تڑپ رہے تھے۔

میں جیپ کے اندر گھسا۔ اسے پہلے گیئر میں ڈال کر میں نے کلچ چھوڑا اور ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ ایک برق رفتار یوٹرن لے کر میں نے بھاری بھرکم جیپ کا رخ کوٹھی کے اندرونی دروازے کی طرف کر دیا۔ یہ اندرونی دروازہ تقریباً سات فٹ چوڑا اور نہایت بیش قیمت دکھائی دیتا تھا۔ جیپ نے خوفناک رفتار سے پورچ کی دو سیڑھیاں طے کیں اور پھر ایک دھاکے سے ساگوانی دروازے سے ٹکرا گئی۔ دروازے کے پرخچے اڑے، شیشے کی سیکڑوں کرچیاں ہوا میں بکھرتی نظر آئیں۔ مجھے اپنے گھٹنوں اور کہنیوں میں درد کا احساس ہوا لیکن اس احساس میں ایک ہیجانی سا لطف تھا۔ اب جیپ کوٹھی کے شیش محل جیسے کامن روم میں تھی۔

میں نے ایک بندے کو رائفل تانتے ہوئے دیکھا اور اندھا دھند جیپ اس پر چڑھا دی۔ دو فیشن ایبل لڑکیاں چلاتی ہوئی دروازوں میں اوجھل ہوئیں۔ جیپ ایک قیمتی صوفے کا کچرا بنا کر ایک شوکیس کو الٹاتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ ایک بیش قیمت فانوس پکے ہوئے پھل کی طرح چھت سے گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ اردگرد گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یکایک عقب سے کسی نے میرے سر پر رائفل کے کندے سے شدید ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ میں گھومتا، ایک اور ضرب لگی۔ میں نے حملہ آور کی طرف رائفل گھمائی۔ دو افراد پہلو سے آئے اور کیکڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ میں اوندھے منہ گرا۔ میں سنبھلنا چاہتا تھا مگر سنبھل نہیں سکا۔ کئی اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ کسی نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور خون آلود چاقو بھی نکال لیا۔ وہ مجھ

پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرنے لگے۔ میری قوتِ برداشت ان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ میں بری طرح گھرا ہونے کے باوجود زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ حیران تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی وقت ان کے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔ پھر میرے گھٹنے پر رائفل کے دستے کی ایک شدید چوٹ لگی۔ اسی جگہ پر لگنے والی یہ دوسری چوٹ تھی۔ مجھے اپنی ٹانگ سن ہوتی محسوس ہوئی۔ میں لڑکھڑا کر گرا۔ انہوں نے ہر طرف سے مجھے دبوچ لیا۔

جس شخص نے جارج گورا والا چاقو نکالا تھا، اس نے اسے کھولا اور دہاڑا۔ ''مار دو کتے کو۔'' وہ مجھ پر جھپٹا۔

ایک دوسرا شخص اس کے سامنے آیا۔ ''کیا کرتے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟''

وہ مجھے بری طرح پیٹنا چاہتے تھے لیکن پیٹنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ مجھے چھوڑتے۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے دبوچ رکھا تھا...... اور دبوچے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسی طرح میرا سر پختہ فرش سے ٹکرانے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا کریں۔ میری ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ ایک آواز ابھری۔ ''اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچاؤ۔''

انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر موڑ کر رسّی سے باندھے اور مجھے فرش پر اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے گئے۔ کامن روم میں گھسی ہوئی جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ احاطے کی طرف سے گاہے بگاہے ایک زخمی کتے کی کربناک آواز ابھرتی تھی۔ وہ لوگ ایک کوریڈور سے گزرے۔ ایک دروازہ کھولا گیا اور مجھے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں پر دھکا دے دیا گیا۔ تیرہ چودہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا میں پختہ فرش پر گرا۔ ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میرا چہرہ مزید زخمی ہونے سے محفوظ رہا۔ بس کندھوں اور سینے پر کچھ چوٹیں آئیں...... سیڑھیوں والا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا گیا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اردگرد دیکھا۔ یہ بیسمنٹ ایک ہال کمرے جیسا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، اس جگہ دو افراد اور موجود تھے۔ ایک کی عمر تیس سال کے قریب ہو گی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کافی دیر سے یہاں بند ہے۔ غالباً وہ کسی نشے کے زیر اثر سویا ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ میری دھماکا خیز آمد کے باوجود وہ اسی طرح پڑا رہا تھا۔ یہاں موجود دوسرے بندے کو دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ یہ فتح محمد تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اسے بری طرح پیٹا گیا ہے۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ سر

پھٹ چکا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ وہ بھی نیچے کھسکی ہوئی تھی اور اس کے ستر کو بس جزوی طور پر ہی چھپا پا رہی تھی۔ فتح محمد نیم بے ہوش تھا اور اسی عالم میں اس کی سیاہی مائل توند، سانس کی ضرورت کے تحت بے ساختہ پھول پچک رہی تھی۔

میرے ہاتھ افراتفری میں باندھے گئے تھے۔ میں نے معمولی کوشش کے ساتھ انہیں کھول لیا۔ میں نے فتح محمد کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ ''اٹھو، ہوش کرو۔''

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اور کراہ کر رہ گیا۔ اس کے سر کی چوٹ شدید تھی، مسلسل خون رِس رہا تھا۔ قریب ہی ایک ٹرے میں کھانے کے جھوٹے برتن پڑے تھے۔ اسٹیل کے ایک جگ میں پانی بھی تھا۔ میں نے فتح محمد کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

میرے کانوں میں تھوڑی دیر پہلے سنا ہوا وہ فقرہ گونجنے لگا جو کسی شخص نے بولا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچا دو۔''

یعنی یہ لوگ مجھے اور فتح محمد کو ایک ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی کہ اس کوٹھی میں گھستے ہی مجھے دھر کیوں لیا گیا تھا۔ فتح محمد کے پکڑے جانے کے بعد یہ لوگ پوری طرح الرٹ ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں جونہی احاطے میں کودا، وہ مجھ پر پل پڑے...... لیکن میں ان کے لئے تر نوالہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے دو اور چار ٹانگوں والے کم از کم چھ کتوں کو جان لیوا طور پر زخمی کیا تھا۔ آخری زخمی وہ تھا جس پر میں نے جیپ چڑھائی تھی۔ میں اس گنتی میں اسے شامل نہیں کر رہا۔

صورتِ حال نے عجیب پلٹا کھایا تھا۔ میں جب فارم ہاؤس سے چلا تو میری نظر میں فتح محمد ایک مشکوک شخص تھا اور اس کے لئے میرے اندر ایک طیش پرورش پا رہا تھا۔ مگر اب اس طیش کا رخ اس کوٹھی میں موجود غنڈا صفت لوگوں کی طرف ہو گیا تھا۔ یہ بات ابھی تک ایک معما تھی کہ فتح محمد چوری چھپے یہاں کیوں گھسا اور کیوں اسے یوں بری طرح زخمی کیا گیا؟ کیا وہ کسی واردات کی نیت سے آیا تھا، یا یہ آپس کا کوئی گروہی جھگڑا تھا؟

اسی دوران میں سیڑھیوں کے دروازے کے قریب ہنگامے کے آثار نظر آئے۔ یوں لگا کہ کوئی شخص دہاڑ رہا ہے اور دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسرے اسے روک رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اوپر مجھ کو چاقو سے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، انور نامی یہ شخص اس زخمی کا بھائی تھا جس کی ناف میں، میں نے چاقو اتارا تھا۔ وہ اسپتال روانہ ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گیا تھا۔ اب یہ شخص غم و غصے میں

دیوانہ ہو رہا تھا۔

میرا جسم چوٹوں سے معمور تھا۔ خاص طور سے ٹانگ میں زبردست ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے مزہ دے رہا تھا۔ میرے اندر چوٹوں اور تکلیف کی طلب بڑھ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں پکار رہا تھا۔ ''آؤ، میرے سامنے آؤ۔ دو دو تین تین ہو کر آ جاؤ۔ مجھ سے لڑو۔ تم مجھے مار دو یا میں تمہیں مار دوں۔'' ہاں، آج 18 اپریل تھی۔ آج کے دن وہ جدا ہوئی تھی مجھ سے۔ آج کے دن میں مرا تھا۔ آج کے دن دوبارہ مر جاتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔

دو تین گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ میں اونگھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر کہیں پاس سے ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''میں خود دیکھ لیتا ہوں۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔''

میں دھوکا نہیں کھا رہا تھا۔ یہ آواز جلالی صاحب کے وفادار ساتھی ''سیکرٹری ندیم'' کی تھی۔ میرے اندر امید کی کرن روشن ہوئی۔ 'تو کیا عمران اور دیگر لوگ یہاں پہنچ گئے تھے؟ کیا پولیس بھی ان کے ساتھ تھی؟ ایسے کئی سوال ذہن میں چمکے۔ بیسمنٹ کے ساتھ والے پورشن میں روشنی ہوئی پھر میں نے آہنی سلاخوں کی طرف سیکرٹری ندیم کو دیکھا...... ہاں، وہ ندیم ہی تھا مگر جس حلیے میں تھا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک انڈر ویئر تھا۔ ہاتھ میں وہسکی کا جام اور ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ ایک پری پیکر اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس نے ایک ''نائٹ گاؤن'' پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ اتنا باریک تھا کہ اپنے ہونے پر شرمندہ دکھائی دیتا تھا...... اس کے اندر پری پیکر کا جسم اسی طرح دہک رہا تھا جیسے مہین چلمن کے پیچھے شمع دہکتی ہے۔ پری پیکر کے خدوخال میں ایک خاص بات تھی اور اس نے مجھے حیران کیا...... لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرانی مجھے سیکرٹری ندیم کے حوالے سے تھی۔ اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ جلالی صاحب کا وفادار ترین ساتھی یہاں ایک بالکل مختلف روپ میں موجود تھا۔ ہم جب فارم ہاؤس میں کسی کالی بھیڑ کے بارے میں سوچتے تھے تو بہت سے ملازمین کی طرف دھیان جاتا تھا لیکن سیکرٹری ندیم کی طرف کبھی دھیان نہیں گیا۔ اس کی دھیمی شخصیت، اس کا پُرخلوص انداز، اس کی ملنساری...... یہ ایسی چیزیں تھیں شاید، جو اس کی طرف دھیان جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ندیم نے ایک کرسی گھسیٹی اور آہنی سلاخوں کے عین سامنے میری طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ پری پیکر اس کے عقب میں کسی خدمت گار داشتہ کی طرح کھڑی تھی۔ ندیم کی آنکھوں میں نشہ تھا اور زہر تھا۔ اس نے انگلی سے اپنی ناک پر نظر کی عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''جب کسی حرامی گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم خود ہی یہاں تشریف لے آئے ہو۔ ہمیں تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔''

میں خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ بڑا بدحال ہے۔ بال بکھرے ہوئے، ناک اور منہ سے بار بار خون رِسنے لگتا تھا۔

ندیم کے عقب میں کھڑی لڑکی نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ میرے حوالے سے خوف زدہ ہے۔ وہ مجھے انہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن سے پنجرے میں بند کسی خطرناک جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ آہنی سلاخوں کی وجہ سے تحفظ کا احساس تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ ڈر بھی تحت الشعور میں رہتا ہے کہ سلاخیں نہ ہوں تو کیا ہو۔ اس لڑکی کے خدوخال نے مجھے چونکایا تھا اور یہ چونکنا بے وجہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے سلطان کے ٹھکانے پر میری ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جس کی شکل وصورت بہت حد تک انڈین فلمسٹار کرشمہ کپور سے ملتی تھی۔ اب جو لڑکی میرے سامنے تھی، اس کا چہرہ کئی زاویوں سے ایک اور معروف اداکارہ ایشوریا رائے سے مشابہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کے پاس معروف اداکاراؤں سے مشابہت رکھنے والی لڑکیوں کی ''کلیکشن'' ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہو رہی تھی کہ یہ جاوا اور سلطان گروپ کے لوگ ہی ہیں......

ندیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں باورچی نہیں ہو، اس کا اندازہ تو مجھے تمہاری آمد کے دو چار روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ پھر جب تم نے جلالی کی جیپ کے پیچھے بھاگ کر اسے روکا اور جیپ کے نیچے سے ٹریکر نکالا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم بھیڑ کی کھال میں کوئی خطرناک اور پلید جانور ہو۔ مگر اتنا اندازہ پھر بھی نہیں ہوا کہ تم بھیڑیے وغیرہ سے بھی زیادہ خطرناک اور پلید ہو۔ تم نے پچھلے ہفتے سلطان جی کے ٹھکانے میں گھس کر نادرا اور ایک ملازم کو جان سے مارا اور نیتو کو زخمی کیا...... دراصل اس دن تم دونوں نے اپنی بدقسمتی پر مہر لگا لی تھی۔''

''بدقسمت کون ہے، یہ وقت بتائے گا۔ تم دور بیٹھے ہو، اگر پاس ہوتے تو میں تمہارے منہ پر ضرور تھوکتا۔ جلالی صاحب نے تمہیں بیٹوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ تم ان کی جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔''

''میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ جو کچھ تم بول رہے ہو، اس کی سزا تمہیں تمہارے گمان سے زیادہ ملنے والی ہے۔ یہاں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، وہ بہت برا ہے۔ جاوا صاحب فلمی آدمی ہیں۔ دنیا بھر کی فلموں میں آج تک جتنے بھی بڑے بڑے ولن تشریف

لائے ہیں، ان کی ساری سختی اور گرمی یکجا ہو کر جاوا صاحب کے اندر آ گئی ہے اور اب تمہیں اس کا سامنا کرنا ہے۔"

اس نے ذرا توقف کیا۔ نیا سگریٹ ہونٹوں میں رکھا۔ ایشوریا کی ہم شکل لڑکی نے جھک کر لائٹر کا شعلہ سگریٹ کو دکھایا۔ اس کا جسم توبہ شکن تھا۔ ندیم سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر اچانک بولا۔ "سلطانی گواہ بننا پسند کرو گے؟"

"کیا مطلب؟"

"یوں سمجھ لو کہ تمہاری ایک طرف دوزخ ہے اور دوسری طرف جنت۔ دونوں میں داخلے کا ٹکٹ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں مشروط معافی مل سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے نادر اور دیگر دو بندوں کو براہِ راست نہیں مارا۔ اصل قاتل، وہ ماں کا ہیرو عمران بازی گر ہے۔"

"میں ان باتوں کے جواب میں بھی تمہارے منہ پر بس تھوکنا ہی پسند کروں گا۔"

"بہت گرمی ہے...... بہت گرمی ہے۔"

"تمہارے خیال سے بھی زیادہ۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں جنت میں آ جاؤ۔ یہاں ٹھنڈی ہوائیں ہیں...... زمین پر بہشت کا مزہ پاؤ گے۔" اس نے بڑی ادا سے ایشوریا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ذرا سا گھما کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے بالوں کو چومتے ہوئے بولا۔ "یہ فلمی دنیا ایک بہت بڑا پری خانہ ہے...... اور جاوا صاحب اس پری خانے کے چار داروغوں میں سے ایک ہیں۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ پری خانوں میں کیا نہیں ہوتا۔"

میں خاموش رہا۔

وہ سمجھا شاید میں کچھ سوچ رہا ہوں لیکن میں تو وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جو اس کی شان کے مطابق ہوں اور اس کے منہ سے لے کر اس کی دُم تک آگ لگا دیں۔

وہ بولا۔ "وہ ماں کا ہیرو بہت کھوچل اور خرانٹ بندہ ہے۔ دیکھو، وہ آپ تو بیٹھا ہوا ہے اس ٹھرکی بڈھے جلالی کے پاس۔ خود تو فارم ہاؤس سے باہر نہیں نکلا اور تم دونوں کو یہاں بھیج دیا ہے مرنے کے لئے۔"

"تم دونوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"تم اور یہ مردہ بھینسا۔" اس نے فتح محمد کی طرف اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا۔ ندیم اور اس کے ساتھیوں کو یقین تھا کہ میں اور فتح محمد اکٹھے فارم ہاؤس

سے یہاں آئے ہیں۔ پہلے فتح محمد دیوار پھلانگ کر اندر گھسا، کچھ دیر بعد میں بھی کود پڑا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچا تھا۔

میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، یہاں کوئی خزانہ دفن ہے جسے ڈھونڈتے ہوئے ہم یہاں پہنچ گئے ہیں؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہوگا کہ کیا دفن ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، ہم کیوں آئے ہیں؟"

اس نے گہرا کش لے کر الکحل کی بو والا دھواں "ایشوریا" کے عین منہ پر چھوڑا۔ ممکن ہے کہ اسے ناگوار گزرا ہو لیکن وہ اس کی ذاتی خدمت گار تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو ذرا سی حرکت بھی نہیں دی اور حاکم مرد کی دیگر دست درازیوں کی طرح اس دھوئیں کو بھی خوش دلی سے قبول کیا۔ ندیم بولا۔ "مجھے لگتا ہے، تم دونوں نے یہاں بوگیر کتوں والا کردار ادا کیا ہے۔ شاید آج میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔ وہ ماں کا ہیرو دیکھنا چاہتا ہوگا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کیوں؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ غلط ہے اور تم خود کسی اوندھے کتے کی طرح ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو تو پھر؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری باتوں کا برا نہیں مانوں گا...... کیونکہ اس بکواس کے بدلے میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے وہ زبانِ بیان سے باہر ہے۔ اگر تم اس ماں کے ہیرو کے ساتھ چمٹے رہو گے اور میری آفر سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو تم پر بھی موت کی مہر لگ جائے گی۔ جیسے اس ماں کے ہیرو پر لگی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ عجیب زہریلے انداز میں مسکرایا۔ "جاوا صاحب کے بھرت وچن کا پتا ہے تمہیں؟"

"یہ کیا ہے؟"

وہ ہنسا اور ایشوریا رائے کو دوبارہ اپنی آغوش میں کھینچ کر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھا سویٹی ان باسٹرڈز کو کچھ پتا نہیں۔ کچھ بھی پتا نہیں۔ وہ اس کتے کے پلے عمران ہیرو کو زندہ سمجھ رہے ہیں جبکہ وہ مر چکا ہے۔ ایک سو دس فیصد مر چکا ہے۔ سمجھو ایک ایسا مرغا جس کا سر کٹا ہوا ہے لیکن وہ ابھی اچھل کود کر رہا ہے۔ ان احمقوں کو بتاؤ سویٹی کہ جاوا صاحب کا بھرت وچن کیا ہوتا ہے۔"

"جی...... میں؟" وہ ہکلائی۔

"ہاں تم......"

وہ ذرا سا جھجکی پھر سیکرٹری ندیم کی آغوش میں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی انگلی سے پہلے خود کو اور پھر وہسکی کے جام کو چھوتے ہوئے کہا۔"جاوا صاحب کو اس سے اور اس سے بڑی محبت ہے۔مطلب عورت اور وائن......لیکن کبھی کبھی وہ ان دونوں چیزوں کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا وہ اس وقت کرتے ہیں جب اپنے آپ سے کوئی کام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔مثلاً...... مثلاً......"وہ ہاتھ نچا کر رہ گئی۔شاید اسے کوئی مناسب مثال نہیں سوجھ رہی تھی۔اس نے مدد طلب نظروں سے ندیم کی طرف دیکھا۔

ندیم بولا۔"مثلاً یہ کہ تین چار مہینے پہلے انڈیا کی ایک نئی ابھرتی ہوئی فلمی ہیروئن زیڈ نے جاوا صاحب کے آستانے پر حاضری دینے سے انکار کر دیا تھا۔حالانکہ اس سے پہلے وہ دس پندرہ حاضریاں بخوشی لگوا چکی تھی۔اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے اکسانے پر ایسا کیا تھا۔اس کا بوائے فرینڈ بھی ایک بہت بڑا بزنس مین ہے۔بڑی اکڑ تھی اس میں بھی۔اس اکڑ کی وجہ سے اس نے معاملہ خراب کر لیا۔جاوا صاحب نے اپنا مشہور زمانہ بھرت رکھ لیا۔اور بھرت یہی تھا جو ابھی تمہیں سویٹی نے بتایا ہے۔انہوں نے سوگند کھا لی کہ جب تک زیڈ ان کے گھر پر آ کر ان کے پاؤں نہیں چومے گی، وہ عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ دیکھو، بڑے بندوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔اب کیا زبردست سائنس ہے اس بات میں۔لیکن شاید یہ تم دونوں احمقوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ان کو ذرا بتاؤ سویٹی۔"

"جی، آپ ہی بتائیں......"وہ لجاجت سے بولی۔

ندیم نے کش لے کر دھوئیں کی ایک اور بدبودار پھوار سویٹی عرف ایشوریا کے منہ پر ماری جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ندیم اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے بولا۔"بندے کی کمزوری ہے کہ وہ بھول جاتا ہے۔مثلاً وہ کسی سے بدلہ لینا چاہتا ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کے غصے میں وہ تیزی اور طاقت ہی نہیں رہتی۔لیکن اگر اس غصے کو کسی دوسری چیز کے ساتھ نتھی کر لیا جائے تو پھر بھولنے کا عمل ناکارہ ہو جاتا ہے۔جاوا صاحب عورت اور شراب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ان دونوں چیزوں کی دوری انہیں بری طرح تڑپاتی ہے۔ان کا ارادہ کمزور نہیں ہونے دیتی۔جب جاوا صاحب عہد کر لیتے ہیں کہ فلاں کام کے ہونے تک وہ ان دونوں چیزوں سے دور رہیں گے تو پھر وہ کام ہر صورت ہوتا ہے اور جلد سے جلد ہوتا ہے۔تمہارے اس ماں کے ہیرو کے لئے بھی بھرت وچن ہو چکا ہے۔اسی لئے تو کہتا ہوں کہ اب وہ ایک سر کٹا مرغا ہے۔نہ دانہ کھا سکے گا، نہ کسی مرغی سے میل کر سکے گا، نہ بانگ

دے سکے گا۔ایسے مردہ مرغے کے لئے اپنی جان مت گنواؤ۔سلطانی گواہ بن جاؤ۔بہت فائدے میں رہو گے۔ٹھنڈی ہوائیں، پری خانہ......"اس نے ایک بار پھر گل بدن سویٹی سے رومانی چھیڑ چھاڑ کی۔

وہ ہمارے روبرو ان حرکات پر شرمسار تھی لیکن اس نے اپنے ردِعمل سے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ذرا مسکرا کر بولی۔"آپ نے ہیروئن زیڈ والی پوری بات تو بتائی ہی نہیں۔"

وہ وہسکی کا گھونٹ بھر کر بولا۔"پوری بات کیا ہونی تھی۔بس دھوبی پٹکا مار دیا جاوا صاحب نے۔دفعہ 302 کے ایک پرچے میں ہیروئن کے بوائے فرینڈ کا نام شامل ہو گیا اور ایسا شامل ہوا کہ جناب کے کڑاکے نکل گئے۔دفعہ 302 کوئی معمولی چیز نہیں ہوتی۔کینسر کی طرح بندے کو لگ جاتی ہے۔دو ڈھائی مہینے میں ساری چوکڑی بھول گئی۔ڈیڑھ دو کروڑ روپیا بھی لگ گیا۔بھاگ دوڑ میں بزنس کی علیحدہ سے بینڈ بجی۔آخر وہی ہوا جو جاوا صاحب چاہتے تھے۔اپنے بوائے فرینڈ سے محبت نبھاتے ہوئے زیڈ نے چپکے سے جاوا صاحب کے پاس"حاضری"لگوا دی لیکن ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔سب کو پتا چل گیا کہ"بوائے فرینڈ"کا نام پرچے سے کس طرح اور کیوں خارج ہوا ہے۔"

بات کرتے کرتے ندیم خاموش ہو گیا۔سیل فون کی مترنم بیل سنائی دی تھی۔سویٹی عرف ایشوریا رائے نے اپنے نہایت باریک سیلینگ گاؤن کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک سیل فون نکال کر ندیم کی طرف بڑھا دیا۔اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ کس کی کال ہے۔اس کا مطلب تھا کہ یہ ندیم ہی کا سیل فون ہے۔ندیم نے اسکرین پر نگاہ ڈالنے کے بعد کال ریسیو کی اور ایک دم مؤدب نظر آنے لگا۔"جی باس......جی باس......میں آپ ہی کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔جی سر......فارم ہاؤس سے نکلنے والے سارے راستوں پر ہمارے بندے پہنچ چکے ہیں......بالکل گھیرے میں ہے جی۔قریباً ایک گھنٹا پہلے گھیرا مکمل ہو گیا ہے......نہیں نہیں سر! آپ فکر نہ کریں......وہ نکل نہیں سکے گا۔بالکل نہیں جناب......یہ جو اس کے دو یار پکڑے گئے ہیں، گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ہی فارم سے نکل آئے تھے۔بہرحال تسلی کی بات ہے جی کہ دونوں خود چل کر اپنے مرنے کی جگہ پر آ گئے ہیں۔میرے سامنے پڑے ہیں دونوں پنجرے میں۔ایک تو خاصا زخمی ہے جی۔"

وہ کچھ دیر تک دوسری جانب سے کی جانے والی بات کو غور سے سنتا رہا اور ادب سے سر ہلاتا رہا۔اس دوران میں سویٹی چور نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔میرے حوالے سے اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس موجود تھا اور یہ ہراس مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ندیم نے آخر

میں کہا۔ ’’جی باس...... میں نے اسے آفر کر دی ہے۔ امید ہے اس کے کھوپڑے میں بات آ جائے گی۔‘‘

یہ آخری فقرہ غالباً میرے بارے میں تھا۔ میرا دماغ بری طرح سنسنا رہا تھا۔ صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ گھمبیر تھی۔ پورے فارم ہاؤس کو جاوے کے لوگوں نے گھیر لیا تھا۔ راستوں کی ناکابندی کی ہوئی تھی۔

فون بند کر کے ندیم نے واپس سویٹی ایشوریا کو تھمایا اور اس نے اسے لائٹر اور سگریٹ کیس کے ساتھ ہی اپنے پیازی رنگ کے گاؤن میں رکھ لیا۔ ندیم نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’میں اپنی آفر کے سلسلے میں تمہیں کل بارہ بجے تک کا وقت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن فیصلہ کرتے وقت دوزخ اور جنت والی بات ضرور ذہن میں رکھنا۔ اور ہاں، ایک بات اور...... فریب نہیں چلے گا۔ اگر سلطانی گواہ بنو گے تو اس کا سالڈ ثبوت بھی دینا پڑے گا، بالکل سالڈ۔‘‘

میں بس اسے گھورتا رہا۔ وہ بولا۔ ’’یہ نہیں پوچھو گے کہ سالڈ ثبوت سے کیا مطلب ہے؟...... اچھا چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں۔ سالڈ ثبوت یہ ہوگا کہ تمہیں اس ماں کے ہیرو کو کال کرنا ہوگی اور کال کر کے اسے ایک خاص جگہ پر بلانا ہوگا۔ ہمارے مطلب کی جگہ پر اور...... اور اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ اپنے گرگوں کی فوج کے ساتھ آئے گا۔ ہمیں تو پھر بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اس کا بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’اس کی کوئی فوج نہیں ہے...... اور نہ اس نے جاوے کی طرح پالتو کتے رکھے ہوئے ہیں...... وہ اکیلا تم جیسے بھگوڑوں سے نمٹ سکتا ہے۔‘‘

’’غلط فہمیاں ہیں تمہاری۔‘‘ وہ کش لے کر بولا۔ ’’اور یہ بھی غلط فہمی ہے کہ اس کی فوج نہیں ہے۔ وہ بہت کچھ چھپاتا ہے تم جیسے چچھوں سے۔ اس کے بہت سے گرگے ہیں جو اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ اپنے تئیں ڈان شان بنتا ہے۔ وہ...... لیکن اب اونٹ پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ اب اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا اور یہ بھی خبر ہو جائے گی کہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانا کسے کہتے ہیں۔ اس کو تو اب مرنا ہی ہے لیکن اگر تم زیادہ خون خرابے سے بچنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ وہ کسی طرح اکیلا چلا آئے۔‘‘

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں واقعی اس خبیث کے منہ پر تھوک دوں لیکن میں معاملے کو مزید گرم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہئے تھا...... عین ممکن تھا کہ کوئی راستہ نکل آتا۔

کچھ دیر بعد ندیم نے ایشوریا رائے سے مشابہت رکھنے والی سویٹی کو اپنی بغل میں لیا اور ڈگمگاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اس ساری بات چیت میں لکڑی کے باکس کا ذکر ہوا تھا اور نہ اس میں موجود آرا کوئے کا۔ یقیناً ندیم کو بھی پتا تھا کہ ہم جلالی صاحب کے دیگر ملازمین کی طرح آرا کوئے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اب یہاں جو کارروائی بھی ہو رہی تھی اور ہونے والی تھی، وہ خالصتاً انتقامی تھی اور اس کے ڈانڈے یقیناً چند روز پہلے ہونے والے نادر ٹی ٹی کے قتل سے مل رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ سلطان چٹا اور عمران ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں اور شاید ہاتھوں میں ہاتھ بھی ڈال چکے ہیں۔ دشمنی کی یہ دبی دبی چنگاریاں نادر ٹی ٹی کے قتل کے بعد ایک دم شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھیں اور اب کھلی جنگ کی صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ جاوا گروپ کے درجنوں مسلح افراد فارم ہاؤس کے اردگرد موجود ہیں۔ یقیناً اسی علاقے میں جلالی صاحب کی سیکورٹی کے لوگ بھی موجود تھے، ان کے درمیان کسی بھی وقت ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

ندیم کے جانے کے بعد میں فتح محمد کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اس کے سر سے خون رِس رِس کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں رائفل کے کندے سے زوردار چوٹ لگائی گئی ہے۔ میں نے سب سے پہلے ایک کپڑے کی پٹی بنائی اور سر سے بہنے والا خون بند کیا پھر اس کے چہرے پر گیلا کپڑا پھیرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اسے مدھم آواز میں پکارتا رہا۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد فتح محمد نے پلکوں کو حرکت دی اور اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدلنے لگی۔

آخر، میں اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ہمارے اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا بیسمنٹ سنسان پڑا ہے۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ بظاہر مجھے کوئی خفیہ کیمرا یا مائیکروفون کی شے دکھائی نہیں دی۔

فتح محمد مجھے دیکھ کر اور پہچان کر حیران ہوا۔ میں نے اس سے حوصلے تسلی کی باتیں کیں اور اسے باور کرایا کہ میں اس کی مدد کے لئے یہاں پہنچا ہوں۔ اس نے نہایت نحیف آواز میں پانی مانگا۔ میں نے پانی پلایا۔ ایک ڈبے میں تھوڑا سا دودھ بھی بچا ہوا تھا۔ میں نے وہ بھی فتح محمد کے گلے میں ٹپکا دیا۔ اس کا خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا اور وہ سخت نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

وہ لڑکھڑاتی آوز میں بولا۔ ’’باؤ تابش! میں نے جلالی صاحب کا نمک کھایا ہے۔ مجھے

ان کا درد ہے۔ یہ...... یہ سیکرٹری ندیم ایک دم غداری کر رہا ہے۔ جلالی صاحب کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے...... اسے معاف نہیں کرنا...... بالکل نہیں کرنا۔"

"پر تم یہاں کیسے پہنچے؟"

اس نے کھینچ کر دو تین سانس لئے اور بولا۔ "مجھے اس پر کئی دنوں سے شک تھا۔ دو دن پہلے میں نے اس کا پیچھا کیا۔ یہ اس کوٹھی میں گھسا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیا چل رہا ہے، پر...... مجھے پتا نہیں تھا کہ یہاں اتنے سارے لوگ ہوں گے۔ میں...... آہ۔" وہ بری طرح کراہنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے بائیں بازو پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس بازو سے میں نے فتح محمد کی کمر کو سہارا دے رکھا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میرا یہ بازو خون سے گیلا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گھوم کر نظر ڈالی اور لرز گیا۔ عقب سے فتح محمد کا پہلو کسی تیز دھار آلے سے چرا ہوا تھا۔ زیریں پسلیاں نظر آ رہی تھیں اور اندرونی چربی بھی۔ وہ میرے اندازے سے زیادہ زخمی تھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔

میں نے پکار کر کہا۔ "کوئی ہے؟"

تیسری چوتھی آواز پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر چوڑے جبڑوں والا ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آیا تھا۔ یقیناً نیند سے بیدار ہوا تھا۔ "کیا بات ہے وڑی؟ کیا لفڑا ہے؟" وہ مکرانی لہجے میں بولا۔

"اس کی حالت ٹھیک نہیں...... اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت ہے فوراً۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر تک کراہتے ہوئے فتح محمد کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "تھوڑا صبر کرو وڑی۔ صبح ہونے والی ہے۔ اس کو درد کا ٹیکا لگا دیتے ہیں۔ آرام آ جائے گا۔ باقی کل دیکھا جائے گا۔"

"یہ ٹیکے کا معاملہ نہیں، اس کا زخم زیادہ بڑا ہے۔"

"ٹیکا بھی عام نہیں ہے۔ اس کو بالکل شانت کر دے گا۔ ایک دم پھسٹ کلاس۔" وہ واپس گیا اور تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک پتلی اونچی ناک والا کرخت سا شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پسٹل تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ٹیکا ہے۔ ابھی اس میں دوائی ڈالتے ہیں۔" مکرانی نے کہا۔

اونچی ناک والے نے جیب سے اعشاریہ تین آٹھ کی گولی نکال کر پسٹل میں لگائی۔ میرے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ فتح محمد کا منہ کھلا رہ گیا ہے۔ اس کی سمجھ

میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں چنگھاڑا۔

"ٹیکا لگا رہے ہیں۔ تسلی سے سو جائے گا۔ ہمیں بھی سونے دے گا۔" اونچی ناک والا سفاک لہجے میں بولا۔

"تم یہ نہیں کر سکتے۔" میں نے پھر چنگھاڑتی آواز میں کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟ تم نادر صاحب کو مار سکتے ہو، فضلو اور راہی کو پار کر سکتے ہو تو ہمارے ہاتھوں میں کوڑھ تو نہیں ہے۔"

میں نے فتح محمد کو دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور خود کو اس کے سامنے ڈھال بنا دیا۔

"میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ ندیم کو بلاؤ۔"

"وڑی اپن کا مغز خراب مت کرو۔ ندیم صاحب سینئر ڈاکٹر ہیں۔ ویسے بھی ابھی وہ ایک اور مریض کو دیکھ رہے ہیں بلکہ "مریضہ" کو۔ اب وہ صبح ہی "وارڈ" کا راؤنڈ لگائیں گے۔ وڑی، انہوں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اگر یہ فتح محمد زیادہ درد بتائے تو پھر اسے یہ SOS انجکشن لگا دینا۔"

اونچی پتلی ناک والے نے سائیلنسر لگا پسٹل فتح کی طرف سیدھا کر لیا لیکن فتح تو مکمل طور پر میرے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اونچی ناک والا پھنکارا۔ "زیادہ ہمدرد مت بنو۔ یہ نہ ہو کہ مریض کے بجائے تمہارا علاج ہو جائے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس نے کافی کوشش کی مگر میرا ارادہ اٹل تھا۔ میں سامنے سے نہیں ہٹا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کم از کم یہ لوگ فی الحال مجھے تو قتل نہیں کریں گے۔

اسی دوران میں اونچی ناک والے کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے مؤدب انداز میں کال اٹینڈ کی۔ "جی ندیم بھائی...... جی ہاں اس کی حالت خراب ہے...... کافی خراب ہے...... ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی۔" اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اس نے ساتھ ہی پسٹل بھی دوبارہ اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "چلو کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر اور چھری کے نیچے سانس لے لو...... بڑے "ڈاکٹر صاحب" نے کہا ہے کہ ابھی ٹیکا رہنے دو۔ لیکن اگر یہ زیادہ ہائے وائے کر کے ہم "ڈیوٹی ڈاکٹرز" کی نیند خراب کرے گا تو پھر ٹیکا لگانا ہی پڑے گا۔"

فتح محمد نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی کراہیں نہ نکل جائیں۔ مکرانی اور لمبی ناک والا ہمیں گھورتے ہوئے واپس چل گئے۔

''پپ...... پانی۔'' فتح محمد نے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

میں کھانے کے برتنوں کی طرف بڑھا اور تب اچانک فائر ہوا۔ یہ سائیلنسر لگے پسٹل کا فائر تھا۔ گولی فتح محمد کی عین پیشانی پر لگی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا، اس کی کھلی آنکھوں میں دہشت تھی اور خشک ہونٹ وا تھے۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار بہنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا...... لمبی ناک والا سفاک انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے فلمی اسٹائل میں پسٹل کو پھونک ماری اور اسے بیلٹ میں اڑس کر دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ ''کتے...... خنزیر کی اولاد! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں دیوانہ وار سلاخوں پر جھپٹا۔ میں نے سلاخوں کو جھنجوڑا۔ ان سے اپنا سر ٹکرایا، ان پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میری آواز سارے در و دیوار میں گونج رہی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب بھانڈیل اسٹیٹ میں سلطانہ کی دردناک موت کے بعد میں غم و غصے سے دیوانہ ہوا تھا۔ آج بھی کچھ ملتی جلتی کیفیت تھی۔

لمبی ناک والے بدمعاش نے ڈاج دیا تھا۔ مجھے زخمی فتح محمد کے سامنے سے ہٹانے کے لئے اس نے واپسی کا ڈھونگ رچایا تھا اور پھر اسے شوٹ کر دیا۔ یہ بڑی بے رحمی تھی اور یہ بے رحمی شاید اس لئے بھی دکھائی گئی تھی کہ میری اکڑفوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہو جائے۔ لیکن وہ غلطی پر تھے۔ اس اچانک موت نے مجھ پر الٹا اثر کیا تھا۔ میرے بدن میں شعلے بھڑک اٹھے تھے...... یہ سلاخیں میرے رستے میں حائل نہ ہوتیں تو آج انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی بہت برا وقت دیکھتی۔

فتح محمد کا لہو فرش پر ایک نہایت افسردہ سی ماتمی لکیر بنا رہا تھا۔ سانس کے لئے اس کی مسلسل حرکت کرتی ہوئی توند اب بالکل ساکت ہو چکی تھی۔ میں نے ایک کپڑا اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ بستر کی ایک کھیس نما چادر سے میں نے فرش پر بہنے والا خون صاف کیا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا شخص بیدار نہیں ہوا تھا۔ نشہ آور نیند نے اسے ارد گرد سے یکسر بیگانہ کر رکھا تھا۔

میں نے ٹھنڈے دل دماغ سے غور شروع کیا۔ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ جاوا کے گردہ نے فارم ہاؤس سے نکلنے والے راستوں پر اپنے بندے مقرر کر دیئے تھے۔ یہ لوگ پوری طرح مسلح اور ہر کارروائی کے لئے تیار تھے۔ ان لوگوں کا اوّلین مقصد عمران کے خلاف انتقامی کارروائی تھی۔ اب ان لوگوں کو صرف اور صرف عمران کے باہر

نکلنے کا انتظار تھا۔

میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا اور گرفت میں آ گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ مجھے چارے کے طور پر استعمال کر کے عمران کو یہاں بلانا چاہ رہے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا...... اور بیدردی سے قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ اپنی سفاکی کا ایک چھوٹا سا نمونہ مجھے ابھی دکھا بھی دیا گیا تھا۔ انسانی زندگی کی ان لوگوں کے نزدیک قطعاً اہمیت نہیں تھی۔ فتح محمد کو صرف اس لئے گولی سے اڑایا گیا تھا کہ وہ شدید زخمی تھا اور اس کی زندگی کی آس برقرار رکھنے کے لئے اسے لاہور کے کسی اسپتال میں پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں نے فتح محمد کی بے حس و حرکت لاش کو دیکھا جو مجھ سے فقط دو تین فٹ کی دوری پر پڑی تھی۔ میں فتح محمد کو مشکوک سمجھ کر اس کے پیچھے لگا تھا لیکن وہ میرے شک سے بالکل مختلف نکلا تھا۔ اور جس شخص کو ہم جلالی کا سب سے وفادار اور مستعد ملازم سمجھتے تھے، وہ غداری کا مثالی نمونہ بن کر سامنے آیا تھا۔ اب یقینی بات تھی کہ کچھ راتیں پہلے اس نے فرم کے نواحی درختوں میں بھی ڈراما ہی رچایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کچھ لوگ لکڑی کے ایک باکس کو ہتھ ریڑھی پر رکھ کر لائے اور جیپ پر لادا۔ اسے خبر تھی کہ اب جلالی صاحب باکس کی لوکیشن چیک کرنے کے لئے جائیں گے اور وہ ان کا پیچھا کرے گا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد رات کے اندھیرے میں جلالی کی پوٹھوہار جیپ کے نیچے ٹریکر ڈیوائس لگانے والا شخص بھی یہی ندیم تھا۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر بڑی سرگرمی سے مشکوک شخص وڈھونڈتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنی کارروائیاں بھی ڈالتا رہا۔

...... صبح تک کوشش کر کے میں نے خود کو کافی حد تک پُرسکون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ صبح سویرے فتح محمد کی نیم عریاں لاش وہاں سے ہٹالی جائے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ لوگ اس لاش کی موجودگی کو میری زبان کھلوانے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ میں جب فتح محمد کے پیچھے نکلا تھا تو میں نے عمران کو مطلع نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اندر خود بھی فیصلے کرنے کی قوت پیدا ہو...... اور اب میں فیصلے کی سولی پر تھا۔ مجھے دوپہر تک کا وقت دیا گیا تھا مگر ٹھیک گیارہ بجے ہی ندیم آن دھمکا۔ اب وہ صاف ستھری پینٹ قمیص میں تھا۔ سرخ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے والا محنتی اور تعلیم یافتہ شخص نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت

خطرناک گروہ کا حصہ بن چکا تھا۔

وہ سگریٹ سلگانے کے بعد سلاخوں کی دوسری جانب رکھی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بولا۔ ''کیا ارادے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''پہلے یہ لاش یہاں سے ہٹاؤ۔''

''اٹھا لیتے ہیں، اتنی جلدی کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو اکٹھی ہی اٹھانا پڑیں۔''

''ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔ تم نے غداری کی ایک زبردست مثال قائم کی ہے، اب تمہیں دوسرے بھی اسی بے غیرتی میں غرق نظر آتے ہیں۔''

''اپنی جان بچانے کو بے غیرتی مت کہو۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں، اگر تم نے ہمارے مطابق عمل نہیں کیا تو تمہاری اور فتح محمد کی لاشیں تھوڑی دیر میں اکٹھے یہاں سے اٹھیں گی۔''

''باندھ کر مارنا کوئی بہادری نہیں۔ اگر ہمت ہے تو اپنے یہ دو چار کتے مجھ پر چھوڑ کر دیکھو۔ نظارہ نہ آجائے تو پیسے واپس۔''

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بولا۔ ''رات رات میں کافی زبان لگ گئی ہے تمہیں۔ ویسے...... کتے چھوڑنے والی بات تو تم نے اچھی کہی ہے۔ جو دو کتے تم نے قتل کئے ہیں، ان کے بھائی بند کافی غم و غصے میں ہیں۔''

میرے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ایک خطرناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں رات بھر یہاں پالتو کتوں کی آوازیں سنتا رہا تھا اور وہ بڑے جسیم کتے تھے۔

میرے اور ندیم کے درمیان دس پندرہ منٹ تک معنی خیز مکالمہ ہوا۔ مکالمے کا لب لباب یہی تھا کہ میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ عمران کو پھنسانے میں ان کی مدد کروں یا پھر نادرے اور دیگر افراد کے قتل کے جرم میں مرنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔

اسی دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ بیسمنٹ سے باہر پورچ کی طرف تین چار بڑی گاڑیاں آکر رکی ہیں۔ ان گاڑیوں کی آواز سن کر ندیم نے ٹانگ پر سے ٹانگ اتاری اور الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی اہم شخص یہاں وارد ہوا ہے۔

رات والی سویٹی ایشوریا رائے تیز قدموں سے اندر آئی۔ اب وہ بہتر لباس میں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔ ملازمہ نے فرش پر سے سگریٹ کے ٹکڑے اور دیگر فالتو چیزیں اٹھائیں۔ کرسیوں کو درست کر کے رکھا۔ سویٹی نے جلدی جلدی لائٹس آن کیں اور ایک میز پر منرل واٹر کی بوتل سجائی۔ چند منٹ بعد بھاری بھرکم قدموں کی آوازیں آئیں۔ کئی افراد بیسمنٹ کی سیڑھیوں کی طرف آرہے تھے، دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے مجھے ایک گرجتی برستی

آواز سنائی دی۔ اس آواز نے ایک غلیظ گالی دی اور کسی پولیس افسر کی شان میں ایک زبردست قصیدہ پڑھا پھر دہاڑتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑو اس کی ماں کے خصم کو۔ لعنت بھیجو۔ تم اس کے بھائی سے رابطہ کرو۔ کسٹم میں ہے۔ اس سے میرا نام لو اور کہو کہ ایک بجے سے پہلے پہلے ہمارا سامان ائرپورٹ سے نکلنا چاہئے۔ ورنہ اس کی بیوی جب ہری پلیٹ والی ہنڈا کار پر اپنے دونوں بچوں کو لینے اسکول جائے گی تو اسے کچھ نہیں ملے گا...... اور صدمے سے تیسرا بچہ جو اس کے پیٹ میں ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

قدم دھڑا دھڑ سیڑھیوں پر پڑ رہے تھے۔ سب سے پہلے مجھے آنے والوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ قریباً ایک درجن کے قریب تھے۔ ندیم اور سویٹی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو چکے تھے۔ آنے والوں میں سب سے آگے پینتیس چالیس سال کا ایک جسیم و توانا شخص تھا۔ اس کا رنگ گندمی اور چہرے پر چیچک کے پرانے داغ تھے......لیکن یہ بہت نمایاں نہیں تھے۔ اس کی ناک چوڑی اور ہونٹ حبشیوں کی طرح موٹے تھے۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ آستینیں اڑسی ہوئی تھیں جن میں سے بازوؤں کی مضبوط مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک بدصورت اور ہیبت ناک شخص تھا۔ اس کے اردگرد مسلح گارڈز تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی جاوا ہے۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ گواہی درست ثابت ہوئی۔ ایک سیل فون جاوا کے ہاتھ میں، دوسرا اس کے گارڈ نے تھام رکھا تھا۔ دوسرے فون پر جاوا نے بات شروع کی تو پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جس دوسرے کالر سے جاوے نے بات شروع کی، وہ اس کی کوئی ساتھی عورت تھی مگر اس سے بات کرتے ہوئے بھی جاوا تواتر سے گالیاں دے رہا تھا۔

بات کرتے کرتے ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے میرے سیل کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ ان لاک ہوا اور جاوا سمیت درجن بھر مسلح گارڈز اندر گھس آئے...... عجیب دہشت اور سنسنی کی فضا تھی۔ ایک گارڈ تیزی سے جھکا۔ اس نے میری ٹانگ پر ٹخنے سے ذرا اوپر ایک آہنی کڑا پہنا دیا۔ اس کڑے کے ساتھ ایک موٹی زنجیر منسلک تھی۔ زنجیر کے آخری سرے پر بھی ایک کڑا تھا۔ اس کڑے کو سیل کی آہنی سلاخوں کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ یہ سارا عمل چار پانچ سیکنڈ میں مکمل ہوا۔ تین چار رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ سیل میں موجود تیسرا شخص نشے کے زیر اثر اب بھی سویا پڑا تھا۔ دو گارڈز اسے اسی حالت میں گھسیٹ کر بیسمنٹ کے دوسرے حصے میں لے گئے۔

جاوے نے فون پر بات ختم کی۔ سرتاپا مجھے گھورا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ ندیم نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔ ''جی باس! یہی ہے ہیرو کا ساتھی۔ تابش نام ہے اس کا۔''

"ہیلو......کون؟"

"میں تابش بول رہا ہوں عمران۔"

"تابی...... یہ کیا بے غیرتی کی ہے یار تم نے؟ کہاں ہو یہ کس کے نمبر سے کال کر رہے ہو؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے چھوٹا سا وقفہ لیا اور پھر تیز اور صاف لہجے میں کہا۔"عمران...... جاوا کے بندے فارم کے چاروں طرف موجود ہیں۔تم کو باہر نہیں نکلنا۔وہ تمہیں قتل کر دیں گے......"

ابھی آخری دو لفظ پوری طرح ادا نہیں ہوئے تھے کہ جاوا نے جھپٹا مار کر فون میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ایک فولادی گھونسا میرے جبڑے پر پڑا اور میں اچھل کر دیوار سے ٹکرایا...... پھر کئی گارڈز وحشیوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔میرا جسم جیسے اچانک ہی وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا۔رائفلوں کے بٹ، ٹھوکریں، گھونسے، ہر طرح کی کاری ضرب مجھے لگائی جا رہی تھی۔مارنے والوں میں یقیناً جاوا بھی شامل تھا۔اس کی دہاڑوں اور غلیظ گالیوں سے اس زمین دوز کوٹھری کے در و دیوار گونجنے لگے۔دو تین منٹ میں ہی میں زخم زخم ہو گیا۔تب مجھے اپنی ایک ٹانگ میں شدید جھٹکا محسوس ہوا۔میرا سر پہلے پختہ فرش سے ٹکرایا پھر ہوا میں معلق ہو گیا۔مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے الٹا لٹکایا جا رہا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد میں تہ خانے کی چھت سے الٹا جھول رہا تھا۔میرا سر فرش سے قریباً پانچ فٹ بلند تھا۔میرے جسم اور چہرے سے بہنے والا خون قطرہ قطرہ سیاہی مائل فرش پر گرنے لگا۔جاوا دہاڑا۔"مارو کتے کو۔اس کے اندر جو کچھ ہے اس کی گندی ناک کے راستے باہر آ جانا چاہیے۔"

دو تنومند گارڈز نے اپنی چرمی بیلٹ اپنی پتلونوں سے نکالیں اور مجھ پر پل پڑے۔ان بیلٹوں کے ساتھ بھاری آہنی بکل بھی موجود تھے۔میرے پورے جسم پر انگارے دہکنے لگے۔ہر دفعہ جب شڑاپ کی آواز آتی۔مجھے لگتا کہ کسی نے آگ میں دہکائی ہوئی سلاخ میرے جسم پر رکھ دی ہے۔ستم بالائے ستم یہ تھا کہ میں صرف ایک ٹانگ کے ذریعے چھت سے جھول رہا تھا۔ٹانگ کے جوڑ اکھڑتے محسوس ہو رہے تھے اور یہ وہی ٹانگ تھی جس پر لڑائی کے دوران میں، میں نے ایک شدید چوٹ سہی تھی۔میری دوسری ٹانگ......زنجیر کی بندش سے آزاد تھی، عجیب بے ڈھنگے انداز میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت کر رہی تھی۔

ہر انسان میں تکلیف برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے اور میں کوشش و مشق سے اس

حد کو کافی آگے لے جا چکا تھا لیکن پھر بھی ایک حد تو موجود تھی۔یہ حد کافی دیر سے آئی لیکن آ گئی۔گارڈز کی وحشیانہ ضربوں نے میری تکلیف کو عروج پر پہنچایا اور پھر...... میرا ذہن ایک گھٹن زدہ تاریکی میں ڈوبنے لگا۔میں بے ہوش ہو گیا......لیکن نہیں...... یہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کی کیفیت تھی۔مجھے اپنی مدھم کراہیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور جاوا کی دہاڑیں بھی۔پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ کر وہ لوگ باہر نکل گئے اور یہ بہت برا حال تھا۔جیسے کسی شکار کئے ہوئے پرندے کے جسم پر کٹ لگا کر اور ان کٹس میں مرچ مسالا بھر کر اسے انگاروں پر بھونا جا رہا ہو۔مجھے لگا جیسے میری ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اور میں اس ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ ہی جھول رہا ہوں۔

میرا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اس خون کو اپنے چہرے پر رینگتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ارد گرد کے سارے مناظر تاریکی میں ڈوب چکے تھے۔کوئی آواز سماعت تک پہنچتی تھی تو وہ جیسے کسی اتھاہ کنوئیں سے برآمد ہوتی تھی۔اس کنوئیں کی گہرائی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔میں نے سوچا......تو کیا میں مر رہا ہوں؟ ثروت کا چہرہ ایک بار پھر نگاہوں میں آیا۔ایک سہانی شام یاد آئی۔ہم پھولوں سے گھری ہوئی ایک روش پر پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ایک وعدے کی طرح...... ایک پیمان کی صورت۔"ثروت! ہم کبھی جدا تو نہیں ہوں گے نا؟" میں نے کہا۔

"نہیں تابش! اب تو واپسی کا راستہ ہی نہیں ہے۔"

"لیکن اگر کوئی اونچی دیوار رستے میں آ گئی تو؟"

"میں اس دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اسے توڑ دوں گی یا پھر اپنی جان دے دوں گی۔"

"وعدہ؟"

"ہاں وعدہ۔" اس نے میرے ہاتھ کو ہولے سے دبایا تھا اور چلتے چلتے میرے ساتھ لگ گئی تھی۔جیسے وہ صرف اپنی زبان سے نہیں، اپنے پورے جسم کے ساتھ وعدہ کر رہی ہے۔

تب ساون کی ایک طویل جھڑی کا منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔اپنے گھر کی بالکونی میں ہم پاس پاس کھڑے تھے۔بارش کی چھینٹیں جسم میں ایک جاں فزا گدگدی پیدا کر رہی تھیں......"ثروت! مجھے ڈر کیوں لگتا ہے...... کیوں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہم کہیں بچھڑ نہ جائیں؟"

"پیار کرنے والوں کو دھڑکا تو ہوتا ہی ہے۔"

"اس دھڑکے کو کیسے ختم کریں؟"

اور یہ فتح محمد ہے۔'' ندیم نے فتح کے خون آلود چہرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ فتح کے خشک ہونٹ وا تھے اور آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔

جاوا پھنکارا۔'' جو سالا کمینہ مر گیا ہے اس کی بات چھوڑو۔ جو زندہ ہے اس کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ نکالو۔ کیا کہتا ہے یہ کتا؟''

ندیم نے کہا۔'' سر! میں نے اسے دوپہر تک کا وقت دیا تھا ہیرو کو کال کرنے کے لئے۔''

جاوا بھنائی ہوئی آواز میں بولا۔'' وقت تمہاری والدہ نے ایجاد کیا تھا جو ہر کسی کو دیتے پھرتے ہو؟ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، بالکل نہیں ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس نے اپنی قیمتی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ پھر میرے قریب آتے ہوئے بولا۔'' بچے! ہونے کو تو تیرے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن معاملہ جلدی کا ہے۔ میں دوٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ یاد رکھنا میرا نام جاوا ہے، میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔'' جاوے کے عقب میں سلطان چیتا بھی نظر آیا۔ اس کے گلے اور ''زخمی کان'' پر پٹیاں بندھی تھیں۔ جاوے نے ایک گارڈ سے سیل فون لے کر میرے ہاتھ میں دیا پھر ایک دوسرے گارڈز کو اشارہ کیا۔ اس نے صرف چار پانچ فٹ کے فاصلے سے اپنی جدید رائفل کا رخ میرے سر کی طرف کر دیا۔

جاوا دوٹوک لہجے میں بولا۔'' اس کتے کو کال کرواور اسے صرف اتنا بتاؤ کہ تمہیں اس کی مدد کی فوری ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ اسے لاہور، شیخوپورہ روڈ کے تیسرے پل پر گورنمنٹ ہائی اسکول کے عین سامنے بلالو۔ یہ لو مکمل ایڈریس۔'' اس نے ایک پرچی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور آخر میں بولا۔'' میں صرف دس تک گنوں گا بچے۔ اس کے بعد میرے کہے بغیر ہی گولی چل جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر تم نے بات کے دوران میں کوئی غلط اشارہ دینے کی کوشش کی تو بھی گولی چل جائے گی۔''

○……❖……○

جاوے کی آواز میں ایک ایسا فیصلہ کن آہنگ تھا جس نے مجھے اندر سے ہلایا۔ نہ جانے اس وقت کیوں اچانک ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں آ گیا۔ کیا اب میں اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا؟ کیا محبت کے راستے میں صدیوں کا سفر رائیگاں گیا؟ کیا یہ اختتام ہے؟ مجھے عمران کو ہرگز نہیں بلانا تھا اور میرے دشمن کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ گولی چلانے سے ہرگز نہیں جھجکے گا۔ جاوا سفاک لہجے میں گنتی شروع کر چکا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا…… ایک…… دو…… تین…… چار……

وہ قیامت کے لمحے تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جاوا کی فیصلہ کن آواز کوٹھری میں گونج رہی تھی۔ پانچ…… چھ…… سات……

رائفل کا رخ میرے سر کی طرف اور رائفل بردار کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ میں نے جاوا…… کی دم بدم سرخ ہوتی آنکھوں میں جھانکا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ مجھے اس شخص کے حوالے سے رسک نہیں لینا چاہئے۔

جاوا…… کی گنتی ''نو'' پر پہنچی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو جاوا گرجا۔'' نہیں…… ایک لفظ نہیں…… نہ میں سنوں گا، نہ تم بولو گے۔ اگر کچھ کرنا ہے تو عمران کا نمبر ڈائل کرواور اسے میری بتائی ہوئی جگہ پر بلاؤ۔ اگر وہ تفصیل میں جائے تو تمہیں فوراً سے پہلے فون بند کرنا ہے۔''

میں نے سیل فون پر عمران کا نمبر پریس کیا۔ میرے اردگرد موجود کچھ چہروں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ عمران کے نمبر پر بیل گئی۔ دوسری بیل پر ہی کال اٹینڈ ہوگئی۔ عمران کی جاں بخش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"بچھڑ جائیں...... کم از کم دھڑکا تو ختم ہو جائے گا۔" وہ شوخی سے بولی۔

"ثروت کی بچی......" میں نے اس کی چٹیا پکڑنا چاہی، وہ ایک دم جھکائی دے کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی چھت پر چلی گئی۔ اس نے برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کرنا چاہا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا چھت پر آ گیا۔ بارش نے ہمیں سرتاپا بھگو دیا۔ میں نے ایک کونے میں اسے بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر بارش کے ساتھ ساتھ پیار کی بارش بھی ہونے لگی۔

"بس کریں۔" اس نے تیز سرگوشی کی۔

"اس طرح کیوں کہا؟"

"چلو کہہ دیا لیکن اتنی سزا کافی ہے۔" وہ بدستور شوخ تھی۔

"اچھا...... یہ سزا ہے؟" میں نے اسے کچھ اور بھی جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں...... پیار سے...... اب چھوڑیں...... چھوڑیں بھی...... امی آوازیں دے رہی ہیں۔"

امی واقعی پکار رہی تھیں۔ "یہ امیوں کو ایسے موقعوں پر پتا نہیں کیسے خبر ہو جاتی ہے۔" میں نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آنچل لپیٹتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

وہ دن رات ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور شوخیوں سے عبارت تھے......

میں چھت سے الٹا لٹکا رہا۔ میرے زخموں سے خون بہتا رہا اور میرے جسم میں موت کی سردی داخل ہوتی رہی۔ پھر میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک لق و دق صحرا ہے۔ سورج سوا نیزے پر ہے۔ گرم ریت پاؤں جھلسا رہی ہے۔ میرے گلے میں پیاس کے کانٹے اترے ہوئے ہیں۔ میں آبلہ پا ایک جگہ پہنچتا ہوں۔ یہاں چند گھنے چھتاور درختوں کے نیچے ثروت پُرسکون کھڑی ہے۔ اس کے حسین جسم پر جھلملاتا عروسی لباس ہے، اس کے ہونٹوں پر لالی اور آنکھوں میں کاجل ہے۔ میں چلاتا ہوں۔ "ثروت! یہ کیا ہے؟ تم نے تو کہا تھا...... میں دیوار کو توڑ دوں گی یا اس سے ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گی۔ تم نے کیوں نہ توڑی دیوار؟ تم نے یہ آگ کا لباس کیوں پہن لیا؟"

وہ بالکل خاموش کھڑی رہتی ہے۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں جیسے میرے وجود سے ہی بے خبر ہو۔ میں پھر پکارتا ہوں...... "ثروت! یہ لباس اتار دو...... اسے بدل ڈالو۔ یہ تمہارے لئے نہیں ہے۔ تم دلہن نہیں ہو۔ دلہن کوئی اور ہے۔ تم خود کو رسموں رواجوں کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔ توڑ ڈالو یہ جھوٹ کی زنجیریں۔ ہم اب بھی ایک ہو سکتے

ہیں۔ اب بھی گئے وقت کو آواز دے سکتے ہیں۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ کسی بت کی طرح بے حس کھڑی رہتی ہے۔ میری آواز کا دم خم ختم ہو جاتا ہے۔ بدن میں اترتی ہوئی موت کی نقاہت کچھ اور گہری ہونے لگتی ہے...... میں اندر سے سسک اٹھتا ہوں۔ ایک دم مسمار ہو جاتا ہوں۔ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہوں۔ عاجز لہجے میں کہتا ہوں...... "میں اب زیادہ دیر کا مہمان نہیں ہوں ثروت...... میں مر رہا ہوں۔ کیا تمہیں مجھ پر بالکل ترس نہیں آتا؟ میں جلتے صحرا میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے تم تک پہنچا ہوں۔ کیا تم اسی طرح بت بنی کھڑی رہو گی؟ رسموں رواجوں کے حصار میں بند رہو گی؟ میری طرف دیکھو گی بھی نہیں؟ پلیز ثروت...... پلیز میری طرف دیکھو...... مجھے یوں بے موت نہ مارو۔"

ثروت پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ لاتعلق کھڑی رہتی ہے۔ ایک طرف سے ایک بے چہرہ ہیولا برآمد ہوتا ہے۔ ایک نوجوان...... وہ ثروت کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لگاتا ہے اور پھر اسے لے کر درختوں کی ٹھنڈی تاریک چھاؤں میں اوجھل ہو جاتا ہے۔ میں اسے پکارتا رہتا ہوں مگر وہ مڑ کر نہیں دیکھتی۔ مایوسی اور صدمے کی بے پناہ شدت سے میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ میں اسی طرح تہ خانے کی چھت سے الٹا لٹک رہا ہوں۔ میرے جسم کا رہا سہا خون میرے سر اور سینے میں جمع ہو چکا تھا۔ میری ایک ٹانگ بالکل سن ہو چکی تھی اور دوسری...... نہایت تکلیف دہ زاویے سے بائیں طرف جھکی ہوئی تھی۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سہ پہر سے بعد کا وقت ہے۔ کہیں پاس ہی کوئی اپنے موبائل فون کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز واضح طور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا اور پہچان لیا۔ یہ سلطان چٹے کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "نہیں جاوا صاحب! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ فارم سے نکلے گا تو ہماری نظروں میں ضرور آئے گا۔ پوری پوری ناکا بندی ہے جی۔"

غالباً دوسری طرف سے پوچھا گیا کہ کیا اندر کی اطلاع نہیں مل سکتی؟

سلطان چٹا بولا۔ "جناب! اندر کی اطلاع تو ندیم ہی دے سکتا تھا اور اب وہ واپس فارم ہاؤس میں نہیں جا سکتا۔ لیکن آپ بے فکر رہیں۔ اس حرامی کے لئے الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ وہ باہر نکلا نہیں اور ہمارے ہتھے چڑھا نہیں......"

یہ گفتگو یقیناً عمران کے متعلق ہی ہو رہی تھی۔ میرے سینے میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ

اسے مارنے کا پکا پکا پروگرام بنا چکے تھے اور اس کے لئے پوری تیاری بھی ہو چکی تھی۔ میں نے فون پر اسے آگاہ کرنے کی اپنی سی کوشش تو کی تھی، پتا نہیں کہ یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی تھی۔

جاوا...... سے گفتگو ختم کرنے کے بعد سلطان کسی دوسرے بندے سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے یہ آواز بھی پہچان لی۔ یہ ندیم کی تھی۔ وہ بے پروائی سے باتیں کرنے لگے۔ ان کے نزدیک میں ابھی تک بے ہوش تھا۔ ندیم نے کہا۔ ''ایک طریقہ تو یہ بھی ہے کہ اس ماں کے ہیرو کو ''اس چھچھے تابی'' کی آہ و بکا سنائی جائے۔ وہ جب فون پر اسے چلاتا سنے گا تو اس کی دُم میں ضرور آگ لگے گی۔ اس سے کہا جائے گا کہ اگر وہ تابی کو اس عذاب سے نکالنا چاہتا ہے تو فلاں جگہ پر پہنچ جائے۔ ان دونوں کے درمیان بڑا پکا یارانہ ہے اور میرا تو خیال ہے کہ یہ یارانہ ضرور کام دکھائے گا۔''

چند سیکنڈ بعد ندیم کی آواز آئی۔ ''تو پھر دوسرا راستہ تو انتظار کا ہی ہے۔ ویسے مجھے اس کتے تابی پر غصہ بہت ہے۔ سویرے اس نے بڑی حرامزدگی کی ہے۔ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک دم وہ فقرہ بول دے گا۔ وہ فقرہ اگر اس ''ماں کے ہیرو'' نے پورا سن لیا ہے تو پھر اس نے جلدی اپنے بل سے باہر نہیں نکلنا۔''

سلطان نے مجھے غائبانہ...... گالی دی اور بولا۔ ''چلو اگر فقرہ بولا ہے تو اس کا مزہ بھی تو چکھا ہے نا خبیث نے۔ قصائی کی دُکان پر بکرے کی طرح لٹکا ہوا ہے۔''

''دیکھنا تھا کہیں پار ہی نہ ہو گیا ہو۔'' ندیم نے کہا۔

''نہیں، بڑا سخت جان ہے۔ بڑی موٹی کھال ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے ہیں تم نے؟ لگتا ہے لوہے کے ڈھلے ہوئے ہیں، پتا نہیں کیا کرتا رہا ہے ان کے ساتھ۔ اتنی درگت کسی اور کی بنی ہوتی تو اب تک مر کر بو چھوڑ گیا ہوتا۔''

''لیکن بو تو آ رہی ہے۔'' ندیم بولا۔

''وہ اس کے یار فتح محمد صاحب کی ہے۔''

میں نے غور کیا۔ بو واقعی میرے نتھنوں میں بھی گھس رہی تھی۔ ہلکی تھی لیکن محسوس ہو رہی تھی۔ میری پلکوں پر خون جما ہوا تھا۔ میں نے بمشکل پلکیں کھولیں اور نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ فرش پر میرا اپنا ہی خون لوتھڑوں کی شکل میں جما ہوا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر فتح محمد کی نیم عریاں لاش موجود تھی۔ گرمی کے سبب لاش نے خراب ہونا شروع کر دیا تھا۔ توند پہلے سے بڑی نظر آ رہی تھی اور چہرے پر بھی سوجن محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد چار پانچ افراد کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سلطان اور ندیم بھی شامل تھے۔ میری ٹانگ سے بندھی ہوئی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیل دی گئی ہے۔ پہلے میرا سر خون آلود فرش سے لگا پھر کندھے، پھر باقی جسم بھی فرش پر ڈھے گیا۔ کسی نے کہا۔ ''ہوش میں ہے، مکر کر رہا ہے۔''

کسی نے میرے کندھے پر ٹھوکر رسید کی۔ ایک گارڈ نے قریب آ کر میرے چہرے پر پانی کا چھینٹا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن پلکوں پر میرا اپنا ہی خون جما ہوا تھا۔ میں بس آنکھوں کو نیم وا ہی کر سکا۔ مجھے اپنے اردگرد دھندلے چہرے نظر آئے۔ کم از کم دو رائفلیں اب بھی میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میرے زخمی ہونٹ خشک تھے اور زبان چمڑے کا سوکھا ٹکڑا بنی ہوئی تھی۔ مجھے چند گھونٹ پانی پلایا گیا تاکہ میں بولنے کے قابل ہو سکوں۔

میں نے اپنے جسم کو محسوس کیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو تولا۔ کیا میں اچانک جھپٹ کر کسی گارڈ کے ہاتھ سے رائفل چھین سکتا ہوں؟ اس کا جواب میری زخمی ٹانگ نے انکار کی صورت میں دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹانگ بالکل سن ہے۔ یہ میرے جسم کا بوجھ نہیں سہار سکتی اور بالفرض محال ایسا ہو بھی جاتا تو میرا باقی جسم بھی زخموں سے چُور تھا اور میرے پاؤں میں آہنی زنجیر تھی۔ میں اپنی مزاحمت کو کہاں تک لے جا سکتا تھا۔

سلطان نے بڑی بے رحمی سے میری گردن پر پاؤں رکھا اور دباؤ بڑھانے لگا۔ میری سانس رکنے لگی۔ وہ پھنکارا۔ ''تم دونوں اس موٹے سؤر ریان ولیم کے لئے کام کر رہے ہو۔ تم دونوں کے علاوہ اس نے اور کتنے کتے پالے ہوئے ہیں، ان کے نام بتاؤ۔ اور ''حرام گوشت'' کا وہ پہاڑ خود کہاں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے؟''

مجھ سے جواب حاصل کرنے کے لئے اس نے میری گردن پر سے پاؤں کا دباؤ کچھ کم کیا...... میری سانس کی آمد و رفت بہتر ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ میں نے بھی اپنی خاموشی دہرا دی۔ اس نے گردن پر اپنے پاؤں کا سفاک دباؤ پھر بڑھا دیا۔

''ریان ولیم کا ٹھکانا بتاؤ۔ ورنہ ابھی دو منٹ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

میری سانس بند ہونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے چہرے دھندلاتے چلے گئے۔ سلطان کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں...... سے آ رہی تھی۔ ''ہمیں پتا ہے وہ سؤر لاہور میں ہے...... لیکن کہاں ہے؟ اس کا فون نمبر کیا ہے؟ کیسے رابطہ کرتا ہے تم سے؟ بتاؤ...... بتاؤ۔''

جب میری سانس بالکل بند ہو گئی تو میں نے اپنے زخمی ہاتھوں سے سلطان کی پنڈلی دبوچی اور زور لگا کر اس کا منحوس پاؤں اپنی گردن سے ہٹا دیا۔ وہ لڑکھڑایا لیکن گرنے سے بچ

گیا۔ اس کے ساتھیوں نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سلطان خود بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو گیا۔

وہ وقفوں وقفوں سے مجھے مارتے رہے اور سوالات کرتے رہے۔ وہ عمران کے حوالے سے بھی معلومات چاہ رہے تھے لیکن میں نے اپنے ہونٹوں پر برداشت کا قفل لگا لیا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد انہوں نے میری زنجیر کھینچی اور مجھے پھر سے الٹا لٹکا دیا۔ تاہم اس بار ایک اور غیر معمولی ستم ظریفی بھی کی گئی۔ فتح محمد کی ایک ٹانگ کو بھی زنجیر کیا گیا اور اسے بھی میرے ساتھ الٹا لٹکایا گیا۔ یہ ایک لاش کی سفاکانہ بے حرمتی تھی فتح کی لاش سے اٹھنے والی بو تیز ہوتی جا رہی تھی اور وہ مجھ سے صرف تین چار انچ کے فاصلے پر جھول رہی تھی۔ پھر میری اذیت میں اضافہ کرنے کے لئے پلاسٹک ٹیپ کا ایک بڑا رول لایا گیا اور اس کی لاش کو ٹیپ کے ذریعے میرے ساتھ پیوست کر دیا گیا۔ ٹیپ کو کئی بل اس طرح دیئے گئے کہ فتح کی لاش سر تا پا مجھ سے پیوست ہو گئی۔

یہ بے پناہ اذیت کی گھڑیاں تھیں۔ وہ حد بھی شاید گزرنے والی تھی جو اذیت اور صدمے کو میرے لئے پُر لطف بناتی تھی۔ میں مسلسل کراہ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ دل چاہتا تھا کہ بس جلدی سے بے ہوش ہو جاؤں...... یا پھر ویسے ہی قیدِ حیات سے آزادی نصیب ہو جائے۔

لاش کا پھولا ہوا زخمی چہرہ میرے چہرے سے جڑا ہوا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ ناقابل بیان بو کا بھبکا میرے نتھنوں میں داخل ہوتا تھا اور رگ و پے میں کراہت کا دریا بہنے لگتا تھا۔ یہ کراہت میری جسمانی اذیت کو کئی گناہ بڑھا رہی تھی۔ میں نے ابکائیاں لیں مگر معدے میں کچھ ہوتا تو باہر نکلتا۔ ہاں ہر ابکائی کے ساتھ جسم میں ارتعاش پیدا ہوا اور درد کی لہریں بلند تر ہو گئیں۔ درد...... درد...... اور بس درد......!

......اور پھر اچانک درد کا عاشق برونڈا جیکی بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا آیا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہی ادھورے جسم والا ہڈیوں کا ڈھانچا جس کو درد سے لڑنا اور جیتنا آ گیا تھا۔ وہ مسکرایا اور اس کی تصوراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''کیا بات ہے؟ کہیں درد کے حوالے سے تمہارا یقین ڈانواں ڈول تو نہیں ہو رہا۔ یاد رکھو، درد بے وجہ نہیں ہوتا اور نہ بے صلہ ہوتا ہے۔ یا ہم اس کا صلہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں، یا ہمیں صلہ حاصل ہونے والا ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ دکھ درد اتنا زیادہ صلہ...... تو پھر دکھ درد سے ڈرنا کیسا...... یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اس میں گھاٹا ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کا شکر کرو اس نے تمہاری زندگی کو روکھا پھیکا اور

بے عمل نہیں رکھا۔ یہ گہری تاریکیاں، صبحِ نو کی نوید ہوتی ہیں۔''

''مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔'' میں نے دل ہی دل میں پکارا۔

''تم اپنی تربیت کا پہلا سبق ہی بھول رہے ہو۔ درد کے اندر ڈوب جاؤ۔ اس کی حقیقت اور اس کے حجم پر غور کرو اور گرد کی کسی چیز کو خاطر میں نہ لاؤ۔ مت سوچو کہ تمہارا جسم زخموں سے چُور ہے۔ مت سوچو زخم کھل رہے ہیں، خون بہہ رہا ہے۔ مت سوچو کہ تم الٹے لٹکے ہوئے ہو۔ بس یہ دیکھو درد کتنا ہو رہا ہے...... بس درد پر غور کرو۔''

میں نے درد کی اصل شدت پر غور کرنا شروع کیا اور حیرت انگیز طور پر درد کم ہونے لگا۔ کم ہوتا چلا گیا۔

وہ جادو اثر باتیں کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ چکا تھا لیکن کڑے وقتوں میں وہ میرے آس پاس آن موجود ہوتا تھا۔ اس کا تصور اتنی طاقت سے میری نگاہوں کے سامنے ابھرتا تھا کہ زندگی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے مجھے شاباشی کی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''میں جا چکا ہوں لیکن تم میری نشانی کے طور پر یہاں موجود ہو۔ تم میرا تسلسل ہو، میری اضافت ہو۔ مجھے تم سے بڑی امیدیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ کرو جو میں نہ کر سکا...... تم درد کو پسپا کرتے ہوئے آخری حدوں تک لے جاؤ...... قابل تسخیر بنا جاؤ۔ اور تمہاری کارکردگی بری نہیں ہے۔ تم نے میرا سینہ ٹھنڈا کیا ہے۔ تم نے بھانڈیل میں اس شخص کو جہنم واصل کیا ہے جس نے میری شکنتلا چھینی اور میری زندگی برباد کی۔ ہاں تابش! مجھے تم پر فخر ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آنے والی ہر گھڑی میں میرے اس فخر میں اضافہ ہو۔''

اس کا ہیولا اوجھل ہو گیا لیکن میرے اندر ہمت اور برداشت کی ایک نئی جوت جگا گیا۔

میں ششدر تھا۔ میرا درد نمایاں حد تک کم ہو چکا تھا۔ اب صرف کراہت تھی اور یہ کراہت اس بو سے پیدا ہو رہی تھی جو فتح کے مردہ جسم سے اٹھ رہی تھی اور اس بند کوٹھری میں پھیلتی...... جا رہی تھی۔

پتا نہیں...... کتنی دیر اس عالم کراہت اور اذیت میں گزر گئی۔ تکلیف کی گھڑیاں ویسے بھی طویل ہوتی ہیں۔ فتح ایک جیتا جاگتا شخص تھا تو میں اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب وہ ایک لاش تھا اور اس لاش کی جبری قربت میرے لئے شدید ذہنی اذیت کا باعث بن رہی تھی۔ شاید یہ لوگ اس طرح مجھے ذہنی طور پر مفلوج و بے بس کرنا چاہ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو میری زبان کھلوانے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

میرا دھیان رہ رہ کر عمران کی طرف جاتا تھا۔ مجھے پتا تھا...... اگر وہ جان گیا کہ میں کہاں ہوں تو پھر اسے مجھ تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ وہ ہر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر میری طرف آئے گا اور ایک بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ شاید بہت سے لوگوں کی جان چلی جائے اس ہنگامے میں۔ ہمیشہ یہی سنا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس روز انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی کے بند بودار تہ خانے میں چھت سے الٹا لٹکے ہوئے مجھ پر اس محاورے کی ازلی صداقت ثابت ہوئی۔ بے پناہ ذہنی اور جسمانی تناؤ کے باوجود مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میرے احساسات کند ہوتے چلے گئے اور میں اپنے اردگرد سے بیگانہ ہونے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ رات دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ تہ خانے سے باہر کہیں کوٹھی کے احاطے سے رکھوالی کے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی کمرے میں ڈسکو میوزک بج رہا تھا اور تہ خانے کے اندر ٹیوب لائٹ کی پھیکی روشنی پھیلی ہوئی تھی...... اچانک میری نظر اس تہ خانے کے تیسرے مکین پر پڑی۔ یہ وہی نشئی تھا جسے میں نے صرف سوتے ہی دیکھا تھا۔ وہ اب بھی فرش پر دراز تھا۔ اگر سویا ہوا نہیں تھا تو کم از کم غنودگی میں ضرور تھا۔ اس کے جسم پر پھٹی پرانی پتلون اور چیک دار شرٹ تھی۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔

یہ کون تھا؟ اور کس پاداش میں یہاں پایا جا رہا تھا؟ کیا میرے اور عمران کی طرح اس کا تعلق بھی کسی طور ریان ولیم سے تھا...... یا پھر یہ کوئی اور معاملہ تھا؟ میرے پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے دماغ میں کئی سوال سر اٹھانے لگے۔

قریباً 30 گھنٹے سے میرے معدے میں کچھ نہیں گیا تھا...... اس کے علاوہ خون بھی کافی مقدار میں نکل چکا تھا۔ ایک عجیب سی نقاہت رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ پر بار بار غنودگی سی طاری ہوتی...... اور میں اردگرد سے بالکل بے خبر ہو جاتا تھا۔ مجھے یاد آیا، میں نے آخری کھانا کل دوپہر عمران کے ساتھ فارم ہاؤس میں ہی کھایا تھا اور دوپہر کا کھانا پورے بارہ بجے کھا لیا جاتا تھا۔ چار بجے کی چائے میں نے نہیں پی تھی۔ اس حساب سے یقیناً کم و بیش تیس گھنٹے گزر چکے تھے۔

غنودگی کے ایک ایسے ہی وقفے کے بعد میں اپنے حواس میں آیا تو میں نے محسوس کیا کہ ایک بار پھر میرے پاؤں کی زنجیر کو ڈھیل دی جا رہی ہے اور میں فتح کی بدبودار لاش سمیت آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہوں۔ میں نے سر گھما کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ مجھے یوں آہستہ

آہستہ نیچے اتارنے والا کوئی اور نہیں، وہی بوسیدہ پینٹ شرٹ والا شخص تھا جسے میں نے اب تک سوتے ہوئے ہی پایا تھا۔ اس بے ڈھنگے شخص کے بارے میں، میں نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔ کسی نشے کے زیر اثر اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ میلا کچیلا چہرہ ورم زدہ سا تھا۔ ویسے اس کے نقوش تیکھے تھے۔ اپنی دبلی پتلی جسمانی ساخت کی وجہ سے وہ اٹھائیس تیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔

ہم فرش سے لگ گئے تو اس شخص نے میری اور فتح محمد کی زنجیریں چھوڑ دیں۔ تب اس نے جلدی جلدی وہ طویل ٹیپ میرے جسم سے علیحدہ کیا جس نے مجھے فتح کی لاش سے پیوست کر رکھا تھا۔ مجھے خوفناک بو کی سزا دینے کے لئے جاوا کے کارندوں نے وہ سلاخ دار کھڑکی بھی بند کر رکھی تھی جس میں سے تہ خانے کا دوسرا پورشن دکھائی دیتا تھا۔ غالباً اسی بند کھڑکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شخص نے مجھے نیچے اتارا تھا اور فتح کی لاش سے علیحدہ کیا تھا۔

بے شک بو بڑی شدید تھی۔ وہ معدے میں گھس گئی تھی اور پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ مجھے نیچے اتارنے والے شخص کا چہرہ بھی بو کی وجہ سے مکدر تھا۔ وہ گاہے بگاہے اپنی شرٹ کے کالر سے اپنی ناک ڈھانپنے کی کوشش کرتا تھا۔ لاش کی حالت بھی اب کافی خراب نظر آتی تھی۔ وہ پھول رہی تھی۔ ورم زدہ پپوٹوں کے نیچے سے سرخی مائل مادہ رِس رہا تھا۔ مجھے لاش کے ساتھ پیوست کر دینے والی سزا واقعی بہت کڑی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں چند گھنٹے مزید اس حالت میں رہتا تو میرا دماغ مختل ہو جاتا اور ہمت جواب دے جاتی۔

شرٹ والے شخص نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔ ''یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟''

''کس طرح؟'' میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''تم...... بڑے چنگے وقت پر یہاں آئے ہو۔ میں یہاں سے نکلنے کا پروگرام تقریباً فٹ کر چکا ہوں اور آج موقع بھی زبردست ہے۔ آج اوپر کوئی شراب پارٹی ہے۔ دو تین فلمی ''ڈانسریں'' بھی آئی ہوئی ہیں۔ ڈھول ڈھمکے کی ہلکی سی آواز آ رہی ہے نا تمہیں بھی؟''

وہ ڈسکو میوزک کی بات کر رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''ان لوگوں نے تمہیں زندہ تو کسی صورت میں نہیں چھوڑنا۔ میں نے ان کی ساری گل بات سنی ہے۔ اگر جان بچانے کی ایک کوشش کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ مل کر لو۔''

"پر کیسے؟" میں نے اپنی مفلوج ٹانگ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹخنے پر ابھی تک زنجیر کا حلقہ موجود تھا اور اس حلقے نے ٹخنے کو بری طرح زخمی کیا ہوا تھا۔

"میں نے کہا ہے نا کہ تم بڑے چنگے ویلے پر آئے ہو۔ پچھلے ایک مہینے سے میں جو محنت کر رہا تھا، اس کا پھل اب بالکل تیار ہے۔ شاید میں ایک ڈیڑھ ہفتے اور صبر کر لیتا، پر ان کنجروں نے اس لاش کی بو سے ہمارے ساہ (سانس) روک دیئے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنا ہی ہو گا۔"

"تم کس محنت کی بات کر رہے ہو؟"

"میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ تم ذرا اپنی اس ٹانگ کو چالو کر لو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بالکل سن ہو چکی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر ٹانگ پر وزن ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے سہارنے سے بالکل انکار کر دیا۔

وہ شخص میری ٹانگ کو ہلانے جلانے لگا۔ میں نے بھی کوشش کر کے ٹانگ کو تھوڑی بہت حرکت دی۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد ٹانگ پر کسی حد تک بوجھ پڑنے لگا۔ جسم کے سارے جوڑ جیسے اکڑ کر رہ گئے تھے۔ کئی زخموں سے اب بھی خون رس رہا تھا، فرش پر گرنے والا خون اب سوکھ کر سیاہ ہو چکا تھا۔

"تم ہمت والے ہو۔" اس نے میری طرف دیکھ کر ستائشی انداز میں کہا۔ "اور اس کے ساتھ ساتھ سخت جان بھی ہو۔ جتنی "کٹ" تمہیں پڑی ہے، کسی اور کو پڑی ہوتی تو اب تک اوپر کا ٹکٹ کٹا چکا ہوتا۔ کہیں تم کوئی کھلاڑی شلاڑی تو نہیں رہے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ جوڈو کراٹے یا باکسنگ شاکسنگ......"

"یہ تم کیوں کہہ رہے ہو؟"

"تمہاری سخت ہڈی دیکھ کر۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ اس کی نگاہیں میرے سیاہی مائل ہاتھ پاؤں پر تھیں۔

"تمہارا اندازہ کسی حد تک درست ہے۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔ "لیکن تم نے مجھے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

"نام میں کیا رکھا ہے، اصل شے تو کام ہوتی ہے۔ ویسے اگر تم چاہو تو مجھے گوہر کے نام سے بلا سکتے ہو۔"

"میرا نام تابش ہے۔ تابی بھی کہتے ہیں۔"

"مجھے پتا ہے۔ وہ کمینے کے تخم تمہیں اسی نام سے بلاتے رہے ہیں۔"

"لیکن تم تو سارا وقت سوئے پڑے رہتے تھے؟"

"کبھی کبھی ایک آنکھ سے سوتا تھا، دوسری کھلی رکھتا تھا۔" وہ عیارانہ انداز میں بولا۔

"یہ نہیں بتاؤ کے کہ ان کتوں کے چنگل میں کیسے پھنسے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ لمبی اسٹوری ہو جائے گی اور ابھی ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔"

باہر سے آنے والی ڈسکو اور پاپ میوزک کی مدھم آواز ایک دم کچھ تیز ہو گئی۔ شاید چند سیکنڈ کے لئے کوئی بند دروازہ کھلا تھا۔ اس میوزک کے ساتھ تیز شوخ نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ ویسی ہی سریلی آوازیں تھیں جو تیز ٹیمپو کے ڈانس کے دوران میں نکالی جاتی ہیں۔ اوپر کہیں ڈانس پارٹی اور شراب پارٹی عروج پر تھی۔ یقیناً ایشوریا رائے ثانی اور کرشمہ کپور ثانی جیسی لڑکیاں بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔

ایک طرف زندگی کی خوشبودار رنگینی تھی اور دوسری طرف بدبودار بے ثباتی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی فتح کی لاش کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ گوہر...... یا جو بھی اس کا نام تھا، اب میرے پاؤں کے کڑے کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے کڑے کو پکڑ کر تھوڑا سا زور لگایا تو وہ کھل گیا۔ اس میں کوئی لاک وغیرہ نہیں تھا۔ وزنی زنجیر میرے پاؤں سے علیحدہ ہوئی تو ٹانگ کو حرکت دینے میں آسانی ہو گئی لیکن وہ اب بھی صرف تیس چالیس فیصد ہی کام کر پا رہی تھی۔ میں نے اس گوہر نامی شخص کے کندھے کا سہارا لے کر تہ خانے میں دس پندرہ قدم اٹھائے۔ درد کی ٹیسوں نے پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ اس درد کی پروا کئے بغیر میں گوہر کے ساتھ تہ خانے کے شمالی حصے کی طرف گیا۔ یہ جگہ انگریزی کے حرف "L" جیسی تھی۔ یہاں مجھے لکڑی کی ایک چھ سات فٹ اونچی الماری نظر آئی۔ تہ خانے کے اس حصے میں نیم تاریکی سی تھی۔ ایک چوتھائی حصہ تو تقریباً تاریک تھا۔ گوہر نامی اس جواں سال شخص نے بڑی احتیاط سے الماری کو اس کی جگہ سے ہلایا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ میں چونکا۔ الماری کے عقب میں قریباً دو مربع فٹ جگہ سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا اور اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔

"کچھ نظر آیا؟" گوہر نے اینٹوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی ذرا دھیان سے دیکھا تو صورتِ حال واضح ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس پختہ دیوار میں کم از کم تین اینٹیں ایسی تھیں جن کی درزوں میں سیمنٹ موجود نہیں تھا۔ کوئی نوکدار دھاتی چیز استعمال کی گئی تھی اور افقی رخ پر لگی ہوئی ان اینٹوں کی درزوں کو مسلسل کھرچ کھرچ کر ان کے اندر سے سیمنٹ نکال دیا گیا تھا۔

"زبردست۔" میں نے ستائشی انداز میں گوہر کی طرف دیکھا۔"لیکن...... دوسری طرف کیا ہے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ گڈیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ مطلب کہ تہ خانے کی پارکنگ شارکنگ۔ پر میں نے ابھی دیکھا کچھ نہیں۔"

اس نے الماری کے ایک تاریک خانے میں ہاتھ ڈالا اور کچھ دیر تک ٹٹولنے کے بعد اندر سے ایک چھوٹا لیکن مضبوط پیچ کس نکال لیا۔ سیمنٹ کھرچنے والا صبر آزما کام اس نے یقیناً اسی پیچ کس سے کیا تھا۔ اس نے پیچ کس کو ایک اینٹ کی درز میں داخل کیا۔ وہ قریباً چار انچ تک اندر داخل ہو گیا۔ گوہر نے مجھے پیچ کس دکھاتے ہوئے کہا۔"یہ دیکھو، یہ اتنا اندر گیا ہے اور اتنی ہی اینٹ کی چوڑائی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب دوسری طرف بس دیوار کا پلستر ہی ہے۔ یہ پلستر میں نے جان بوجھ کے رہنے دیا ہے۔ اب ہم ذرا سی کوشش کریں تو یہ اینٹیں، باہر کی طرف یا اندر کی طرف نکل سکتی ہیں۔"

گوہر نامی یہ بندہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ یہاں سے نکلنے کے لئے ننانوے فیصد کام مکمل کر چکا تھا لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا یہاں سے نکل کر ہم واقعی کوٹھی سے بھی نکل سکیں گے؟ وہ کہہ رہا تھا کہ دوسری طرف کوٹھی کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ ہے اور وہ دیوار سے کان لگا کر گاڑیوں کی آوازیں سنتا رہا ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر یقیناً ہم یہاں سے نکل کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ تک پہنچ جاتے۔

میں نے کہا۔"تمہارا کیا خیال ہے گوہر! یہاں سے نکل کر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"ہم بس تھوڑا سا چل کر کوٹھی کے باہر والے گیٹ تک پہنچ جائیں گے...... اس طرف بس ایک چوکیدار ہوتا ہے۔ کبھی اس کے پاس رائفل ہوتی ہے، کبھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے سنبھالنے میں ہمیں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔ اس کے بعد اگر قسمت نے کوئی خرابی نہ دکھائی تو ہم چالیس فٹ کی روڈ پر پہنچ جائیں گے۔ ہم سامنے کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کی پچھلی طرف نکلیں گے اور کھیتوں میں گھس جائیں گے۔"

میں نے کہا۔"قسمت کی خرابی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا کوئی اور خطرہ بھی تمہارے ذہن میں ہے؟"

اس نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔"خطرے تو ایسے کاموں میں ہوتے ہی ہیں، اگر تمہارے دل میں ڈر ہے تو پھر رہنے دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نکلنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ اگر کہتے ہو تو تمہیں واپس اسی طرح لٹکا دیتا ہوں...... ویسے ایک بات میں تمہیں بتا

دوں۔ ان لوگوں نے تمہیں بڑی بری طرح مارنا ہے۔ ایسی موت مرنے سے کہیں چنگا ہے کہ بندہ کچھ ہاتھ پاؤں چلا کر مرے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن......" میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

وہ مجھے گھور کر بولا۔"تم نے جتنی ہمت سے ان لوگوں کی مار کھائی ہے، مجھے لگا تھا کہ تم دل گردے والے بندے ہو لیکن اب لگا ہے کہ شاید......"

"ایسی بات نہیں ہے گوہر! میں تمہاری توقع سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں لیکن ہمیں ہر چیز کو سامنے رکھنا چاہئے۔ تم...... میری ٹانگ کی حالت دیکھ رہے ہو، یہ میرا بوجھ نہیں سہار رہی۔ اگر بھاگ دوڑ کی نوبت آئی تو شاید میں...... بھرپور طریقے سے تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔"تو پھر پانچ چھ دن انتظار کر لیتے ہیں...... تاکہ تمہاری ٹانگ فٹ فاٹ ہو جائے۔ پھر تم زندہ ہوئے اور میں بھی ہوا تو ایک اور کوشش کر لیں گے۔"

اس کا طنز سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہاں بدترین صورتِ حال میری منتظر تھی۔ اس سے بہتر تھا کہ یہاں سے نکل کر باہر کے حالات کا سامنا کر لیا جاتا۔ اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ہمیں کسی سنگین مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔"ٹھیک ہے گوہر! میں تمہارے ساتھ نکلوں گا لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیا؟" وہ کڑے لہجے میں بولا۔

"اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو تم مجھے اپنے ساتھ نہیں گھسیٹو گے۔ اپنی جان بچاؤ گے......"

وہ گہری سانس لے کر بولا۔"اچھا، چلو دیکھ لیں گے...... لیکن...... اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے، یہ شراب پارٹی ختم ہونے سے پہلے پہلے کرنا ہے۔"

ہم مصروف ہو گئے۔ اسکریو ڈرائیور کے ساتھ باہر کا پلاستر توڑنے اور پہلی اینٹ نکالنے میں تقریباً آدھ گھنٹا لگ گیا۔ یہ اینٹ ہم اندر کی طرف کھینچنے میں کامیاب رہے تھے۔ باہر سے ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی تہ خانے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی بے ہنگم موسیقی کا شور بھی کچھ واضح ہو گیا۔ یہ ڈرمنگ میوزک تھا۔ ساتھ میں بدمست آوازیں بھی سنائی دیتے تھے۔

صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ گوہر کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا تھا کہ دوسری طرف انڈر

گراؤنڈ پارکنگ ہے۔ ہمیں چودہ پندرہ کے قریب، قیمتی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ محفل کے شرکا کی گاڑیاں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ کچھ گاڑیاں اوپر لان اور پورچ میں بھی ہوں۔ گاڑیوں کے آس پاس ہمیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ ہم نے باقی اینٹیں دس پندرہ منٹ کے اندر نکال لیں۔ ان اینٹوں کو ضرب لگانے کے لئے سب سے پہلے نکالی گئی اینٹ استعمال کی گئی۔ اب اتنا رستہ بن گیا تھا کہ ہم اس میں سے رینگ کر اس زمین دوز عقوبت خانے ہمیں سے باہر نکل سکیں۔ ہتھیار کے نام پر ہمارے پاس صرف وہی پیچ کس تھا جو اب تک گوہر کے استعمال میں رہا تھا۔ دستے سمیت اس کی لمبائی آٹھ انچ سے زیادہ نہیں تھی تاہم اس کا سرا مسلسل استعمال سے بہت نکیلا ہو چکا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ضرورت پڑنے پر گوہر اسے چاقو کی طرح کامیابی سے استعمال کرے گا۔ میرے اب تک کے اندازے کے مطابق گوہر ایک نڈر اور اسلحہ شناس شخص تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہر طرح کی مار دھاڑ بھی کر سکتا تھا۔ بے شک اس کے کپڑوں اور جسم سے چرس کی تیز بو آتی تھی، اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی...... اور حرکات و سکنات سے کسی طرح کی سُستی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

ہم بڑی احتیاط کے ساتھ عقوبت خانے سے باہر نکل آئے۔ میرے زخموں سے تازہ خون رِسنے لگا۔ میں بری طرح لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ یہ قریباً 70 ضرب 100 فٹ کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ تھی...... پیچ کس گوہر کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ ہم گاڑیوں کے درمیان بڑی احتیاط سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ گوہر مجھ سے دو تین قدم آگے تھا۔ اس کی چال ڈھال میں شکاری جانور کی سی چوکسی تھی۔ ہم پارکنگ کی بیرونی ڈھلوان کی طرف بڑھ رہے تھے اور گوہر کی معلومات کے مطابق یہیں ہمارا واسطہ کم از کم ایک گارڈ سے پڑنے والا تھا۔

اچانک گوہر ٹھٹک کر رک گیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''کباڑا...... خبیوں نے پارکنگ کا دروازہ بند کیا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ باہر سے تالا لگا ہوا ہوگا۔''

''تو پھر؟''

''بس یہی قسمت کی خرابی ہوتی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

ہم محتاط قدموں سے اس آہنی پھاٹک نما دروازے تک پہنچے۔ کان لگا کر باہر سے سن گن لینے کی کوشش کی۔ کوئی آواز نہیں آئی۔ گوہر نے تپے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے کہ یہ بھوتنی دا بھی رنگ بازی کے لئے اوپر چلا گیا ہے۔''

اس نے پھاٹک نما دروازے کو ایک دو بار ہلا جلا کر دیکھا۔ تب دو تین بار مدھم دستک بھی دی۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہم اس آہنی پھاٹک کو توڑ کر یا کھول کر باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک طرف یہ تھا کہ یہیں کہیں تاریکی میں چھپ کر دروازے کے کھلنے کا انتظار کیا جائے یا پھر کوٹھی سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ڈھونڈا جائے۔ یہاں رک کر انتظار کرنے میں اس امر کا شدید اندیشہ موجود تھا کہ عقوبت خانے میں ہماری غیر موجودگی کا پتا چل جاتا اور پوری کوٹھی میں خطرے کی گھنٹیاں بج جاتیں۔ اور یہ بھی امکان تھا کہ یہ دروازہ ساری رات ہی نہ کھلتا...... اور جب کھلتا تو گاڑیاں نکالنے کے لئے کئی افراد دروازے کے سامنے موجود ہوتے۔

''آؤ میرے پیچھے۔'' گوہر نے سرگوشی کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ بائیں طرف بڑھا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے حدود اربع سے بخوبی واقف ہے اور شاید کچھ عرصہ یہاں آزاد حیثیت سے بھی گزار چکا ہے۔ یہ میری غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جو ٹانگ کی شدید تکلیف کے باوجود مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ میں بری طرح لنگڑا رہا تھا۔ کسی وقت مجھے ایک ہاتھ سے گاڑیوں کا سہارا لینا پڑتا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر جدوجہد کا موقع آیا تو میں اس حالت میں کس حد تک گوہر کا ساتھ دے سکوں گا۔

چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے دروازے تک آ گئے۔ گوہر نے اس آہنی دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر نیلی وردی والا ایک گارڈ نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں وہسکی کی کوارٹر بوتل اور دوسرے میں سگریٹ تھا۔ غیر متوقع طور پر اس شخص نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم اس کے پاس سے گزر کر ایک کوریڈور میں داخل ہو گئے۔ شیشے کی ایک بڑی کھڑکی کی دوسری جانب جھلملاتی روشنیوں میں لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی محورقص نظر آئی۔ رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے لیکن یہاں بالکل آزاد شاعری ہو رہی تھی۔ یہ رقص سے زیادہ ایک واہیات تماشا تھا۔ نشے میں مخمور مرد و زن ایک دوسرے کو بڑے بھونڈے طریقے سے ''دریافت'' کر رہے تھے۔ میری نگاہ سیکرٹری ندیم پر پڑی۔ وہ ایشوریا ثانی کے ساتھ پیوست تھا اور ہر حد سے گزرا ہوا نظر آتا تھا۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایشوریا کی ہم شکل لڑکی کو بازوؤں میں اٹھایا اور اسے لے کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

یہاں مجھے ایک اور ایسی لڑکی بھی محوِ رقص دکھائی دی جس کی شکل کسی اورانڈین ایکٹریس سے ملتی تھی۔ مجھے فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ یہ کس سے مل رہی ہے۔ تب اچانک میری نگاہ دُرِشہوار پر پڑی۔ یہ وہی درمیانی عمر کی ماڈرن عورت تھی جو کچھ دن پہلے رنگین چڑیوں کا تحفہ لے کر جلالی صاحب کو رجھانے آئی تھی مگر جلالی صاحب کا پارا اچانک چڑھ جانے کی وجہ سے اسے اپنے ساتھی سمیت دُم دبا کر بھاگنا پڑا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ دُرِشہوار جاوا کی سابقہ رکھیل رہی ہے۔ اس وقت وہ نشے میں ٹن تھی اور ایک درمیانی عمر کے گنجے کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

میں اور گوہر کھڑکی کے سامنے سے گزر کر ایک برآمدے کی طرف آ گئے۔ یہاں بھی دو گارڈز بڑے ایزی موڈ میں فرش پر بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی رائفل سامنے ستون سے ٹکی نظر آ رہی تھی۔ مجھے گوہر نامی اس شخص کی پھرتی اور دیدہ دلیری کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ بلی کی چال چلتا گیا اور گارڈز سے فقط آٹھ دس فٹ کی دوری پر پہنچ کر رائفل اٹھائی اور واپس پلٹ آیا۔

''آ جاؤ شہزادے۔'' اس نے سہارے کے لئے مجھے اپنا کندھا پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے کندھے کا سہارا لیا۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گراسی لان کی طرف بڑھے۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''یہاں روشنی ہے لیکن اگر ہم کسی طرح یہ جگہ پار کر گئے تو سیدھے گیٹ پر پہنچیں گے۔''

''گیٹ پر بندے نہیں ہوں گے؟'' میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں گے تو ضرور...... پر ہوسکتا ہے کہ آج انہوں نے بھی کڑوا پانی پیا ہوا ہو...... ایسے جشن میلے میں ہر کسی کی مت ماری جاتی ہے۔ ویسے بھی اب ہمارے پاس یہ دوسو بائیس کی رائفل آ گئی ہے۔ کچھ نہ کچھ فائدہ تو اس کا بھی ہوگا۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ گوہر خطرے میں حواس برقرار رکھنے والا شخص ہے۔ وہ یہاں سے نکلنے کے حوالے سے کافی پُرامید نظر آ رہا تھا۔ ہم دیوار کے سائے سائے چلتے ہوئے مین گیٹ کے قریب تر ہو گئے۔ اچانک میرے رگ و پے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی...... مجھے رکھوالی کے کتوں کی آواز آئی۔ ایک سرد لہر دوڑ گئی...... اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ وہ بھگٹٹ بھاگے آ رہے ہیں۔ بمشکل دو سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ ایک جسیم کتے نے گوہر پر جست لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا پھولدار پودوں میں گرا۔ زوردار دھماکے سے رائفل نے شعلہ اگلا اور میں نے کتے کی چلاتی ہوئی آواز سنی۔ غیر متوقع طور پر گولی کی زوردار آواز نے دوسرے کتے کو

پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اب کچھ فاصلے پر بے تاب گردش کرنے لگا اور اپنی پُرہول آواز میں مالکوں خبردار کرنے لگا۔ کتے کا یہ انداز روٹین سے ہٹ کر تھا۔

دو تین افراد دوڑتے ہوئے ہماری طرف لپکے...... لیکن جب گوہر نے اوپر تلے تین چار فائر کئے تو وہ ٹھٹک گئے۔ انہوں نے مختلف چیزوں کی آڑ لے لی اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں سے پوری کوٹھی گونج اٹھی۔ موسیقی تھم گئی۔ ہر طرف ہلچل کے آثار نظر آئے۔ ہم دونوں ایک بڑے سنگی فوارے کی اوٹ میں تھے۔

''آؤ۔'' گوہر نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

''نہیں گوہر! میں نکل نہیں سکوں گا، تم جاؤ۔''

میرا خیال تھا کہ وہ کم از کم ایک بار تو اصرار کرے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور وقت کے مطابق اس نے ٹھیک ہی کیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ ٹریل ٹو رائفل بالکل ریڈی تھی اور اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ جھک کر بھاگ رہا تھا۔ کتا پھر اس کے پیچھے دوڑا۔ اس نے اسے ڈرانے کے لئے فائر کیا۔ اسی دوران میں ایک بڑے مور پنکھ کے عقب سے ایک سائے نے اس پر چھلانگ لگائی۔ گوہر اور وہ اوپر نیچے گرے۔ ایک بار پھر گولی چلی لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ گولی کسی کو لگی نہیں۔ کم از کم تین مزید افراد گوہر پر پل پڑے۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ تاہم وہ خود کو چھڑانے میں کامیاب رہا۔ کبڈی کے کسی تیز رفتار کھلاڑی کی طرف وہ ایک بار پھر گیٹ کی طرف لپکا۔ ایک بار تو لگا کہ وہ نکل جائے گا مگر پھر کسی چیز سے ٹکرا کر گرا۔ کئی افراد نے اسے دبوچ لیا اور بری طرح مارنے لگے۔ دو مسلح افراد نے میرے سر سے بھی رائفلیں لگا دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں افراد ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں زخمی کان والا سلطان چٹا نمایاں تھا۔ اس نے مجھے ایک زوردار ٹھوکر لگائی پھر پھنکار کر اپنے کسی ساتھی سے بولا۔ ''پتا کرو۔ یہ دونوں تہ خانے سے نکلے کیسے ہیں؟ دونوں دروازے تو باہر سے بند تھے۔''

ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے ہانپتے لہجے میں سلطان کو بتایا۔ ''ادھر پارکنگ کی دیوار میں سیندھ لگائی گئی ہے جی۔ کافی بڑا مورا نظر آ رہا ہے۔''

''پکی دیوار توڑی ہے انہوں نے؟'' سلطان نے بہت حیرت سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے اور گوہر کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ کمرا برآمدے کے پاس ہی واقع تھا۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا اور دو مسلح گارڈز وہاں کھڑے ہو

گئے۔ عین ممکن تھا کہ ہمیں دوبارہ اسی بدبودار تہ خانے میں بھیج دیا جاتا جہاں فتح کی بے گور و کفن لاش موجود تھی...... لیکن وہاں چونکہ دیوار توڑی جا چکی تھی لہٰذا ہمارے لئے عارضی طور پر یہ کمرا منتخب کیا گیا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی اور ایک دروازے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کھڑکی میں بھی مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ فرنیچر نام کی کوئی شے یہاں موجود نہیں تھی۔ فرش پر ایک بوسیدہ سا قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوار پر جوہی چاولہ کی تصویر تھی۔

گوہر کو خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی شرٹ تار تار ہو چکی تھی...... پیچ کس گوہر کی جیب سے نکال لیا گیا تھا۔ دروازہ لاک کرنے سے پہلے میری بھی اچھی طرح تلاشی ہوئی تھی۔ سلطان اور ندیم وغیرہ اس بات پر حیرت زدہ نظر آتے تھے کہ ہم تہ خانے کی نو انچ موٹی پختہ دیوار توڑ کر نکلے ہیں۔ وہ اس بات کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہم دونوں سے سوال جواب کرنا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف وہ اپنی محفل بھی برباد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ''مکمل تفتیش'' کا کام کل پر چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ یقیناً اب ایک بار پھر بوتلوں کے ڈھکن کھلنے تھے اور جسموں نے تھرکنا تھا۔ کوشش ہوئی تھی کہ محفل کو ایک بار پھر رنگ پر لایا جائے۔ کھڑکی سے باہر کھڑے گارڈ ہمیں خونی نظروں سے گھور رہے تھے۔

O......❖......O

جیسے تیسے وہ زخموں سے چُور درد بھری رات گزر گئی۔ گوہر کو کافی چوٹیں آئی تھیں لیکن جب وہ میری چوٹیں دیکھتا تھا اور ان چوٹوں کے باوجود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی دیکھتا تھا تو اسے حوصلہ ہوتا تھا کہ اگر گوہر مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں پھنسا ہوتا تو یقیناً میرے دل و دماغ پر بوجھ ہوتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ گوہر نے اپنے طور پر نکلنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہوا۔

اب ہم ایک بار پھر قید و بند کی صعوبت کا شکار تھے اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ایک گارڈ گاہے بگاہے کھڑکی سے جھانک کر ہمیں دیکھ لیتا تھا کہ کہیں ہم سلیمانی ٹوپی پہن کر یہاں سے نکل نہ گئے ہوں۔ گوہر نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ پارکنگ والا گیٹ کھلا مل جاتا تو شاید اس ویلے ہم لاہور میں ہوتے۔''

''لیکن اب تو شاید لاہور دیکھنے کی حسرت ہمارے ساتھ ہی چلی جائے۔ ان لوگوں کے ارادے ہمارے بارے میں اچھے نہیں ہیں۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس طرح کے کاموں میں پھر اس طرح تو ہوتا ہی ہے...... آر یا پار۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اب مرنے کی تیاری کر لیں؟''

وہ اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کھجا کر بولا۔ ''مرنے کے لئے تو ہر ویلے تیار رہنا چاہئے...... یہ گل ہماری مسجد کے امام صاحب کہا کرتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''پتا نہیں اب زندگی ساتھ دے یا نہ دے۔ اب تو اپنے بارے میں کچھ بتا دو۔ کہاں سے آئے ہو اور کیسے پھنسے ہو اُن خبیثوں کے چنگل میں؟''

''اس سے کیا فائدہ ہونا ہے؟ جب مر ہی جانا ہے تو پھر جاننے سے فائدہ۔ ہاں اگر زندہ بچ گئے تو پھر لاہور کے کسی باغ میں بیٹھ کر تمہیں ضرور بتاؤں گا اور تم سے پوچھوں گا بھی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

عجیب منطق تھی اس کی۔ اسی دوران میں گارڈ کھڑکی میں کھڑا ہو کر ہمیں گھورنے لگا اور ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ''اوئے بدبختو! کوئی مرہم پٹی ہی کر دو۔'' گوہر نے اپنی زخمی آنکھ کو دباتے ہوئے کہا۔

گارڈ نے بڑی نفرت سے تھوکا۔ یہ تھوک آہنی گرل میں سے گزر کر سیدھا گوہر کے ہاتھ پر پڑا۔ گارڈ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اسے لگا اپنی چوٹوں پر۔ اگر پھر بھی آرام نہ آئے تو اس میں تھوڑا سا پیشاب بھی ملا لینا۔'' وہ بکتا جھکتا آگے چلا گیا۔

گوہر نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے ہاتھ کی پشت قالین سے رگڑ کر صاف کی اور دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

میں بھی لیٹ گیا۔ کوٹھی میں مکمل سکوت تھا۔ لگتا تھا کہ رات بھر کی رنگین مصروفیات کے بعد سارے مہمان لمبی تان کر سوئے ہوئے ہیں۔ میرے بازو اور ٹانگ کے دو تین زخم بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور میں ہلکا سا بخار بھی محسوس کر رہا تھا کیا واقعی یہ کوٹھی میرے لئے فتح محمد کی طرح موت کا پنجرہ ثابت ہونے والی ہے؟ میں نے بڑے کرب سے سوچا...... اگر میں یہاں مر گیا تو عمران مجھے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا؟ فرح اور عاطف پر کیا گزرے گی؟ بالو مکمل طور پر بے سہارا ہو جائے گا...... اور ثروت؟ کیا ثروت کو ایک آخری بار چھونے کی حسرت دل میں ہی رہ جائے گی؟

میں نیم غنودگی میں لیٹا رہا۔ اسی دوران میں ایک بار آنکھوں کی درز سے گوہر کی طرف دیکھا تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ غالباً اسے نشے کی طلب ہو رہی تھی...... اور یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی، چرس نہ وہسکی وغیرہ۔ وہ اپنی ٹانگیں کھجا رہا تھا اور سامنے دیوار کو دیکھ کر رہا تھا۔ وہاں جوہی چاولہ کی مختصر لباس والی گرما گرم تصویر لگی تھی۔ وہ للچائی ہوئی آنکھوں سے

اسے دیکھ رہا تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ للچائی ہوئی آنکھ سے دیکھ رہا تھاس۔ ایک آنکھ تو سوج کر اور نیلی ہو کر کپا بن چکی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منشیات کی طرح عورت کا بھی رسیا ہے۔

نہایت سنگین حالات تھے۔ اس کے باوجود گوہر نامی یہ شخص جس طرح فلمی تصویر کو دیکھ رہا تھا، میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔

میں نے کہا۔ ''یار! اتنی مار پڑی ہے پھر بھی تمہاری طبیعت میں کچھ نرمی نہیں آئی۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے مجھے گھور کر پوچھا۔

''اتنی پیاری لڑکی ہے اور تم ایسے دیکھ رہے ہو جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔''

وہ میری بات سن کر بے ڈھنگے انداز میں مسکرایا۔ ''قصائی تو ذبح کرنے کے لئے دیکھتا ہے، ہم ذبح ہونے کے لئے دیکھتے ہیں۔ ویسے کڑی بڑی ٹیٹ ہے۔'' اس کی اکلوتی آنکھ میں جنسی بھوک لشکارے مار رہی تھی۔

اس نے ''ٹیٹ'' کا لفظ اپنی گفتگو میں شاید ایک یا دو بار پہلے بھی استعمال کیا تھا۔ یہ لفظ مجھے کچھ یاد دلا رہا تھا لیکن سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا یاد دلا رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان گفتگو جاری رہی۔ ہم ایک طرح سے اپنی اپنی تکلیف کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لئے یہ گفتگو کر رہے تھے۔ گوہر میری برداشت کی صلاحیت سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''گوہر! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ رات کو ایک کتے نے تو تم پر فوراً حملہ کر دیا اور تم نے اسے گولی بھی ٹھوک دی لیکن دوسرا کتا جو زیادہ زہریلا لگتا تھا، تم سے دور دور رہا۔ حالانکہ وہ قد کاٹھ میں بھی پہلے سے ڈیوڑھا تھا۔''

''وہ مجھے جانتا تھا۔'' گوہر نے کہا۔

''کیسے؟'' میں نے کراہتی آواز میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ مجھے بتائے یا نہیں۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں نے اس کی سکھائی کرائی تھی۔''

''یعنی...... تم نے ٹریننگ دی تھی اسے؟ تم کتوں کو ''ٹرینڈ'' کرتے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے بے پروائی سے سر ہلایا اور ایک بار پھر اکلوتی آنکھ سے جوہی چاولہ کا ایکسرے کرنے لگا۔

''تو تم کتوں کو ٹرینڈ کرنے کے لئے یہاں آئے تھے مگر پکڑے کیسے گئے؟''

''یار! تم کنڈم باتوں میں اپنا ویلا (وقت) خراب کر رہے ہو۔ اگر دماغ کو تکلیف دینی ہے تو پھر جان بچانے کے بارے میں کچھ سوچو۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ آج شام تک ہمیں

زندہ رہنے دیں گے......''

ایک دم میرے ذہن میں کوندا سا لپکا...... گوہر کے بار بار بولے ہوئے ''ٹیٹ'' نے میرے اندر جو کھد بد شروع کی تھی، وہ ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ یہ شخص کتوں کو تربیت دیتا تھا۔ چھریرے جسم کا مالک تھا اور وسطی پنجاب کا رہنے والا تھا...... عمران نے اپنی روداد میں جس راجے کا ذکر کیا تھا، وہ بھی تو وسطی پنجاب کا تھا۔ اس کا بنیادی کام بھی کتوں اور گھوڑوں کی ٹریننگ ہی تھا...... اور...... پھر...... یہ لفظ ''ٹیٹ۔''

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑی تاہم میں نے اپنے تاثرات نارمل ہی رکھے۔ میں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم کبھی خوشاب کے قریب شاد پور میں بھی رہے ہو؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہاں، میں رہا تو ہوں شاد پور میں بھی...... پر تم کیسے جانتے ہو؟''

''کیا...... تمہارا کوئی دوست عمو نام کا بھی تھا...... عمو عمران۔'' میں نے وضاحت کی۔

اس کی اکلوتی آنکھ میں لشکارے سے نظر آئے۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا......

''تم...... تم عمو کو کیسے جانتے ہو؟'' اس نے تیز سے پوچھا۔

میں گہری نظروں سے اس کو سرتاپا دیکھتا رہا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کیا میں سمجھوں کہ تمہارا اصل نام گوہر نہیں ہے؟''

''تم نے میری گل کا جواب نہیں دیا۔''

''تم نے بھی تو جواب نہیں دیا۔ تمہارا اصل نام گوہر ہے یا...... راجا؟''

راجا کے لفظ پر وہ جیسے اچھل پڑا۔ اس نے بدکے ہوئے انداز میں دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم عمو کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ کدھر ہے وہ؟''

ایک طرح سے وہ تسلیم کر رہا تھا کہ اس کا نام راجا ہے۔ میں نے اسے سرتاپا گھورا۔ ہاں، وہ راجا ہی تھا۔ وہی حلیہ جو عمران نے مجھے کئی بار بتایا تھا۔ ٹھوڑی پر زخم کا ویسا ہی نشان۔ وہی بول چال۔ میں غائبانہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ یہی تیز طرار شخص تھا جس نے سولہ سترہ سالہ عمران کو ماجھاں جیسی جابر عورت کے چنگل سے چھڑایا تھا اور بے رحم حالات میں اسے زندہ رہنے کے گُر سکھائے تھے۔ آگے چند برسوں میں راجے اور عمران کی دوستی میں کئی نشیب و فراز آئے تھے اور پھر بقول عمران...... راجا لاہور کے بازارِ حسن میں گرفتار ہو کر جیل چلا گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے اہم کردار سے میری ملاقات ہو گی

اور ایسے حالات میں ہوگی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کمرے کے دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ دروازے کے دونوں پٹ اس طرح کھلے کہ ان میں چودہ پندرہ انچ کا فاصلہ ہوگیا۔ تاہم اسٹین لیس اسٹیل کی ایک نفیس زنجیر کے ذریعے دروازہ پورا کھلنے سے رک گیا۔ ایک رائفل بردار گارڈ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک ملازم تھا۔ ملازم نے ایک چھوٹی ٹرے ادھ کھلے دروازے میں سے اندر کھسکا دی۔ ٹرے میں انڈے اور پیاز کا آملیٹ تھا۔ دو پراٹھے اور دہی وغیرہ تھا۔ رائفل بردار سفاک انداز میں بولا۔ ''ناشتا کرلو۔ ہوسکتا ہے یہ تمہارا آخری ناشتا ہو۔''

''لسی مل جائے گی؟'' گوہر یعنی راجے نے کراہتے ہوئے کہا۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ راجا ہی ہے۔

رائفل بردار پھنکارا۔ ''لسی تو نہیں لیکن دہی کافی سارا پڑا ہوا ہے۔ وہ تمہارے ہی کام آئے گا۔''

اس کے آخری الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ ان الفاظ کا اصل مطلب قریباً ایک گھنٹے بعد واضح ہوا اور یہ مطلب لرزہ خیز تھا۔

میں قریباً بیالیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ بدترین حالات اور اندیشوں کے باوجود کھانے کی خوشبو اشتہا انگیز محسوس ہوئی۔ میں نے ٹرے اٹھا کر قالین پر رکھ لی۔ پہلا لقمہ لیا تو پتا چلا کہ جسم کے بہت سے دیگر حصوں کی طرح جبڑا بھی پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ بمشکل تھوڑا سا منہ کھول کر لقمہ زبان پر رکھ پایا۔ عمران نے مجھے سکھا دیا تھا کہ شدید خطرات اور اندیشوں کے نرغے میں بھی کس طرح خود کو نارمل رکھا جاتا ہے اور کس طرح صرف حال پر نظر رکھ کر مستقبل اور مستقبل قریب کو چکما دیا جاتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مرنے سے پہلے مرنا نہیں چاہئے اور مصیبت سے پہلے ڈرنا نہیں چاہئے۔ گارڈ کھڑکی میں موجود تھا، لہٰذا اب ہم ''ایک دوسرے سے تعارف'' والا موضوع نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ گوہر یعنی راجا کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ وہ جلد از جلد مجھ سے عمران کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ ہمیں کافی لیٹ ناشتا دیا گیا تھا۔ قریباً دس بج چکے تھے۔ جس وقت ہم ناشتا کر رہے تھے، پارکنگ کی طرف سے گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ''شب بسری'' کرنے والے بیشتر مہمان اب رخصت ہو رہے ہیں۔ ان میں سے کئی مہمان رخصت ہونے سے پہلے ہمیں دیکھنے کے لئے آئے۔ وہ گرل دار کھڑکی میں سے یوں جھانک رہے تھے جیسے

بڑی تگ و دو کے بعد جنگل سے پکڑے جانے والے خطرناک جانوروں کو دیکھ رہے ہوں۔ ان میں سے بیشتر کی آنکھیں شراب نوشی اور ''دیگر مصروفیات'' کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔

قریباً بارہ بجے کا وقت تھا جب میری چھٹی حس نے کہا کہ یہاں کوئی خطرناک تماشا ہونے والا ہے۔ سلطان چِٹّا ہمارے کمرے کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔

وہ ذرا فاصلے پر گیا تو راجا نے کھڑکی میں کھڑے گارڈ سے پوچھا۔ ''کچھ ہمیں بھی بتاؤ اکرم خاں کیا ارادے ہیں تمہارے؟''

اس نے ایک بار پھر کھڑکی میں سے تھوک پھینکا جو راجے کے عریاں کندھے پر گرا۔ ''ارادے بڑے چنگے ہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم اوپر پہنچنے والے ہو۔'' گارڈ نے کہا۔

''تو پھر کیا سوچ رہے ہو...... جو کرنا ہے فٹافٹ کرو۔ مارو گولی اور ٹھنڈا کرو ہمیں۔'' راجا نے اپنے ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ گولی تو انہیں ماری جاتی ہے جنہیں مارنا ہو۔ تمہیں تو پہلے زندگی موت کے درمیان ٹانگنا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب تمہیں میں بتاتا ہوں۔'' ایک طرف سے سیکرٹری ندیم نمودار ہوا اور آنکھوں پر عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''کئی ملکوں میں قانون ہے کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ہم بھی تمہیں تین کتوں کے حوالے کر رہے ہیں۔ اصلی نسل کے بلڈاگ ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی جو تین کتے تم لوگوں نے مارے ہیں، یہ ان کے رشتے دار ہیں...... بالکل جائز وارث ہیں۔ ایک ''متوفی'' کا بڑا بھائی ہے۔ دو اس کی مادہ کے پیٹ سے ہیں۔''

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ ندیم کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے دو دن پہلے تہ خانے میں بھی یہ بات کہی تھی کہ مجھ پر کتے چھوڑے جاسکتے ہیں۔ اب یہاں کوئی ایسا ہی سین ترتیب دیا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ندیم کی بات سن کر راجا کا چہرہ بھی متغیر ہوا ہے۔ دراصل صورتِ حال ہمارے لئے سنگین ہوتی جا رہی تھی۔

ندیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے تاسف سے کہا۔ ''معاملے کو یہاں تک پہنچانے کے ذمے دار تم خود ہو۔ تم نے اوپر تلے غلطیاں کی ہیں۔ اور سب سے اہم غلطی اس

"ماں کے ہیرو" والی تھی۔ تم نے فون پر اسے الرٹ کر کے جاوا صاحب کی طرف سے اپنی موت پر مہر لگوا لی ہے۔ جان تو اس ناکام ہیرو کی اب بھی نہیں بچنی، تم خواہ مخواہ جوانی میں اِنا للہ ہو رہے ہو۔"

ندیم کی بات سے مجھے ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی اور وہ تسلی یہ تھی کہ کم از کم ابھی تک تو عمران محفوظ ہے۔

ندیم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تمہاری دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ تم نے جاوا صاحب کے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کیا۔ پہلی غلطی کے بعد یہ دوسری غلطی سراسر خودکشی کے برابر تھی۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے میری دوسری غلطی کے بارے میں بتا کر ندیم ایک طرح سے مجھے امید کی مدھم سی کرن بھی دکھا رہا ہے۔ مجھے بتانا چاہتا ہے کہ اگر میں اب بھی اپنے ساتھیوں کے بارے میں معلومات فراہم کر دوں تو کوئی بری بھلی صورت نکل سکتی ہے لیکن یہ ایک چکما بھی ہو سکتا تھا۔ کم از کم سلطان چٹا وغیرہ کے تیور تو یہی بتا رہے تھے کہ وہ ہمیں مارنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ فضا میں ایک سراسیمگی سی پائی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایشوریا رائے ثانی جیسی لڑکیاں اور عام ملازم جو تماشائی کی حیثیت سے کھڑکی کے اردگرد موجود تھے، اب کہیں غائب ہو چکے تھے۔ فقط کرخت چہرہ گارڈز آس پاس نظر آتے تھے یا سلطان چٹا پھنکار رہا تھا۔

سرخ رنگ کی ایک پلاسٹک کی بالٹی لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس میں جو کچھ تھا، وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر کتوں کی خوفناک...... گونجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد تین عدد جسیم کتے ہمارے سامنے تھے۔ ان کی چمکیلی زنجیریں تین تنومند افراد کے ہاتھوں میں تھیں۔ کتوں کے منہ پر بگیاڑیاں (حفاظتی جالیاں) تھیں۔ وہ پارے کی طرح مچل رہے تھے اور اپنے رکھوالوں کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہے تھے۔

گارڈ اکرم خاں نے سرخ بالٹی میں سے ایک بڑا ڈونگا بھر کر نکالا اور کھڑکی کے پاس بیٹھے راجا پر اچھال دیا اور تب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ اس بالٹی میں دہی ہے۔ راجے کا زخمی عریاں جسم دہی سے لتھڑ گیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دوسرا ڈونگا مجھ پر ڈالا گیا۔ میرے کندھوں پر کچھ دہی گرا۔

اس کے بعد گرل دار کھڑکی کے رستے ہم پر تواتر سے دہی پھینکا جانے لگا۔ فرش اور

قالین بھی دہی سے لتھڑ گیا۔ کمرے سے باہر کھڑے کتے، دہی کی خوشبو سے دیوانے ہو رہے تھے۔ غالباً ان کی تربیت ہی اسی انداز سے کی گئی تھی۔ یہ بڑی لرزہ خیز صورتِ حال تھی۔ کچھ دیر پہلے جب راجا نے ناشتے میں لسی مانگی تھی تو رائفل بردار نے کہا تھا...... لسی تو نہیں دہی بہت ہے اور تمہارے ہی کام آنے والا ہے...... اور اب یہ "کام" آ رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا لیکن وہ پہلے کی طرح بس فٹ سوا فٹ ہی کھل سکا۔ زنجیر نے اسے پورا کھلنے سے روک لیا۔ یہ خلا اتنا ضرور تھا کہ اس میں سے جسیم بلڈاگ اپنی تمام تر حشر سامانی کے ساتھ اندر داخل ہو سکتا...... اور پھر وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے منہ پر سے حفاظتی جالی ہٹائی جا چکی تھی ورنہ کسی کو بھی اپنے نکیلے دانتوں سے پھاڑنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اضطراری حرکت کے تحت ہم دونوں پیچھے ہٹ گئے...... دیوار کے ساتھ جا لگے۔ اتنے میں دوسرا کتا بھی پھنس پھنسا کر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں خونخوار جانوروں کی زنجیریں ان کے رکھوالوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ انہیں کھینچ رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ تھوڑی ڈھیل بھی دے رہے تھے۔ یہ دہشت زدہ کرنے کا ایک ڈھنگ تھا۔ تاہم یہ بات بھی سامنے کی تھی کہ اگر ان تین کتوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم خالی ہاتھ ہرگز اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ دونوں شدید زخمی تھے اور میری ایک ٹانگ تو تقریباً مفلوج تھی۔

چند لمحے بعد تیسرا کتا بھی خوفناک جست کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ اپنے رکھوالے کو تقریباً گھسیٹ رہا تھا۔ اس کی مدد کے لئے ایک دوسرے شخص نے بھی زنجیر تھام لی۔ کتوں کے ساعت شکن شور سے کمرے کی دیواریں لرزنے لگیں۔ دہی کی خوشبو انہیں دیوانہ کر رہی تھی اور یقیناً ان میں ہمارے زخموں اور خون کی بو بھی شامل تھی۔ یہ واقعی قیامت خیز گھڑیاں تھیں۔ اپنے جیسے شخص سے برسرِپیکار ہونا، اس سے مار کھانا اور اسے مارنا ایک اور بات ہے، مگر بپھرے ہوئے خونخوار جانوروں کا سامنا کرنا دیگر بات۔

آخر میں داخل ہونے والا جسیم کتا راجا کے بالکل قریب آ گیا تو راجا نے اس کے منہ پر لات رسید کی۔ اس لات کی سزا دینے کے لئے رکھوالے نے زنجیر کو کچھ اور ڈھیل دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتے نے راجا کی پنڈلی پر منہ مارا۔ اس کی پتلون کا پائنچہ ادھیڑ کر رکھ دیا اور ساتھ ہی ٹخنے کو بھی زخمی کیا۔ راجا نے مغلظات بکیں اور تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ اس کے لمبے ملائم بال چہرے پر بکھر گئے تھے اور گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔

سلطان چٹا سب کچھ کھڑکی سے دیکھ رہا تھا...... مونچھوں کو تاؤ دے کر دہاڑا۔ "چڑھا دو حرامزادے پر۔ پھاڑ دو پیٹ اس کا۔"

کتا ایک بار پھر راجا کی طرف آیا۔ یوں لگا کہ وہ واقعی اس کا خاتمہ بالخیر کر دے گا مگر سیکرٹری ندیم نے رکھوالے کو روکا۔ اس نے کتا پیچھے کھینچ لیا...... چند سیکنڈ بعد باقی دونوں کتے بھی کھینچ لئے گئے۔ ان کو برآمدے تک پیچھے ہٹا لیا گیا۔ ہمارے اردگرد ساعت شکن شور قدرے کم ہو گیا۔ سیکرٹری ندیم گرل دار کھڑکی میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور عداوت کی چنگاریاں تھیں۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ''یہ تمہارے لئے آخری...... بالکل آخری موقع ہے سلطانی گواہ بننے کا۔ ورنہ ٹھیک پانچ منٹ بعد تم دونوں کی لاشوں کے ٹکڑے اکٹھے کرنا اور انہیں علیحدہ علیحدہ شاپروں میں ڈالنا کافی مشکل ہو جائے گا۔''

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' میں نے وقت ٹالنے کے لئے پوچھا۔

''نہیں نہیں، اب پوچھنا وچھنا کچھ نہیں۔ اب تو دوٹوک بات ہے۔ ایک اور سنہری موقع دیتے ہیں تمہیں۔ سیل فون تمہارے ہاتھ میں تھماتے ہیں۔ کسی طرح اپنے یار کو بل میں سے نکال سکتے ہو اور یہاں بلا سکتے ہو تو بلا لو۔ کچھ ایسا رونا روؤ اس کے سامنے کہ وہ تڑپ کر تمہارے پاس پہنچ جائے۔''

سلطان چٹا پھنکارا۔ ''لیکن اگر پہلے والا کمینہ پن کیا تو اس بار چھوٹ نہیں ملے گی...... یہ تینوں کتے ایک ساتھ تمہارے اوپر چڑھائی کریں گے۔ پہلے سیکنڈ میں تمہیں ننگا کریں گے۔ اگلے دو سیکنڈ میں پھاڑ دیں گے......''

ابھی سلطان کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہ آواز کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے فوراً بعد خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ ایک طویل برسٹ چلا۔ کچھ چلاتی ہوئی آوازیں آئیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے کوئی بڑی گاڑی کوٹھی کا مین گیٹ توڑتی ہوئی اندر گھس آئی ہے اور...... یہ ایک گاڑی نہیں تھی۔ شاید کئی گاڑیاں تھیں۔ ان کے انجن چنگھاڑ رہے تھے اور شاید اس کے ساتھ ساتھ گاڑیوں پر سوار لوگ بھی للکارے مار رہے تھے۔

ایک دم ہی کوٹھی کے طول وعرض میں اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے گارڈ اکرم خاں کو دیکھا، وہ اپنی رائفل سیدھی کر کے احاطے کی طرف مڑا مگر ابھی دو قدم ہی اٹھا پایا تھا کہ اس کی چھاتی پر آٹومیٹک رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ اچھل کر برآمدے کی سیڑھیوں میں گرا۔ سلطان چٹا اور ندیم وغیرہ بھی آڑ کے لئے مختلف اطراف میں بھاگے...... رکھوالوں نے کتوں کی زنجیریں چھوڑ دیں، وہ تینوں کتے جارحانہ انداز میں مختلف اطراف میں لپکے۔

''لگتا ہے مخالف پارٹی نے حملہ کر دیا ہے۔'' راجا اپنا زخمی ٹخنہ دبائے دبائے بولا۔

''مخالف پارٹی کون ہے؟''

''کوئی تو ''اللہ کی بندی'' ہوگی۔'' راجا نے عجیب جواب دیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا، وہ پتلون اور ہاف سلیو شرٹ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ماؤزر تھا۔ اس نے ایک ستون کی آڑ لے رکھی تھی اور اندرونی کمروں کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی پکار رہا تھا اور ان کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھا۔ مجھے لگا کہ میں نے اس شخص کو ریان ولیم صاحب کے آس پاس دیکھا ہے۔

تو اس کا مطلب تھا کہ یہ ریان ولیم گروپ کے لوگ ہیں۔ فربہ اندام ریان ولیم کی شبیہ میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ ہمیں جلالی صاحب کی طرف بھیجنے والا اور نت نئے حالات سے دوچار کرنے والا ریان ولیم ہی تھا۔ ریان گروپ اور جاوا گروپ میں آرا کوئے کے مجسمے کے لئے خوفناک کشمکش چل رہی تھی۔ اس کشمکش کو چند دن پہلے اس وقت عروج ملا تھا جب جاوا کے لوگوں نے جلالی فارم پر حملہ کیا تھا، قتل کئے تھے اور عصمت دری کی تھی۔ اس بھیانک واردات کا ملبا ریان گروپ پر ڈالنے کے لئے جاوا کے لوگوں نے ایک ناٹک بھی کیا تھا۔ جاوا کے نادرے نامی دراز قامت غنڈے نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے رکھا تھا اور پشتو لہجے میں اردو بولی تھی۔ یوں انہوں نے تفتیش کا رخ ریان گروپ کے مرجان خان کی طرف موڑنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ بعدازاں عمران نے اس صورتِ حال کو ریورس گیئر لگایا تھا۔

فائرنگ کی آواز میں شدت آتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی قوتِ برداشت کو آواز دی اور نیم مفلوج ٹانگ کو متحرک کیا۔ ادھ کھلا دروازہ ہمارے سامنے تھا اور آزادی کی نوید سنا رہا تھا۔ دروازے کے خلا میں اتنی جگہ موجود تھی کہ ہم پھنس پھنسا کر اس میں سے نکل سکتے تھے۔ باہر چاروں طرف پرواز کرتی ہوئی اندھی گولیوں کا خدشہ تو موجود تھا مگر اندر بھی تو موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پہلے میں اور پھر راجا عرف گوہر دروازے سے باہر آ گئے۔ باہر آتے ہی گولیوں کے پورے ایک برسٹ نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ برسٹ راجا کے سر سے دو ڈھائی فٹ اُوپر دیوار میں لگا۔ میں نے اکرم خاں کی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور لنگڑاتا ہوا ایک دیوار کی اوٹ میں آ گیا۔ راجا بھی جھک کر دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کا چھریرا جسم تیز دھوپ میں چمک رہا تھا۔

میں نے دیکھا، ریان گروپ کا ایک شخص اندھا دھند دوڑتا ہوا واپس اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بلڈاگ اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ شخص گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھسنے میں کامیاب ہوا لیکن اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی جسیم کتا بھی اندر گھس گیا۔ ممکن ہے ریان گروپ کے کسی شخص نے کتے پر فائر وغیرہ بھی کیا ہو

لیکن وہ اسے لگا نہیں۔

اگلے چار پانچ سیکنڈ گاڑی میں گھسنے والے کے لئے بڑے بھیانک تھے۔ بپھرے ہوئے کتے نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میں گاڑی کے کھلے دروازے میں سے بس اتنا ہی دیکھ سکا کہ کتے کے منہ میں بدقسمت شخص کے پیٹ کا ایک بڑا لوتھڑا تھا اور اس کی انتڑیاں بکھر رہی تھیں۔ اس کی آخری آوازیں بڑی دردناک تھیں۔ گاڑی کی دائیں کھڑکیوں کے شیشے خون سے لتھڑ گئے اور یہ لرزہ خیز منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک زوردار دھماکا ہوا۔ احاطے میں کھڑی ایک سفید اسٹیشن وین کا ایک ٹائر گولی کا نشانہ بن کر دھماکے سے پھٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ کتا کار سے باہر نکلا جس نے ریان گروپ کے شخص کو وحشیانہ طریقے سے مارا تھا۔ کار سے باہر نکلتے ہی کتا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ یقیناً اسے بھی گولی لگ گئی تھی۔

''یہاں سے نکلنے کا یہ اچھا موقع ہے۔'' راجا نے میرے کان میں کہا۔

''کس طرف سے نکلیں؟'' میں نے پوچھا۔

راجا نے عقابی نظروں سے چند قدم دور کھڑی ایک لینڈ روور جیپ کو دیکھا۔ جیپ کا سامنے والا حصہ پچکا ہوا تھا...... ہیڈ لائٹس بھی چکنا چُور تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسی جیپ سے ٹکر مار کر کوٹھی کا مین گیٹ توڑا گیا تھا۔ راجا نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جیپ کی چابی اندر ہی ہے، کسی طرح جیپ تک پہنچ جاؤ۔''

ہم دونوں زمین پر لیٹ گئے۔ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اس پرانے ماڈل کی جیپ کی طرف بڑھے۔ فائرنگ شدید تر ہو گئی تھی۔ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ لڑنے والوں کے للکارے پوری کوٹھی میں سنائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے لوگ عداوت کے عروج پر پہنچ کر ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ صرف احاطے کے اندر ہمیں کم از کم چار لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم پورچ کے قریب کھڑی لینڈ روور کے پاس پہنچ چکے تھے۔ آخری سات آٹھ قدم کا فاصلہ ہم نے جھک کر دوڑتے ہوئے طے کیا...... اور جیپ میں گھس گئے۔ راجا چونکہ پہلے گھسا تھا، اس لئے اس نے بائیں طرف والی نشست سنبھالی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ جونہی میں نے اگنیشن میں چابی گھمائی، جیپ تھرتھراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہو گئی۔ ٹانگ کام نہیں کر رہی تھی مگر میں کسی نہ کسی طرح کلچ دبا کر گیئر لگانے میں کامیاب رہا۔ ایکسلریٹر دبایا تو جیپ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ گولیوں کی مار سے بچنے کے لئے ہم نے اپنے سر

حتی الامکان حد تک نیچے جھکا رکھے تھے۔ کتے کی خون آلود لاش کو روندتی ہوئی جیپ گیٹ سے نکلی اور باہر آ گئی۔ سامنے دو تین گاڑیاں اس طرح آڑی ترچھی کھڑی تھیں کہ راستہ بند تھا۔ میں جیپ کو گھما کر کوٹھی کی بغلی گلی میں لے گیا اور پھر عقب میں نکل آیا۔ اسی اثنا میں ایک اندھی گولی نے جیپ کی پچھلی کھڑکی کا شیشہ چکنا چُور کر دیا۔ ہنگامے اور افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی کچھ خبر نہیں تھی۔ کوٹھی کے عقب سے گزرتے ہوئے اچانک میں چونکا۔ میں نے جیپ کو بریک لگا دیئے۔

''عقل تو نہیں ماری گئی؟ کیا کرتے ہو؟'' راجا چلایا۔

''بس ایک سیکنڈ۔'' میں نے کہا اور چھلانگ لگا کر جیپ سے اترا۔ لنگڑاتا ہوا اس لمبی گھاس کی طرف بڑھا جس میں اپنا سیل فون چھپایا تھا۔ سیل فون ڈھونڈنے اور جیپ میں واپس آنے میں مجھے آٹھ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ جیپ ایک بار پھر آگے بڑھی اور طوفانی رفتار سے بڑی سڑک کی طرف چل دی۔ ہمارے عقب میں کوٹھی کے اندر تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ شاید کسی حصے میں آگ بھی لگ گئی تھی۔ دھوئیں کے بادل فضا میں بلند ہو رہے تھے۔

O......❖......O

ہم نے موقع واردات سے دور آنے کے لئے کچے راستے استعمال کئے۔ کھیتوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی سے قریباً دس کلومیٹر دور آ گئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کس جگہ پر ہیں۔ بس اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمارا رخ لاہور کی طرف ہی رہا ہے۔ یہ بالکل دیہاتی علاقہ تھا۔ راستے میں چند بڑی بڑی پھلواریاں اور زرعی رقبے بھی دکھائی دیئے تھے۔ یہ عین دوپہر کا وقت تھا۔ قریباً ایک بج چکا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھیت کھلیان، راستے اور گاؤں، سب خاموش اور سنسان نظر آتے تھے۔ بس کہیں کوئی چرواہا مویشیوں کو ہانکتا دکھائی دیتا۔ چارے سے لدی ہوئی کوئی گدھا گاڑی ہچکولے کھاتی نظر آئی یا دور کہیں کسی کھیت میں ٹریکٹر کی آواز ابھرتی اور بکھرتی۔

اس سارے سفر کے دوران میں ہم دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہے تھے۔ ہماری نگاہیں بار بار عقب نما آئینے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں جہاں ہچکولے کھاتے راستے اور گرد کے مرغولوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جاوے کی دہشت ناک صورت بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ وہ واقعی ایک بے رحم ڈان کا چہرہ تھا اور اس ''ڈان'' نے عہد کر لیا تھا کہ جب تک عمران کو ختم نہیں کر لیتا، اپنی مرغوب چیزوں کے قریب نہیں پھٹکے گا۔ وہ

اس کو بھرت وچن کا نام دیتا تھا۔ جاوے کے اس ٹھکانے پر جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، وہ لرزہ خیز تھا۔ میں اس سے توجہ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا...... راجا کو گاڑی کے ڈیش بورڈ کے اندر سے ایک پسندیدہ شے مل گئی تھی۔ یہ انگریزی شراب کی ایک سربمہر بوتل تھی۔ راجا نے بلا تکلیف اس کی سیل توڑی اور گھونٹ گھونٹ پینا شروع کر دی تھی۔ تھوڑی سی شراب اس نے اپنے زخمی ٹخنے پر بھی انڈیل تھی اور برے برے منہ بنائے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ شراب کے لیے ترسا ہوا ہے...... یا پھر اپنی جسمانی تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لئے وہ ضرورت سے زیادہ پی رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک تہائی بوتل خالی کر گیا۔ اس کی ورم زدہ آنکھ کا ورم کچھ کم ہو گیا تھا مگر وہ گہری نیلی پڑ چکی تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا کے جھونکوں سے اس کے چہرے پر جھول رہے تھے۔ ان بالوں پر ابھی تک سوکھا ہوا دہی موجود تھا۔

عمران کی روداد میں، میں نے راجا کا ذکر بڑی تفصیل سے سنا تھا۔ ایک طرح سے اس کا مفصل غائبانہ تعارف ہو چکا تھا لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کسی وقت راجا سے اس طرح ملاقات ہو گی۔ وہ اور میں ایک ''چوری شدہ'' جیپ میں بیٹھ کر ایک پُر ہنگام جگہ سے نکلیں گے اور ایک چلچلاتی دوپہر میں چور راستوں پر سفر کریں گے۔ ہمارے جسموں پر نامکمل لباس ہوں گے۔ پاؤں ننگے ہوں گے اور زخموں سے خون رس رہا ہو گا۔ راجا مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور میں بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن فی الحال اس حوالے سے ہم دونوں خاموش تھے۔

جھاڑیوں کے ایک سایہ دار جھنڈ کے اندر سے گزرتے ہوئے میں اور راجا بری طرح چونک گئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے جیپ کے پچھلے حصے میں کوئی موجود ہے۔ کوئی جاندار چیز۔

''یہ کیا ہے؟'' راجا نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، آواز تو آئی ہے۔'' میں نے تصدیق کی۔

''بریک لگاؤ۔'' راجا نے کہا۔

میں نے جیپ روک دی۔ راجا کسی ماہر شکاری کی طرح چوکس ہو گیا تھا۔ مرحوم گارڈ اکرم خاں کی رائفل ابھی تک ہمارے پاس تھی۔ راجا نے رائفل اٹھائی اور اپنے چھریرے جسم کو بل دیتا ہوا جیپ کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا۔ لینڈ روور جیپ مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ کافی کشادہ بھی ہوتی ہے۔ یہ جیپ گو کہ پرانی تھی مگر اب تک اس نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اب یہ اپنے اندر کا کوئی اسرار ہم پر کھول رہی تھی۔ راجا عقبی نشستوں پر گیا۔ پھر وہ یوں

کسی شے پر جھپٹتا جیسے بلی چڑیا پر جھپٹتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی عورت سریلے انداز میں چلائی۔ چند سیکنڈ بعد ہم مبہوت رہ گئے۔ جیپ کی سب سے پچھلی نشستوں کے اگلے خلا سے ایک لڑکی برآمد ہوئی تھی۔ جاوا گروپ کی دیگر لڑکیوں کی طرح یہ بھی ہوش رُبا لباس میں تھی۔ اس نے نہایت کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی اور سفید رنگ کی چست شارٹس ٹانگوں سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے شہد رنگ بال راجا کی مٹھی میں تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اور پھر چونک گیا۔ یہ ایشوریا رائے کی وہی ہم شکل تھی جو کوٹھی میں ہر وقت ندیم کی بغل میں گھسی نظر آتی تھی۔

''اوئے یہ پری کہاں سے آ گئی؟'' راجا پُر جوش آواز میں بولا۔

''اس پری ہی سے پوچھو۔'' میں نے کہا۔

راجا نے لڑکی کو کھینچ کر سیٹ پر بٹھایا۔ اس کے بال بدستور راجا کی مٹھی میں تھے اور اس کی صراحی دار گردن ایک طرف کو خم کھائے ہوئے تھی۔ ''سوہنیو! یہ کہاں آ پھنسے ہو؟'' راجا نے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''وہ...... وہ میرے پیچھے بھاگ گئے تھے...... میں جان بچانے کے لئے گاڑی میں گھس گئی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''کون بھاگے تھے سوہنیو......؟'' راجا نے بازاری انداز میں پوچھا۔

''وہی جو کوٹھی میں گھسے ہیں۔'' اس نے کہا۔ اس کا اشارہ یقیناً ریان گروپ کے لوگوں کی طرف ہی تھا۔

راجا نے اس کے بال چھوڑے اور اس کی گردن پر ہاتھ چلاتے ہوئے بڑے دلار سے بولا۔ ''بادشاہو! یہ کیا کرتے رہے ہو آپ جناب...... ساڈے نال سفر بھی کرتے رہے ہو اور ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ ہمیں بتاتے، ہم آپ کی کوئی خدمت شدمت کرتے۔ کوئی ''چائے پانی'' پلاتے آپ کو۔'' راجا کے اندر وہسکی کے نشے نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

''میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پلیز! مجھے جانے دو۔'' وہ پھر روہانسی آواز میں بولی۔

''یہ تو میں نے بھی بہت کہا تھا کہ مجھے جانے دو لیکن تم نے میری بات مانی تھی؟''

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں اس سے۔'' وہ منمنائی۔

''تمہارا نہیں، پر تمہارے اس یار ندیم اور سلطان چٹے کا تو ہے نا۔''

''دیکھو...... مم...... مجھے چھوڑ دو، نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔''

''یہ انارکلی یا مال روڈ نہیں ہے سوہنیو...... جنگل ہے جنگل۔ یہاں کوئی جناب کا شور نہیں

سننے والا۔ اور اگر......فرض کیا...... ہم چھوڑ بھی دیں تو جناب عالی جائیں گی کہاں؟ یہاں چاروں پاسے جھاڑیوں اور برساتی نالوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے جنگلی جناور بھی ہیں یہاں۔ وہ اتنی سوہنی، مکھن ملائی جیسی کڑی کو دیکھ کر چھوٹے موٹے جناور نہیں رہیں گے، ایک دم چیتے اور ببر شیر بن جائیں گے۔ پھاڑ کھائیں گے آپ کو۔ ویسے بھی آپ کی شکل انڈین ہیروئن سے ملتی ہے اور انڈیا ہمارا پکا دشمن ہے۔" راجا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"مم......میں......پاکستانی ہوں۔"

"پر شکل کا کیا کریں جناب! شکل تو انڈین ہے نا۔" راجا نے ایک بار پھر حریص انداز میں اس کی گردن پر ہاتھ چلایا۔

راجا کی دست درازی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے زخمی جسم اور سنگین حالات کو جیسے ایک دم بھول ہی گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس قماش کا شخص ہے۔ اوپر سے ایک تہائی بوتل کا نشہ بھی تھا اسے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اگلے چند منٹ میں کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ میں نے ایشوریا ثانی اور اس کے "معاملات" میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "گوہر! ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔"

"تو میں کیا کہہ رہا ہوں یار! تم گاڑی چلاؤ۔ میں اس کو سنبھال کر پیچھے بیٹھا رہتا ہوں۔"

"لیکن تمہیں نشہ چڑھا ہوا ہے۔ تم "بیٹھو" گے نہیں۔"

"یار! کیسی کنڈم بات کر رہے ہو تم۔ اتنا بے صبرا نہیں ہوں میں۔ اللہ نے دیا ہے، آرام سے کھائیں گے۔"

جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ میں نے اسے گیئر میں ڈال کر آگے بڑھایا لیکن وہ ایک جھرجھری لے کر خاموش ہو گئی۔ میں نے میٹر چیک کیا۔ فیول موجود تھا، ٹمپریچر بھی ٹھیک ہی تھا...... چابی گھما کر پھر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں ہوئی۔

"ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔ تم اس پری کا دھیان رکھنا۔" راجا بولا اور عقبی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس نے بونٹ اٹھا کر تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی اور پھر بولا۔ "لو اب کرو اسٹارٹ۔"

میں نے پھر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ چند سیکنڈ کے لئے لگا کہ انجن اسٹارٹ ہو رہا ہے مگر پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ راجا نے کہا "لگتا ہے کاربوریٹر میں کچھ مسئلہ ہے۔"

میں نے ٹول باکس نکال کر اسے دیا۔ وہ ماہرانہ انداز میں کاربوریٹر کا ایک حصہ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے گاڑی کے انجن کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں تھا لیکن راجا ماہر لگتا تھا۔ مجھے یاد آیا...... عمران نے اپنی روداد میں بتایا تھا کہ راجا کے پاس جانوروں کو ڈھونے کے لئے ایک نہایت کھٹارا لوڈر ہوا کرتا تھا جس کا نام اس نے پانڈے خان رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے چلاتا رہتا تھا اور ٹھیک بھی کرتا رہتا تھا۔

مگر آج تو راجا بھی فیل ہوا۔ کافی کوشش کے باوجود ہم اس پرانی لینڈ روور کو اسٹارٹ نہ کر سکے۔ اس دوران میں ایشوریا ثانی پچھلی سیٹ پر دبکی بیٹھی رہی۔ میں نے رائفل اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ اس رائفل کی دید ایشوریا کو بے حد محتاط رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ویسے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے زیادہ خطرہ یہی ہے کہ اسے کوئی جانی نقصان نہ پہنچے۔ جہاں تک عزت آبرو کی بات تھی، ایشوریا جیسی لڑکی کو اس کی زیادہ فکر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کوئی بلند پایا فنکارہ نہیں، ایک ایکسٹرا گرل تھی اور ندیم اور سلطان جیسے لوگوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد راجا ہانپا ہوا واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔ وہ پچھلی نشست پر ہی بیٹھا تھا۔ جیپ کی دیوار پر گھونسا مار کر ولا۔ "شکر کرو کہ یہ حرام زادی ان درختوں کے اندر خراب ہوئی ہے۔ کہیں کھلی جگہ پر لمبی لیٹ جاتی تو مسئلہ ہو جانا تھا۔"

"مسئلہ تو اب بھی ہے یار! ابھی ہم موقع سے بہت زیادہ دور نہیں آئے۔ تلاش کرنے والے یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"یار! اگر وہ ریان پارٹی کے لوگ ہوئے تو پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہے...... ہم نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا اور نہ انہوں نے ہمارا بگاڑا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو ہمارے لئے چنگا ہی کیا ہے۔ ہمیں وہاں سے نکلنے کا موقع دیا ہے۔ اگر وہ آ گئے تو ہم یہ پری اپنے پاس رکھ کے یہ گاڑی ان کے حوالے کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"اور اگر وہ جاوے کے لوگ ہوئے تو پھر؟"

"پھر دھن دھنا دھن۔ پر تُو اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے بھالے! مجھے نہیں لگتا کہ جاوے کے لوگ اب دو چار دن سے پہلے سنبھل سکیں گے۔ ابھی تو وہاں وہ بچھی ہو گی...... کیا کہتے ہیں اسے......؟"

"صفِ ماتم۔" میں نے کہا۔

"ہاں......اور تھانے کچہری کا زبردست چکر چل رہا ہو گا۔"

"تو پھر اب کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی اس کو ٹھیک کرنے کی ایک اور کوشش کرتے ہیں۔ نہ ہوا تو پھر رات کو اڑ کیں گے۔ دن دیہاڑے یہاں سے نکلنا تو ایک دم خطرناک ہوگا۔"

راجا کی بات میں وزن تھا۔ یہ جگہ کافی محفوظ تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ گھنی چھاؤں بھی تھی۔ کوئی اکیلا دکیلا آدمی ادھر آ بھی نکلتا تو اسے مطمئن کیا جا سکتا تھا۔ یہ تھور والی جگہ تھی۔ کافی دور تک کھیت دکھائی نہیں دیتے تھے...... بالکل پاس سے ایک سیم نالہ گزر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دن ڈھلنا شروع ہو گیا۔ سائے لمبے ہونے لگے۔ راجا گھونٹ گھونٹ وہسکی پی رہا تھا۔ جیپ کے اندر سے ہی اسے نمکو اور چپس کے دو چار لفافے بھی مل گئے تھے۔ ایک پری پیکر اس کے پہلو میں تھی اور وہ زخمی ہونے کے باوجود خود کو بالکل مطمئن محسوس کر رہا تھا۔

میں اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ میری خواہش تھی کہ کسی صورت عمران سے رابطہ ہو سکے۔ میں اسے اپنی خیریت سے آگاہ کر سکوں اور موجودہ صورتِ حال پر مشورہ بھی حاصل کر سکوں۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی بتا سکوں کہ اس کا کون سا دیرینہ ساتھی میرے ساتھ موجود ہے لیکن سیل فون پر سگنل نہیں آ رہے تھے۔ اگر کسی وقت آتے تھے تو بہت کمزور۔ میں نے سیل فون گھاس میں چھپاتے وقت آف کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کی چارجنگ بہت کم رہ گئی تھی۔

راجا، ایشوریا رائے ثانی (سویٹی) کے ساتھ جڑا بیٹھا تھا اور اس کی کہانی سن رہا تھا۔ یہ کہانی اس طرز کی عام لڑکیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہی باپ کی دوسری شادی...... ماں بیمار، بھائی نشئی، گھر میں فاقے۔ وہ روزگار کی تلاش میں نکلی۔ کسی نے کہا اس کی شکل مشہور فلم ایکٹریس سے ملتی ہے۔ وہ اسے اسٹوڈیو کی روشنیوں میں لے گیا۔ وہ روشنیاں جو اندر سے بہت تاریک ہوتی ہیں...... وہ انہی "تاریک روشنیوں" میں چلتی ہوئی اور کئی خلوتوں سے گزرتی ہوئی سلطان صاحب اور جاوا صاحب تک جا پہنچی۔ پتا نہیں کہ اب ایشوریا کی کہانی میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے بگ باس جاوا صاحب کیا کام کرتے ہیں؟"

وہ بولی۔ "وہ ایک بڑے فلم پروڈیوسر ہیں۔ بالی وڈ میں ان کے بڑے تعلقات ہیں۔ وہ آج کل مشہور انڈین ہیروئنوں کے ڈپلی کیٹ اکٹھے کر رہے ہیں۔ ان ڈپلی کیٹس کو بڑی اچھی

تنخواہ پر ملازم رکھا جائے گا۔ ان کو ٹریننگ بھی دی جائے گی۔"

"کیسی ٹریننگ؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کیمرے کے سامنے آنے کی...... ویسے صحیح پتا تو بمبئی پہنچ کر چلے گا۔"

میں نے کہا۔ "میرے خیال میں تو تمہاری ٹریننگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ ندیم اور سلطان چٹا وغیرہ تمہیں رات دن ٹرینڈ ہی تو کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو بمبئی جا کر تمہیں زیادہ تر "یہی کام" کرنا ہوگا۔

وہ چپ رہی۔ راجا نے نشیلے انداز میں اس کے رخساروں پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

"سوہنیو! اور کتنی کڑیاں آپ کے ساتھ یہ تالیم (تعلیم) حاصل کر رہی ہیں؟"

"چھ سات ہیں۔"

"ان سب کی شکل کسی ایکٹریس سے ملتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

ایشوریا نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ گردن جھکا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ دائیں رخ سے واقعی ایشوریا رائے ہی نظر آتی تھی۔

راجا اس پر فدا ہوا جا رہا تھا۔ شراب بھی کام دکھا رہی تھیں اگر میں یہاں موجود نہ ہوتا تو وہ کب کا کپڑوں سے باہر ہو چکا ہوتا۔ یوں تو اب بھی اس کے جسم پر کپڑے برائے نام ہی تھے۔ اس کی شرٹ تو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہی تار تار ہو گئی تھی۔ پتلون کا ایک پائنچا بھی وہیں پر لیر و لیر ہو گیا تھا۔ اپنی سوجی ہوئی نیلی آنکھ اور زخمی چہرے کے ساتھ وہ کسی حد تک مضحکہ خیز بھی نظر آتا تھا۔ وہ مجھے ابھی تک اپنا نام گوہر ہی بتا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام تابش بتایا تھا۔ اگر یہ ہوش ربا لڑکی ہمارے درمیان موجود نہ ہوتی تو شاید ہم اب تک ایک دوسرے کو اپنی سچی جھوٹی کہانی سنا چکے ہوتے۔ لیکن اس خوبرو لڑکی نے راجا کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی اور اسے غالباً اس کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے عمو کا ذکر بھی مؤخر کیا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کا خوف بھی اب کافی حد تک دور ہو گیا ہے۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی جان کو یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے راجا کو اپنی "خوب شکلی" کا کچھ خراج دینا پڑے گا۔ راجا اور ایشوریا ثانی کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی، اس سے مجھے ایک دو باتوں کا مزید پتا چلا۔ اندازہ ہوا کہ راجا انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں واقعی بلڈاگ اور ہاؤنڈ کتوں کی ٹریننگ کے لئے موجود تھا۔ تاہم اس دوران میں اس نے اپنی عادت کے مطابق کوئی ہینگی پھنگی کی تھی غالباً کوئی قیمتی شے چوری کی۔ اس چوری

کے دوران میں اس کے چاقو سے ایک شخص شدید زخمی ہوا جس کے بعد جاوا کے لوگوں نے اسے پکڑ کر اور مار پیٹ کر تہ خانے میں ڈال دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شام ہوگئی۔ اس جھنڈ کے اندر تاریکی پھیلنے لگی۔ لیکن یہ تاریکی توقع سے کچھ زیادہ تھی۔ میں نے درختوں سے باہر نکل کر دیکھا۔ گہرے بادل چھا گئے تھے اور مزید گہرے ہو رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بارش بھی ہونے لگی۔ بڑے زور کا تریڑا پڑنے لگا۔

راجا نے مسرور ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں نشست پر پھیلائے اور بولا۔ ”چلو یہ ڈر بھی ختم ہوا کہ کوئی گڈی کے پہیوں کے نشان دیکھتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اب ہم وہ بجا سکتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے......؟“

”چین کی بانسری۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”ہاں......چین کی بانسری۔“ اس نے معنی خیز انداز میں ایشوریا رائے ثانی کو دیکھا۔

بارش تیز تھی اور تواتر سے برس رہی تھی۔ درختوں کے ہیولے جھومتے تھے اور ان کے درمیان رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔ راجا نے ترنگ میں آ کر سرائیکی انداز کا ایک گیت گنگنا شروع کر دیا۔ اس کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ شراب ہے، بارش بھی ہے اور محبوب بھی۔ بوتل اور پیالے کی کھن کھن، بارش کی رم جھم اور چوڑیوں کی چھن چھن آپس میں رل مل گئی تھی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان آوازوں کی لے پر ناچنا شروع کر دوں۔

رات نو بجے کے لگ بھگ میرے سیل فون کی بیٹری یکسر ختم ہوگئی اور میں نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر اسے ایک طرف رکھ دیا کل کی تقریباً ساری رات بھی ہنگامہ خیزی کی نذر ہوئی تھی۔ جسم زخموں اور تھکن سے چُور تھا۔ میں نے نشست کو اسٹریچ کیا اور نیم دراز ہو گیا۔ بارش ختم ہونے کے بعد ہی ہم جیپ سے نکل سکتے تھے اور کسی طرف روانہ ہو سکتے تھے۔ ابھی تک ہم یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ ہمیں ایشوریا رائے کو اپنے ساتھ رکھنا ہے یا باندھ کر یہیں لینڈ روور کے اندر چھوڑ جانا ہے۔ ایسی فیشن ایبل خوبرو لڑکی کو ساتھ رکھنے میں یہ نقصان تھا کہ راستے میں کوئی بھی ہم پر شبہ کر سکتا تھا۔ کسی پولیس ناکے پر بھی ہمیں خواہ مخواہ روکا جا سکتا تھا یا وہ خود پولیس کو یا عام لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ جاوا گروپ کے لوگوں نے ایشوریا ثانی کی گمشدگی کے حوالے سے کوئی رپورٹ وغیرہ بھی درج کرا رکھی ہو۔ مگر اس کو ساتھ رکھنے میں یہ فائدہ تھا کہ اگر کہیں جاوا گروپ کے لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا تو ہم ایشوریا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ان پر کچھ دباؤ ڈال سکتے تھے۔

میں اونگھنے لگا تو راجا نے کہا۔ ”چلو تم کچھ دیر آرام کر لو۔ میں جاگتا ہوں۔ پھر میں آنکھ

لگا لوں گا اور تم پہرے داری کرنا۔“

راجا کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ میری غنودگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ثروت کی گمشدہ مہک، میرے آس پاس بکھری گئی۔ اس مہک میں معصوم بالو کے جسم کی مہک بھی شامل ہوگئی۔ ایک مہک نے جیسے دوسری مہک کو اپنی گود میں لے لیا۔ میں ان دونوں مہکاروں کا پیچھا کرتے کرتے سو گیا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی دیر سوؤں گا۔ تھکاوٹ اور رت جگے نے کام دکھایا تھا۔ ایک پہلو سن ہو گیا تھا شاید...... میں نے نشست پر پہلو بدلا تو آنکھ کھل گئی۔ بارش دھیمی ہوگئی تھی لیکن برس رہی تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ راجا جیپ میں موجود نہیں ہے اور غالباً ایشوریا رائے بھی نہیں تھی۔

میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ جیپ کی اندرونی روشنی آن کر کے پیچھے دیکھا۔ عقبی نشستیں بالکل خالی تھیں۔ رائفل بھی نظر نہیں آئی۔ تو کیا راجا، ایشوریا کو لے کر نکل گیا تھا؟ اس نے دھوکا دیا تھا؟ میں دروازہ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک چند قدم کے فاصلے پر شاخوں اور پتوں کے اندر سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ وہاں تاریکی میں کوئی موجود تھا۔ شاید راجا اور ایشوریا...... یا پھر کوئی جانور؟ یا کوئی غیر متعلقہ شخص؟ کئی سوال ایک ساتھ میرے ذہن میں ابھرے۔

لیکن مجھے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ ہریالی کے اندر سے دبی دبی نسوانی ہنسی سنائی دی۔ یہ یقیناً ایشوریا کی ہنسی تھی۔ اس کے ساتھ ہی راجا کی بہکی ہوئی آواز ابھری۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ پیراشوٹ کا ایک بڑا غلاف بھی جیپ کی پچھلی نشست پر موجود نہیں ہے۔ یہ جیپ کا غلاف تھا اور اب ان دونوں کے بچھونے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں راجا پر لعنت ارسال کی اور نشست پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

تین چار منٹ بعد اندازہ ہوا کہ راجا اور ایشوریا ثانی جیپ کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ میں سویا بنا رہا۔ وہ دبے پاؤں آئے۔ بڑے آرام سے پچھلا دروازہ کھولا اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے اندر آ گئے۔ راجے نے ایشوریا کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ جواباً اس نے بھی کچھ کہا۔ ایشوریا کے گیلے بالوں کے کچھ چھینٹے میرے چہرے پر بھی پڑے لیکن میں نے آنکھیں بند رکھیں اور ان دونوں کے لیے خجل ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔

......راجا واقعی ایک نمبر کا خرانٹ اور چال باز تھا۔ جو جیپ کل سہ پہر کو کسی بھی طرح

اسٹارٹ نہیں ہو پا رہی تھی، وہ رات پچھلے پہر کو راجے کی تھوڑی سی کوشش سے اسٹارٹ ہوگئی۔ میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ کل سہ پہر راجا کی نیت ہی خراب تھی۔ وہ درختوں کے اس جھنڈ سے نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال، میں نے اس پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔

بارش اب ایک دھیمی پھوار کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں کے اس جھنڈ سے نکلے اور سیم نالے کے ساتھ ساتھ چلتے مشرق کی طرف بڑھنے لگے۔ اونچے نیچے راستے پر جیپ کی لائٹس مسلسل ہچکولے کھا رہی تھیں۔ یہ چھوٹی لائٹس تھیں۔ ہیڈ لائٹس تو اس وقت ہی ٹوٹ گئی تھیں جب ریان گروپ کی اس جیپ نے کوٹھی کا گیٹ توڑا تھا۔

''اب اس تمہاری شہزادی کیا کرنا ہے؟'' میں نے راجے سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ کسی مناسب جگہ پر اسے گڈی سے اتار دیتے ہیں اور سلاماں لیکم کہہ دیتے ہیں۔''

''لیکن اسے ''پھر'' کوئی جانور شانور پڑ گیا ہو تو؟'' میں نے کہا۔ میرے فقرے میں ''پھر'' کے لفظ پر شاید راجا نے زیادہ غور نہیں کیا۔

وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں، اب تو تھوڑی دیر میں سویرا ہو جانی ہے۔''

''یا پھر اسے اس جگہ چھوڑ دیں جہاں گاڑی چھوڑنی ہے۔ یہ گاڑی کے اندر ہی رہے۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' راجا نے تائید کی۔

قریباً پانچ کلومیٹر سفر طے کرنے کے بعد ہم شیخوپورہ سے لاہور جانے والی بڑی سڑک کے قریب پہنچ گئے۔ اب اس مسروقہ جیپ کو اس سے آگے لے جانا خود کو شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ ہم نے جیپ ایک قریبی گاؤں کے نواح میں درختوں کے درمیان کھڑی کی۔ راجا کی نگاہوں میں ابھی تک ایشوریا کے لئے حریصانہ چمک تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس مصیبت کو اس سے آگے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

وہ اس سے بولا۔ ''سوہنیو تے مکھنو! زیادہ گھبرانا نہیں۔ گڈی کے اندر آرام سکون سے بیٹھو۔ سویرا ہوتے ہی لوگ تمہیں یہاں سے نکال لیں گے۔''

''تو تم لوگ دروازے کو لاک کر کے جاؤ گے؟'' وہ روہانسی ہوگئی۔

میں نے کہا۔ ''اگر دروازوں کو لاک نہ کریں گے تو خود لاک اَپ میں بند ہو جائیں گے۔''

''لیکن میں نکلوں گی کیسے؟''

راجا بولا۔ ''کوئی اللہ کا بندہ اِٹ مار کر شیشہ توڑ دے گا۔ میں نے کہا ہے نا گھبرانے کی

بات نہیں اور یہ آخری ملاقات نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو پھر کہیں نا کہیں ٹاکرا ہو جائے گا ہمارا۔''

ہم نے پہلے ہی اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ گاڑی میں کوئی ایسی شے موجود نہ ہو جس کو استعمال کر کے یہ لڑکی کوئی شیشہ توڑ سکے۔ اس گاڑی میں یہ آپشن موجود تھا کہ دروازوں کو باہر سے لاک کر دیا جائے تو وہ اندر سے نہ کھل سکیں۔

گاڑی کا پیراشوٹ کا لمبا چوڑا غلاف ایک بار پھر ہمارے کام آیا۔ ہم نے بلیڈ کی مدد سے اس کے دو ٹکڑے کئے اور ان ٹکڑوں کو برساتی کی طرح اوڑھ لیا۔ جیپ کے دروازے بند کرنے کے بعد راجا نے ایشوریا رائے کو الوداعی آنکھ ماری لیکن اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی۔ جو آنکھ اس نے دبائی تھی وہ تو پہلے ہی سوجن کی وجہ سے بند تھی۔

ہم ہلکی پھوار میں کیچڑ زدہ زمین پر سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ رائفل راجا نے اپنی برساتی میں چھپائی ہوئی تھی۔ ان برساتیوں نے ہمارے بہت سے عیب ڈھک لئے تھے۔ ہماری نیم عریانی، ہمارے خون آلود کپڑے، ہمارے زخم...... حتیٰ کہ بوقتِ ضرورت ہم ان سے اپنے ننگے پاؤں بھی ڈھک سکتے تھے۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں بمشکل لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

ہم سڑک تک پہنچنے کے لئے چھوٹی پگڈنڈیاں استعمال کر رہے تھے۔ بس پر تو ہم بیٹھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے پھر حلیہ بھی مشکوک تھا۔ بہتر تھا کہ کوئی رکشا ٹیکسی مل جاتا۔ لاہور اور گرد ونواح میں ان دنوں ٹیکسیاں کم کم ہی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن ایک بہت اچھا اتفاق ہوا کہ ابھی ہمیں سڑک کے کنارے کھڑے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک پیلے رنگ کی مہران ٹیکسی نظر آ گئی۔ ہمارے اشارے پر وہ رک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر ڈرائیور سے لاہور تک کا کرایہ طے کیا۔ ہم سوار ہو گئے۔ میں اگلی سیٹ پر اور راجا پچھلی پر چلا گیا۔

ڈرائیور گاہے بگاہے میرے چہرے کی چوٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس بات پر بھی الجھا ہوا تھا کہ ہم نے ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے باوجود ''برساتیاں'' اپنے جسم سے جدا نہیں کی تھیں۔ بہر طور اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی الجھن دیکھ کر میں نے خود کہا۔ ''ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا بھائی صاحب! ٹریکٹر ٹرالی الٹ گئی تھی۔ آٹھ دس بندے زخمی ہوئے تھے۔ دو چار کو تو کافی چوٹیں آئی ہیں۔ میری ٹانگ بھی کافی زخمی ہے۔ مرہم پٹی کے لئے لاہور کے وڈے اسپتال جا رہے ہیں۔''

راجا نے راستے میں ہی مجھے بتا دیا تھا کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔ اچھرہ موڑ کے قریب ایک لالہ زار نامی درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ اس کا مالک جو منیجر بھی تھا، راجا کا راز داں دوست تھا۔ راجا کو پتا تھا کہ وہ ہمارے حلیے کی پروا کئے بغیر نہ صرف ہمیں کمرا دے گا بلکہ حلیہ درست کرنے کے لئے فوری انتظام بھی کر دے گا۔ میں جلد از جلد عمران سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اب سیل فون کے سگنل تو یقیناً آ رہے تھے لیکن بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب ہوٹل پہنچ کر ہی رابطہ کروں گا۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب ہم شہر زندہ دلاں لاہور میں داخل ہوئے۔ ابھی یہ شہر اپنے زندہ دلانوں، اپنی رونقوں، رنگینیوں اور ہنگاموں سمیت سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے انگڑائی لینی تھی اور اپنی حشر سامانیوں سمیت جاگ جانا تھا۔ یہ بڑا اچھا وقت تھا۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہو رہی تھی۔ مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کے میناروں کی بلندیاں ہولے ہولے نمایاں ہو رہی تھیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ناکوں پر شہریوں کو رات بھر تنگ کرنے والی پولیس اپنی حرکتوں سے باز آ جاتی ہے اور تھانوں کا رخ کر لیتی ہے۔ ہم بھی کسی چیکنگ کی زد میں آئے بغیر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ایک چھوٹی سڑک پر لالہ زار ہوٹل کی تین منزلہ عمارت تھی۔ مالک منیجر اشفاق رانا ایک کمرے میں سویا پڑا تھا۔ چوکیدار نے اسے جگایا۔ چوکیدار بھی غالباً راجا کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد تیس پینتیس سال کا ایک فربہ اندام شخص توند مٹکاتا اور آنکھیں ملتا ہمارے سامنے تھا۔ اس کے بدن پر بس بنیان اور شلوار نظر آ رہی تھی۔

اس نے راجا کو راجے کہہ کر مخاطب کیا اور تپاک سے ملا۔ ساتھ ساتھ وہ میرے اور راجا کے زخمی حلیے پر فکرمند بھی تھا۔ راجا اور وہ کمرے میں چلے گئے۔ میں وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور زخمی ٹانگ اٹھا کر دوسرے صوفے پر رکھ دی۔ برساتی نما کپڑا ابھی تک میرے جسم پر تھا۔ میرے ننگے پاؤں دیکھ کر چوکیدار کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی دوران میں ہوٹل کے ایک دوسرے ملازم نے باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کر دیا۔

میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ میں بس بستر پر گر کر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ایک بار عمران سے رابطے کی کوشش بھی کرنا چاہتا تھا۔ فون سیٹ قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے چوکیدار کو بتایا کہ ایک کال کرنی ہے۔ اس نے فون میرے قریب تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ عمران کا نمبر ڈائل کیا۔ رنگ ٹون کے طور پر اس کے سیل فون پر بڑا اوٹ پٹانگ میوزک سنائی دیا کرتا تھا۔ اب آواز آ رہی تھی، اُڈی اُڈی جاواں ہوا

دے نال۔ کافی دیر تک یہ آواز میرے کانوں کے پردے مجروح کرتی رہی پھر میں نے کوشش ترک کر دی۔ غالب گمان یہ تھا کہ اس وقت وہ Zoo کے قریب اپنے اپارٹمنٹ میں سو رہا ہو گا۔ لیکن اندیشے بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ آج تیسرا چوتھا دن تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔

اسی دوران میں راجا اور اشفاق رانا کمرے سے نکل آئے۔ گراؤنڈ فلور پر ہی ہمارے لئے ایک آرام دہ کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اشفاق ایک میڈیکل باکس لے آیا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ اس کے علاوہ درد کش دوائیں بھی موجود تھیں۔ اشفاق نے ہمارے لئے کپڑوں کے تین چار جوڑے بھی مہیا کر دیئے تاکہ ہم ان میں سے اپنے ناپ کے مطابق استعمال کر سکیں۔

یہ جان کر راجا حیران ہوا کہ میں اپنے زخموں کو خاطر میں لائے بغیر نہانا چاہتا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میری تکلیف میں اضافہ ہو گا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ میرے لئے تکلیف اور راحت کی حدیں کبھی کبھی آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ میں نے اطمینان سے شاور کیا۔ بعد میں تولیے سے جسم کو اچھی طرح خشک کیا۔ یہ اور بات ہے کہ تولیے پر جگہ جگہ خون کے دھبے آ گئے۔ میرے سارے پنڈے پر چمڑے کی بیلٹس کے نشان موجود تھے۔ جہاں جہاں اسٹیل کے بکل لگے تھے، وہاں وہاں خون کا رساؤ تھا۔ میں نے خود بھی تھوڑی بہت مرہم پٹی بھی کی۔ درد کش دوائیں میں نے بہت عرصہ پہلے چھوڑ دی تھیں۔ اب بھی اسی اصول پر عمل کیا۔ جیکی کہا کرتا تھا کہ درد تو ایک نعمت ہے اور یہ دبانے کے لئے نہیں سہنے کے لئے ہوتا ہے۔ راجا گاہے بگاہے حیرت سے میری طرف دیکھتا تھا اور جیسے دل ہی دل میں میری برداشت کا معترف ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میری ٹانگ میں فریکچر ہو چکا ہے اور مجھے چلنا پھرنا نہیں چاہئے۔ مگر ایسی اذیتوں اور ایسے اندیشوں سے لڑ کر میری عجیب سی تسکین ہوتی تھی۔

پُرتکلف لاہوری ناشتا ہمارے کمرے میں پہنچ گیا۔ پوڑی، آلو اور اچار والے گرما گرم چنے، سرخی مائل حلوہ، نہاری اور کلچے...... اور اس کے ساتھ میٹھی و نمکین لسی۔ بڑی اشتہا آمیز خوشبو تھی۔ میرا جبڑا اکڑا ہوا تھا تاہم میں نے آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ آدھا ناشتا میں نے بڑی رغبت سے کیا لیکن پھر ایک دم کچھ یاد آ گیا۔ ایک بو سی دماغ میں گھسنے لگی اور میں نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ فتح محمد کی لاش کی بو تھی۔ وہ لاش جو کئی گھنٹے تک میرے جسم سے لپٹی رہی تھی اور میری ہر سانس کے ساتھ میرے دل و دماغ میں سرایت کرتی رہی تھی۔

میں کبیدہ خاطر ہو کر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ کل صبح اور پرسوں رات کے

سارے خوں ریز مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ خونخوار کتوں کا وہی کی خوشبو پر دیوانہ وار جھپٹنا۔ میرے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ان کی شعلہ بار آنکھیں۔ گارڈ اکرم خاں کو گولی لگنا اور اس کا ڈکراتے ہوئے اوندھے منہ گرنا۔ گاڑی کے اندر گھسنے والے ریان گروپ کے بندے پر سدھائے ہوئے بلڈاگ کا جھپٹنا اور اس کا پیٹ پھاڑ دینا۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔

تھکن، رت جگے اور ایشوریا کے سرور سے چور راجا بھی بستر پر لیٹ گیا۔ اس پر تیزی سے غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”گوہر! یہ کیا چکر ہے؟ تمہارا یہ دوست اشفاق رانا تمہیں راجا کہہ کر بلا رہا تھا۔“

”ہاں...... کک...... کچھ یار دوست اس نام سے بھی بلاتے ہیں۔“

”یعنی تمہارا اصل نام گوہر ہے؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بس ”ہوں“ کہنے پر اکتفا کیا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

میں نے ایک دو فقرے اور بولے لیکن اسی دوران میں وہ سو گیا۔ یہ موقع تھا کہ میں ایک بار پھر عمران سے رابطے کی کوشش کرتا۔ میں لنگڑاتا ہوا باہر نکلا اور اپنے مردہ سیل فون کے لئے چارجر کا انتظام کیا۔

پانچ دس منٹ بعد میں ایک بار پھر عمران سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کمرے کے باتھ روم میں تھا اور دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میری سماعت عمران کی آواز سننے کے لئے بے قرار تھی لیکن وہاں وہی بے ڈھنگی صدا تھی...... اُڈی اُڈی جانواں ہوا دے نال۔ میں دانت پیسنے لگا۔ کبھی اس پر غصہ آتا تھا، کبھی دل و دماغ میں اندیشے اودھم مچانے لگتے تھے۔

میری چوتھی، پانچویں کوشش پر عمران کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً کمرے سے باہر تھا اور دوڑتا ہوا فون تک پہنچا تھا۔ ”ہیلو تابی!“ وہ بڑی بے تابی سے بولا۔

”ہیلو...... عمران...... تم...... ٹھیک تو ہو نا؟“

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم بتاؤ...... یہ کیا خوفناک ڈرامے کر رہے ہو تم؟ پچھلے دو تین دنوں میں کوئی ایک ہزار بار تو تمہارا نمبر ملایا ہوگا۔ کوئی جواب نہیں، کوئی خبر نہیں۔ اس وقت کہاں ہو تم؟ جلدی سے بتاؤ۔“ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”اب جلدی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آرام سے بات کر سکتے ہو۔ میں خیریت سے ہوں اور لاہور کے ایک ہوٹل میں ہوں۔ لالہ زار نام ہے ہوٹل کا۔ اور تم کہاں ہو؟“

وہ میرے سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ”کس جگہ ہے یہ ہوٹل؟“

”اچھرہ کے علاقے میں۔ آسانی سے مل جائے گا۔ اور اب گھبرانے کی بات نہیں، میں اب یہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی فارم ہاؤس سے روانہ ہو رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤں گا تمہارے پاس۔ تم اب اپنا فون آن رکھنا۔“

”لیکن یار میں نے کیا بکواس کی تھی تم سے۔ تم نے ابھی فارم سے باہر نہیں نکلنا...... جاوا کے درجنوں کارندے اور گاڑیاں فارم کے آس پاس ہیں۔ گھیرا ڈالا ہوا ہے انہوں نے...... یہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے عمران!“

”ہاں آگے بڑھ چکی ہے۔ لیکن جہاں تک تم سوچ رہے ہو، وہاں سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ یہاں فارم ہاؤس کے قریب کافی بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔ چار چھ لاشیں بھی گر گئی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

”ریان صاحب اور جاوا گروپ کے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرائے ہیں۔ کئی گھنٹے تک گولیاں چلی ہیں۔ دونوں طرف کے بہت سے بندے پکڑے بھی گئے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب خود شیخوپورہ آ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پورے علاقے میں پولیس گشت کر رہی ہے۔“

یہ بات پہلے ہی میرے ذہن میں آ رہی تھی کہ شاید کل صبح انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں میں جو سخت لڑائی ہوئی ہے، اس کی کوئی تازہ وجہ بھی ہے۔

عمران اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم گھبراؤ مت۔ اب فارم ہاؤس سے باہر نکلنے میں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی میں پورے حفاظتی انتظام کے ساتھ نکلوں گا۔“

”کیا حفاظتی انتظام ہوگا؟“

”یار! تیرے جیسے پانچ چھ جاں نثار مجاہد ساتھ ہوں گے۔ ویسے بھی روانگی خفیہ ہوگی۔“

اس نے مجھے ہر طرح سے تسلی دی۔

میں نے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے آ جاؤ۔ یہاں میرے پاس تمہارے لئے کچھ اہم خبریں ہیں اور ایک سرپرائز بھی ہے۔“

”کیا سرپرائز؟“

”ایک پرانے دوست سے تمہاری ملاقات کرانے والا ہوں۔“

"اچھا ٹھیک ہے لیکن تم بالکل خیریت سے تو ہو نا......اور وہ فتح محمد...... کیا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ "تمہارے پہلے سوال کا جواب ہاں میں ہے اور دوسرے کا نہیں میں۔"

"کیا مطلب؟ فتح محمد ساتھ نہیں؟"

"وہ ساتھ تھا لیکن اب نہیں رہا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"اوہ گاڈ۔" عمران نے گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ ہمارے درمیان گفتگو ختم ہوئی اور میں نے بستر پر لیٹ کر عمران کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ کچھ ایسی ایسوسی ایشن ہو چکی تھی کہ چند دن دور رہنے سے بھی ایک خلا سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور شخص اپنے اردگرد کی ہر شے کو زندگی اور توانائی سے بھر دیتا تھا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد عمران لالہ زار ہوٹل میں موجود تھا۔ میں نے مالک منیجر اشفاق رانا کو اس کی آمد کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ عمران کو ہمارے کمرے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے قدموں کی چاپ سے ہی اندازہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "آ جاؤ، دروازہ کھلا ہے۔"

وہ آیا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے خود کو مجھ سے دور کیا اور سرتاپا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ "یہ کیا کیا ہے تم نے اپنے ساتھ؟" اس کی آواز میں درد تھا۔

"کچھ نہیں بس درد سہنے کی تھوڑی سی پریکٹس کی ہے۔"

"اوئے خبیث! یہ تھوڑی سی ہے۔ اتنی پریکٹس کوئی ہاکی میں کرے تو میاں داد بن جائے اور کرکٹ میں کرے تو سمیع اللہ بن جائے۔"

"تمہاری دونوں باتیں غلط ہیں۔" میں مسکرایا۔

"لیکن تم کون سی صحیح بات کہہ رہے ہو...... کہ تھوڑی سی پریکٹس ہے۔ ویری سیڈ یار! بہت افسوس ہوا ہے۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ دو چار دن فارم سے نہیں نکلنا۔ لگتا ہے کہ میری ہر بات کا الٹا اثر ہونے لگا ہے تم پر......"

اسی دوران میں اس کی نگاہ راجا والے بیڈ پر پڑی۔ وہ کروٹ بدلے سویا پڑا تھا۔ "یہ کون ہے؟" عمران نے چونک کر دبی آواز میں پوچھا۔

"سرپرائز۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"ذرا آگے جا کر دیکھو۔ شاید پہچان لو۔" میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

عمران پُرتجسس انداز میں آگے بڑھا۔ راجا کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ جیسے تھے۔ تھوڑی سی کوشش سے عمران نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا، تب دوبارہ راجے کو دیکھنے لگا۔

"کیسا ہے سرپرائز؟" میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"زبردست۔" اس نے سرسراتی آواز میں کہا پھر مجھے کمرے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں راجا کو سوتا چھوڑ کر باہر آ گئے۔ عقبی صحن میں جا کر عمران پُرجوش انداز میں بولا۔ "یہ بلا کہاں سے ملی تمہیں؟ اور تم نے اسے پہچانا کیسے؟"

"سلطان چٹے کی کوٹھی سے ملی اور پہنچا اس طرح...... کہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔"

"یہ تو جیل میں تھا۔ سلطان کی کوٹھی میں کیسے پہنچا؟"

"ابھی اس نے براہِ راست تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال، یہ سلطان اور ندیم کی ایک ملازمہ لڑکی سے باتیں کرتا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ قید کاٹ کر باہر آ چکا ہے اور شکاری اور رکھوالی والے کتوں کو ٹریننگ دینے کے لئے سلطان اور ندیم کے پاس موجود تھا۔"

ندیم کے ذکر پر عمران ذرا چونکا۔ "یہ کس ندیم کی بات کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"سیکرٹری ندیم کی۔ تمہارے لئے ایک اہم خبر یہ ہے کہ ندیم، جاوا کے لوگوں سے ملا ہوا ہے۔ سمجھو کہ اب وہ جاوا گروپ کا حصہ ہے۔ وہ فارم ہاؤس کی وہی بڑی کالی بھیڑ ہے جسے ہم ڈھونڈ رہے تھے۔ اس نے جلالی صاحب کے قریب رہ کر انہیں زبردست نقصان پہنچایا ہے۔"

عمران نے اپنے ہونٹ تشویش ناک انداز میں سکیڑے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم فتح محمد پر شبہ کرتے رہے ہیں لیکن وہ ہمارے شبہے کے برعکس نکلا۔ اسے ندیم کی ایک دو کارستانیاں معلوم ہوئی تھیں اور وہ اس کے بارے میں پریشان تھا۔ ندیم کی حقیقت پتا کرنے کے لئے ہی وہ منگل کی رات فارم ہاؤس سے نکلا تھا...... بس اس کی موت اسے کھینچ کر انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں لے گئی۔"

"کیا ہوا اس کے ساتھ؟"

میں نے عمران کو کوٹھی میں پیش آنے والے گھمبیر واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت میں گم سنتا رہا۔ وہاں تہ خانے میں زخمی فتح محمد کو جس سفاکی سے گولی ماری گئی تھی، وہ نقشہ ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

پوری روداد سننے کے بعد عمران نے ایک لمبی سانس لی اور اس کے چہرے کو سنجیدگی نے ڈھانپ لیا، وہ بولا۔ ''تمہاری وہ فون کال بڑی پریشان کن تھی۔ آخری دو تین لفظ تو میری سمجھ میں نہیں آ سکے لیکن اتنا پتا تو چل گیا کہ فارم کے باہر خطرہ ہے اور تم مجھے باہر نکلنے سے منع کر رہے ہو۔ اس کے بعد میں نے اس فون نمبر پر درجنوں بار کال کی لیکن فون بند تھا۔ تمہارے نمبر پر بھی بڑی کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ تمہاری یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ نادرے وغیرہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے جاوا کے لوگوں نے فارم کے اردگرد گھات لگائی ہے۔ ابھی میں اس معاملے سے نمٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ پتا چلا کہ فارم سے کوئی ایک کلومیٹر دور نہر کی طرف جاوا اور ریان گروپ کے لوگوں کے درمیان چھوٹی سی جھڑپ ہوئی ہے جس میں دو بندے زخمی ہوئے ہیں۔ ابھی اس جھڑپ کی ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اگلے روز شام کے وقت دونوں گروپوں میں زوردار تصادم ہو گیا۔ دونوں طرف کے لوگوں نے باقاعدہ پوزیشنیں لے کر ایک دوجے پر دو گھنٹے تک اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ پانچ کے قریب بندے جان سے گئے۔ کافی تعداد میں زخمی بھی ہیں۔ اس کے بعد پولیس کی بھاری نفری موقع پر پہنچ گئی۔ کئی اعلیٰ افسر بھی آ موجود ہوئے۔ جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ صاحب نے تو وہاں مستقل ڈیرا لگایا ہوا ہے۔ فارم کے اردگرد کرفیو کا سماں ہے۔ میڈیا میں بھی گرم گرم خبریں آ رہی ہیں۔ باکس اور آرا کوئے والا معاملہ بھی زیر بحث ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب یہ معاملہ مزید بگڑے گا۔ بڑی بڑی مچھلیاں بھی اس معاملے میں ملوث ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے آرا کوئے کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے جلالی صاحب پر دباؤ ڈالا جائے۔''

''تو کیا جلالی صاحب یہ دباؤ لے لیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''بابا جی ہیں تو بڑے پکے۔ اندر سے ایک دم لوہے کی طرح ہیں لیکن زیادہ سخت لوہا بھی تو کبھی کبھی ایک دم ٹوٹ جاتا ہے۔'' عمران نے رمزیہ انداز میں کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''بابا جی کی ایک کمزوری کم از کم ہمارے علم میں تو آ چکی ہے...... ڈاکٹر مہناز اور بابا جی کا تعلق...... اور یہ بہت بڑی کمزوری ہے جگر۔ اس کمزوری نے بڑے بڑے معرکے سر کرائے

ہیں۔ دنیا کے نقشے بدلے ہیں، تاریخ کا رخ پھیرا ہے۔''

''تو پھر؟''

''مجھے لگتا ہے کہ اب جلالی صاحب کی اس کمزوری کو استعمال کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔ ان کا بھی اور دوسروں کا بھی۔''

''کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''ابھی پوری طرح طے نہیں کیا۔ سوچ رہا ہوں لیکن......''

''لیکن کیا؟''

عمران نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم نے میری سوچ کو درہم برہم کر دیا ہے۔ یہ کس بلا کو اپنے ساتھ چھوڑ لائے ہو۔'' اس کا اشارہ راجا کی طرف تھا۔

''لیکن یہ تو تمہارا دوست ہے اور اچھے برے وقت میں کام آتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے اور مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اسے دیکھ کر اور اپنے مزاج کا بندہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی چند دن ہمیں اس سے دور ہی رہنا چاہئے۔''

اچانک ایک آہٹ نے ہمیں چونکایا۔ مڑ کر دیکھا تو راہداری میں ہم سے آٹھ دس قدم دور راجا کھڑا تھا۔ شرٹ اس کے جسم پر کچھ ڈھیلی تھی۔ اپنی اکلوتی سلامت آنکھ کے ساتھ وہ عمران کو گھورتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ اس کے پاؤں میں ہوٹل کی چپل نظر آ رہی تھی۔

عمران نے بھی اسے دیکھ لیا۔ کچھ دیر تک دونوں ساکت و جامد کھڑے رہے پھر لپک کر ایک دوسرے کو لپٹ گئے۔ یہ پُرجوش ملاپ تھا۔ راجا نے عمران کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''اوئے عمو! تُو کہاں غائب ہو گیا تھا کھوتے کے سر سے سینگوں کی طرح؟ پورا ایک سال ہو گیا ہے مجھے باہر آئے ہوئے۔ کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرا ہوں تجھے۔''

''میں نے بھی انڈیا سے آتے ہی جان انکل سے تیرے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ نو دس مہینے پہلے راجا آیا تھا۔ اپنا فون نمبر بھی دے گیا تھا لیکن وہ فون نمبر جان محمد صاحب سے کہیں گم ہو چکا تھا......''

''تُو بڑا کھوچل ہو گیا ہے عمو۔ ایک دم کنڈم بات کر رہا ہے۔ اگر تُو نے مجھ سے رابطہ کرنا ہوتا تو اس کے اِک سو اِک طریقے تھے۔''

''تجھے کیا بتاؤں راجا! یہاں آتے ہی ایسا چکر چلا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی مہینے سے آسے پاسے کی کچھ خبر ہی نہیں رہی۔''

میں نے کہا۔ ”کیا ساری باتیں یہیں کرلینی ہیں۔ اندر چلو یار! آرام سے بیٹھتے ہیں۔“

ہم تینوں کمرے میں آگئے۔ میں ابھی تک بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ اندر پہنچ کر ایک بار پھر راجا اور عمران میں زوردار مکالمہ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے شکوے شکایت کئے۔ راجا کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ عمران وہاں انڈیا میں کس ماں کے پاس گیا تھا۔

عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”ماں نہیں باپ ہے اور تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ جس طرح تم اپنے جگر ہو، یہ بھی جگر ہے۔ یہ وہاں ایک بڑے پھڈے میں پھنس گیا تھا۔“

اس خیال سے کہ عمران اور راجا ایک دوسرے سے کھل کر بات کر سکیں اور ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا سکیں، میں بہانے سے باہر نکلا اور اپنی زخمی ٹانگ کو چالو کرنے کے لئے برآمدہ نما جگہ پر ٹہلنے لگا۔ جسم کے کسی حصے میں زیادہ تکلیف ہو تو جسم کی باقی تکلیفیں اس میں دب جاتی ہیں۔ ٹانگ کی وجہ سے میری دیگر جسمانی چوٹیں نہ ہونے کے برابر محسوس ہو رہی تھیں حالانکہ اپنی جگہ وہ بھی شدید تھیں۔ برآمدے میں بلی کے دو خوب صورت بچے گھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے فارم ہاؤس کے وہ نایاب ایرانی بلونگڑے یاد آ گئے جنہوں نے وہاں Zoo کی رونق کو دوبالا کیا تھا......اور ان کی ماں بھی یاد آئی۔ اس نے عمران کے ساتھ بے مثال وابستگی پیدا کر لی تھی۔ اسی وابستگی کی وجہ سے ہم سلطان چنا کے ڈیرے پر نادر لمبو کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

میرے سیل فون پر میسج ٹون ہوئی۔ میں نے دیکھا، یہ آسٹریا سے نصرت کا میسج تھا۔ میں نے میسج کھولا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”تابش بھائی! میں اور باجی آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ آپ کیوں کال اٹینڈ نہیں کر رہے؟ آپ کا فون مسلسل بند جا رہا ہے، کیا مسئلہ ہے؟ کوئی ناراضی تو نہیں؟ باجی سمجھتی ہیں کہ اس روز انہوں نے آپ کی کال ریسیو نہیں کی تھی اس لئے آپ خفا ہو گئے ہیں۔ پلیز بھائی جان! باجی کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ بہت بری طرح گھری ہوئی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ باجی کو ہمارے سہارے اور مدد کی ضرورت ہے۔ پلیز! آپ جواب دیں۔“

میسج پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ نصرت میری خاموشی کو میری خفگی پر محمول کر رہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ ان تین چار دنوں میں، میں کن سنگین حالات سے گزرا ہوں اور اگر میں بتاتا تو شاید وہ دونوں یقین نہ کر پاتیں۔ موجودہ تابش اس تابش سے بہت مختلف ہو چکا تھا جسے وہ

جانتی تھیں۔ اب اس کے شب و روز ہنگاموں سے عبارت تھے اور وہ ایک بگولے کا ہم رکاب تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نصرت سے رابطہ کروں کہ ایک منظر نے بری طرح چونکا دیا۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو وائپر پر گیلا کپڑا ڈالے ہوٹل کے فرش کو صاف کر رہی تھی۔ وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ میں اس سے مل چکا تھا اور دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔ مگر یہ پتا نہیں تھا کہ اس سے یوں ملاقات ہو گی۔ وہ حمیدن تھی۔ ثروت کے شوہر یوسف کی گھریلو ملازمہ۔ چند ہفتے پہلے عمران کے ساتھی جیلانی نے اس عورت کو شیشے میں اتارا تھا اور اس نے ہمیں یوسف اور ثروت کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم کی تھیں۔

اسی دوران میں حمیدن کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ گئی۔ تھوڑی سی کوشش سے اس نے مجھے پہچان لیا اور اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ ”حمیدن! تم یہاں بھی کام کرتی ہو؟“

”جی صیب! پر آپ یہاں کیسے؟ اور آپ کو تو چوٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔“

”ہاں......بس چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“

میرے اور حمیدن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا اور میں حمیدن کو کمرے میں لے آیا۔ عمران بھی اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ حمیدن نے ہمیں بتایا کہ وہ پچھلے ایک سال سے یہاں صفائی کا کام کر رہی ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں ہمارے کمرے کی صفائی بھی شاید اسے ہی کرنا تھی۔ میں نے حمیدن سے کہا۔ ”بڑا اچھا ہوا ہے کہ تم سے خود ہی ملاقات ہو گئی۔ ہمیں تم سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”بتائیں صیب جی۔“ حمیدن کی آنکھوں میں وہی جانا پہچانا لالچ ابھر آیا۔

”یہاں نہیں، کہیں آرام سے بیٹھ کر بات کرنا ہو گی۔“ عمران نے کہا۔

”میں نے ابھی صفائی کرنے کے بعد اوپر چھت پر دو تین قالین دھونے ہیں۔ کافی ٹائم لگ جانا ہے۔ آپ اوپر چھت پر ہی آ جائیں۔ وہاں کوئی نہیں ہوتا۔“

نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ حمیدن کے لہجے میں دبا دبا جوش ہے۔ جیسے ہمیں بتانے کے لئے اس کے پاس کوئی خاص بات ہو۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم جب چھت پر جانے لگو تو ہمیں بتا دینا۔ ہم آ جائیں گے لیکن اس بات کا کسی اور کو پتا نہیں چلنا چاہئے۔“

”نہیں جی، میں کیوں بتاؤں گی کسی کو...... میں نے پہلے بھلا بتایا ہے؟ ویسے مالک بڑا سخت ہے جی، کہتا ہے کہ گاہکوں سے آلتو فالتو بات نہیں کرنی۔ کہیں میری بے عزتی خراب نہ

کر دے۔"

راجا نے کہا۔" کچھ نہیں ہوگا تجھے۔ مالک یار بیلی ہے اپنا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی۔ پر گریبوں پر تو ہر کوئی چڑھائی کر دیتا ہے نا۔ پچھلے ہفتے چھوٹی سی بات پر ساتھ والے خاں صاحب کا گھر بھی مجھ سے چھوٹ گیا ہے حالانکہ......"

وہ اپنی تنگ دستی کا رونا رونے بیٹھ گئی۔ مطلب صاف ظاہر تھا۔ وہ "مال" اٹھوانے سے پہلے "ادائیگی" چاہتی تھی۔ عمران نے دو ہزار کے دو نوٹ پرس میں سے نکالے اور حمیدن کو تھما دیئے۔ اس نے تھوڑا سا تکلیف ظاہر کرنے کے بعد یہ نوٹ اپنے گریبان میں رکھ لئے اور سامنے اوڑھنی درست کر لی۔

عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔" اگر پورا تعاون کرو گی تو اتنے ہی اور ملیں گے۔"

وہ سلام کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

اگلا ایک گھنٹا ہم نے کافی بے چینی میں گزارا۔ آخر وہ وقت آ گیا۔ حمیدن ہمارے کمرے کے سامنے سے گزری اور ہمیں سنانے کے لئے اپنے کسی ساتھی کا نام لے کر پکاری۔ "فضلو! میں چھت پر جا رہی ہوں۔"

اس اطلاع کے قریباً دس منٹ بعد میں اور عمران بھی چھت کی طرف روانہ ہو گئے۔ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھنا میرے لئے خاصا دشوار ثابت ہوا تاہم میں چڑھ گیا۔ چھت پر واقعی حمیدن کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ اپریل کے آخری دنوں کی سنہری دھوپ قرب و جوار کو روشن کر رہی تھی۔ چھت پر ہوٹل کا بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے، چند ناکارہ ٹی وی سیٹ، دو چار خراب ونڈو اے سی اور اس قسم کی دیگر اشیاء۔ تاہم چھت کے ارد گرد لاہور کا بالائی نظارہ خوب صورت تھا۔ کبوتر اڑ رہے تھے۔ اکا دکا پتنگیں نظر آ رہی تھیں۔ چھتوں پر رنگین آنچلوں کی جھلک تھی اور نیچے گلی کوچوں میں زندگی رواں دکھائی دیتی تھی۔

حمیدن نے کارپٹ کے تین چار بڑے بڑے ٹکڑے چھت پر بچھا رکھے تھے اور انہیں وائپر کے ساتھ دھونے میں مصروف تھی۔ میں اور عمران قریب رکھی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ انداز ایسا ہی تھا، جیسے دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہاں آ گئے ہیں لیکن ہمیں اصل سروکار تو حمیدن سے ہی تھا۔

میں نے کہا۔" ہاں حمیدن! کیا چل رہا ہے یوسف صاحب کے گھر میں؟"

وہ دیدے گھما کر بولی۔" صیب جی! وہاں تو لمبی چوڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ اللہ ماف کرے...... اللہ ماف کرے۔ دن میں تارے نظر آ گئے ہیں یوسف صیب کو۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔"

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صیب جی! یہ تو آپ کو پتا ہی ہے نا کہ بڑی بی بی جی کی چھوٹی بہن نصرت بی بی بیمار ہیں اور علاج کے لئے باہر کے ملک گئی ہیں...... بڑی بی بی بھی ساتھ ہیں؟''

''ہاں پتا ہے مجھے لیکن یہاں کیا معاملہ ہے؟''

اس نے سسپنس بڑھانے کے لے اردگرد دیکھا اور رازداری کے انداز میں بولی۔ ''یوسف صیب کی جرمن ووہٹی واپس چلی گئی ہے۔ اس نے بڑا وڈا دھوکا دیا ہے یوسف صیب کو۔''

''دھوکا دیا ہے؟''

''آہو جی، وہ چنگی کڑی ہی نہیں ہے۔ مجھ لگتا ہے کہ یوسف صیب کا دل اس سے بھر گیا ہے اور اس کا دل یوسف صیب سے بھر گیا ہے۔ ان دونوں کی کہانی اب کھتم لگتی ہے۔''

''تم کس دھوکے کی بات کر رہی تھی؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''تھوڑے دن پہلے میم کے چار پانچ رشتے دار آئے ہوئے تھے گھر میں۔ ایک کڑی تھی، تین چار منڈے تھے۔ بس چٹی چمڑی۔ نہ منہ نہ متھا۔ ایک نمبر کے لوفر تھے سارے۔ ان میں سے ایک منڈا میم جی کا کوئی چاچے بابے کا پتر بھی تھا۔ وی بائی سال کا ہو گا...... بالکل سوکھا سڑا، کانے جیس ٹانگیں۔ میم جی کو بڑی بے شرمی سے ڈارلانگ ڈارلانگ بھی کہتا تھا۔ یہ لوگ میم جی کو ساتھ لے کر سارا دن لور لور گھومتے تھے۔ رات کو نشہ پیتے تھے اور ناچ گانا کرتے تھے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ اس سوکھے سڑے منڈے کی وجہ سے ہی یوسف صیب اور میم جی میں جھگڑا ہوا...... اللہ کی شان ہے جی...... ویکھدے ہی ویکھدے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ کہاں تو یوسف صیب اپنی میم کے پاؤں کے نیچے تلیاں (ہتھیلیاں) رکھتے تھے، کہاں وہ اسے انگریزی میں گالیاں دیتے تھے اور وہ ان کو دیتی تھی۔ اللہ مافی...... اللہ مافی۔ لگتا ہے کہ یہ عشق کا ''بھانبھڑ'' جتنی تیزی سے بھڑکا تھا، اتنی ہی تیزی سے ٹھنڈا بھی ہوا ہے۔''

''گریس واپس کب گئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو کوئی دو تین ہفتے ہو گئے ہیں جی۔ ایک دن سویرے میں کام پر گئی تو برآنڈے میں چینی کے کئی بھانڈے ٹوٹے پڑے تھے۔ ایک کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ پروہنے (مہمان) جا چکے تھے اور ساتھ میں میم بھی جا چکی تھی۔''

حمیدن نے اپنی آواز دھیمی کی اور دیدے گھما کر بولی۔ ''سنا ہے جی، وہ اپنی ایک ایک شے واپس لے گئی ہے۔ یوسف صیب کے ہتھ میں کوئی مہنگی گھڑی تھی، وہ تک اتروا لی ہے اس

نے۔ کافی سارے نقد پیسے بھی لئے ہیں۔ ورنہ وہ تھانے جانے کی دھمکی دیتی تھی بڑی عجیب چیز نکلی ہے جی وہ۔''

ہم سن رہے تھے اور سناٹے میں تھے۔

اب یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ نصرت کے بقول آج کل یوسف بدلا ہوا کیوں ہے۔ نصرت نے بتایا تھا کہ وہ آج کل ثروت کا بڑا خیال رکھ رہا ہے۔ پاکستان سے دن میں کئی بار اس کا فون جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لگتا تھا کہ نصرت کی چھٹی حس کافی تیز ہے۔ اس نے فون پر مجھ سے شک کا اظہار کیا تھا کہ شاید وہاں لاہور میں یوسف بھائی کی طرف کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

عمران نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے حمیدن...... یوسف صاحب اب کیا سوچ رہے ہیں؟''

''وہی جی...... جو انہیں بہت پہلے سوچنا چاہئے تھا۔ انہیں اب احساس ہو رہا ہے کہ انہوں نے ہیرے جیسی بڑی بی بی کے ساتھ بڑی جیادتی کی ہے۔ اب انہوں نے بڑی بی بی کی ایک تصویر اپنے کمرے میں لگائی ہے۔ اتنی پیاری تصویر ہے کہ کیا بتاؤں۔ ایمان سے حور لگتی ہیں اپنی بی بی اور وہ خصماں نوں کھانی...... لنگور تھی ان کے سامنے۔ بس چٹی چمڑی اور نیلی کچ آنکھیں۔ اور کیا تھا اس میں۔'' حمیدن، یوسف کی جرمن بیوی گریس کے لئے جلی بیٹھی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''حمیدن! تمہارا کیا خیال ہے، اب اپنی بڑی بی بی سے یوسف صاحب کا سلوک اچھا ہو جائے گا؟''

''ضرور اچھا ہو گا جی۔ یوسف صیب ان کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے سونے والے کمرے کو بھی ٹھیک ٹھاک کیا ہے۔ کافی روپیا لگایا ہے کمرے پر۔ اور غسل خانے کو تو شیش محل بنا دیا ہے جی۔ پتا نہیں کس ملک سے چیزیں منگوا کر لگا رہے ہیں اس میں۔''

''یعنی بڑی بی بی کے لئے یوسف صاحب کی سوئی ہوئی محبت جاگ گئی ہے؟'' عمران نے کہا۔

''آہو جی اور یہ محبت اس ففے کٹن گوری نے سلائی ہوئی تھی جی۔ ورنہ اپنی بی بی ثروت تو لاکھوں میں اک ہیں۔ اندھیرے کمرے میں بھی بیٹھیں تو چانن ہو جاتا ہے۔''

''اور اگر وہ ففے کٹن گوری پھر یہاں واپس آ گئی تو؟'' عمران نے پوچھا۔

''لگتا تو نہیں جی کہ اب وہ واپس آئے گی۔ باقی اللہ کو پتا ہے۔ پر اس نے جو جادو کر

نکل جاؤں گا۔ اس کے سکھی پریوار پر اپنی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ بندۂ خدا! اگر تم پشپا...... میرا مطلب ہے ثروت کی زندگی سے نکل جاتے تو تمہیں کیسے پتا چلتا کہ یہ یوسف عرف پریم چوپڑا کیا گل کھلانے جا رہا ہے۔ ثروت کے وشواس کی ہتھیا کرنے کے لئے کون سا نروانترے پل رہا ہے اس کے دماغ میں۔''

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پتا تھا کہ ''نروانترے'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے جہاں عمران کو کوئی لفظ نہیں سوجھتا تھا، وہاں وہ کوئی من گھڑت لفظ لگا دیتا تھا۔

وہ اس طرح کے فقرے بولتا رہتا تھا۔ ''یار تابی! میرے دماغ میں عجیب سی کروشلا آئی ہے۔''

یا پھر ''یار! آج کل گرمی کے کارن بھوجن اکشاتا تو ختم ہی ہو گئی ہے۔''

یا پھر ''جلالی صاحب کے پریم کی خبر آؤٹ ہو گئی تو بڑا سمادھار مچے گا بھیا۔''

ان فقروں میں کروشلا، اکشاتا اور سمادھار کے الفاظ ہندی کی کسی لغت میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے تھے...... بلکہ دنیا کی کسی لغت میں نہیں۔

عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے سیل فون کے ذریعے جیلانی سے رابطہ کیا اور اس سے باتیں کرتا کرتا باہر نکل گیا۔ وہ یقیناً جیلانی کے ذریعے ان اہم خبروں کی تصدیق چاہتا تھا جو ابھی ہمیں ملازمہ حمیدن نے پہنچائی تھیں۔

راجا نے کمرے کا ٹی وی آن کر رکھا تھا مگر اس کی آواز بند تھی۔ اچانک اسکرین پر نظر آنے والی ایک تصویر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ ریان ولیم کی ایک پرانی تصویر تھی۔ تاہم اس میں بھی وہ کافی سے زیادہ موٹا نظر آتا تھا۔ میں نے فوراً ریموٹ کنٹرول راجا سے جھپٹا اور آواز اونچی کی۔ ایک نیوز چینل سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ فربہ اندام ریان ولیم کے فوراً بعد ایک اور دھندلی سی تصویر دکھائی گئی، یہ جاوا کی تھی۔

نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''...... دونوں گروپوں کی اس لڑائی میں اب تک تیرہ چودہ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ یاد رہے کہ کل صبح، انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہونے والا ہنگامہ بھی ان دونوں گروہوں کی عداوت کا شاخسانہ تھا۔ ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں نے ایک دوسرے پر اندھا دھند فائرنگ کی اور کئی افراد جان سے گئے۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ دونوں گروپ بدھا کی اس خاص مورتی کے لئے مار دھاڑ کر رہے ہیں جسے آراکوئے کہا جاتا ہے اور جس کے بارے میں عرصہ دراز سے کئی کہانیاں اور

کہاوتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مورتی اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں اور اس جگہ کی حفاظت بھی کرتی ہے جہاں یہ موجود ہوتی ہے۔ آئیے، اب ہم آپ کو اس مورتی کے بارے میں ایک ڈاکومینٹری دکھاتے ہیں......''

اس کے بعد آراکوئے کا تاریخی پس منظر بیان کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے یہ کہاں تھی؟ اس کے بعد کہاں گئی؟ دوسری جنگِ عظیم میں یہ ایک قصبے میں موجود جاپانیوں کے لئے کس طرح سودمند ثابت ہوئی۔ پھر یہ کس طرح چوری ہو کر پاکستان پہنچی اور واپس کس طرح گئی اور دوبارہ پاکستان کیونکر آئی۔ اس حوالے سے نوادرات کے شکاری ابرار صدیقی اور میڈم صفورا وغیرہ کے نام بھی آئے۔

میں نے چینل بدلنے شروع کئے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک اور نیوز چینل پر مطلوبہ خبر نظر آ گئی۔ میں چونکا۔ یہاں جلالی صاحب خود نظر آ رہے تھے۔ فارم ہاؤس کا ہی منظر تھا۔ لان میں کرسیاں بچھی تھیں۔ میز پر پرانی طرز کا گراموفون نظر آ رہا تھا۔ ایک نمائندہ جلالی صاحب کا انٹرویو کر رہا تھا۔ نقاہت زدہ جلالی صاحب آرام کرسی پر تقریباً نیم دراز تھے مگر ان کی آواز کا طنطنہ برقرار تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''...... میرا بیان وہی ہے جو میں پہلے بھی آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں۔ وہ باکس میرے پاس ایک امانت کے طور پر آیا ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک اس کا مالک خود مجھ تک نہیں پہنچتا۔''

''لیکن جناب! فرض کیا وہ شخص کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے اور اب آپ سے رابطہ نہیں کر سکتا تو پھر؟''

''پھر بھی میں انتظار کروں گا۔ کم از کم چار پانچ مہینے اور...... اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''جناب! کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ آپ اس باکس کی ذمے داری سے فارغ کیوں نہیں ہو جاتے؟ آخر اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟''

اس چبھتے ہوئے سوال نے جلالی صاحب کا پارا اچھال دیا۔ وہ بھڑک کر بولے۔ ''کیسے فارغ ہو جاؤں ذمے داری سے؟ کیا پولیس والوں کو یہ ذمے داری دے دوں...... یا کسی چور وزیر کو...... یا پھر تمہیں دے دوں؟ بتاؤ تمہیں دے دوں؟''

''نہیں جناب! میرا مطلب یہ تھا کہ......''

''خاموش۔'' وہ دہاڑے۔ ''میں سمجھ رہا ہوں تمہارا مطلب...... تم میں سے زیادہ تر بلیک میلر ہیں۔ تم لوگوں نے اپنی اپنی حکومتیں بنائی ہوئی ہیں۔ آزاد ریاستیں قائم ہوئی ہیں۔

رکھا تھا ناصیب جی پر، وہ ایک دم ٹوٹ گیا ہے۔ وہ آ بھی گئی تو اس کی وہ پہلے جیسی موجیں نہیں ہوں گی۔"

میں نے حمیدن سے پوچھا۔ "ثروت کے سسر فاروقی صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ دس پندرہ دن پہلے آئے تھے جی۔ دو دن رہ کر چلے گئے۔ میم کے جانے پر وہ بھی خوش ہی تھے۔"

"بی بی ثروت باہر کے ملک سے واپس کب آ رہی ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں جی...... مگر ابھی ان کو وہاں کافی ٹائم لگنا ہے۔ نصرت بی بی کی بیماری کوئی ایویں شیویں نہیں ہے۔ ان کا جگر کھراب ہے۔ کوئی بڑی نامراد بیماری ہے۔ اللہ اس کو شفا دے، یہ دونوں بہنیں ہی بڑی چنگی ہیں۔"

حمیدن ہم سے باتیں کرتی رہی اور ساتھ ساتھ قالین بھی دھوتی رہی۔ اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ ہم یہ معلومات کیوں اور کس لئے حاصل کر رہے ہیں۔ اسے صرف دو عدد بڑے سائز کے نیلے نوٹوں کی ضرورت تھی۔ اس کی یہ ضرورت عمران نے پوری کر دی۔

حمیدن سے بات چیت ختم کرنے کے بعد میں اور عمران نیچے آ گئے اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ صورتِ حال میں تیزی سے تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ایک طرف جلالی صاحب اور آرا کوئے والا معاملہ تھا تو تیزی سے رنگ بدل رہا تھا۔ دوسری طرف میری ثروت اور یوسف کی کہانی تھی جس میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔

یوسف شروع سے ہی ایک شوقین اور خواہش پرست امیر زادے کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ ایک بڑی جائیداد کا مالک تھا اور اسے توقع تھی کہ مزید جائیداد اس کے ہاتھ آنے والی ہے۔ وہ کافی حد تک جذباتی اور رومانی بھی تھا۔ اس نے خود سے تقریباً دس سال چھوٹی ایک ٹین ایج لڑکی سے عشق کیا اور اس کے لئے سب سے ٹکر لے لی۔ اپنا تن من دھن اس پر لٹا دیا۔ یہاں تک کہ اپنی خوب صورت خاندانی بیوی (ثروت) سے بھی یکسر منہ موڑے رکھا۔ وہ سہاگن ہونے کے باوجود اس کی بیوی نہ بن سکی۔ لیکن اب صورتِ حال میں ایک اور حیران کن موڑ آیا تھا۔ یوسف کی محبوبہ بیوی اس سے لڑ جھگڑ کر جرمنی پہنچ چکی تھی اور اب یوسف کی سوچوں کے دھارے شاید ثروت کی طرف مڑ رہے تھے۔ شاید...... اسے پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا کہ ثروت جیسی خوبرو اور باوفا لڑکی ایک بیوی کی حیثیت سے ہر دم اس کے پاس رہی ہے۔ وہ اس پر مکمل اختیار رکھنے کے باوجود اس کے التفات سے محروم رہا ہے۔

یورپ کی معطر فضاؤں میں رہنے والی "خواہش پرست حسن شامہ" کو اب اپنی مٹی کی خوشبو کشش کر رہی تھی۔

کیا اب یہ ثروت کے ساتھ ایک اور دھوکا تھا؟

عمران نے کہا۔ "کیا خیال ہے جگر! ویانا میں ثروت اور نصرت کو یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے؟"

"میرے خیال میں تو ابھی ہمیں مزید تصدیق کر لینی چاہئے...... ہو سکتا ہے کہ حمیدن کی معلومات میں کوئی خلا ہو۔ کیا اس سلسلے میں جیلانی ہماری مدد کر سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں...... ہماری مدد نہیں کرے گا تو کیا وہ امریکا کا اور یورپی یونین کی مدد کرے گا۔"

"امریکا یہاں کہاں سے آ گیا؟"

"امریکا ہر جگہ آ سکتا ہے اور ہر طرف سے آ سکتا ہے۔ یہ شیر کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ انڈا دے یا بچہ...... یا کچھ بھی نہ دے اور صرف وعدے کرتا رہے کہ دوں گا۔ تمہیں پتا ہے پچھلے دنوں ہمارے فساد پلس چینل پر ایک پروگرام نشر کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا، امریکا کے وہ وعدے جو اس نے تیسری دنیا سے کئے اور پورے کئے۔ یہ پروگرام رات کو ٹھیک نو بجے شروع ہوا اور نو بج کر تین منٹ پر ختم ہو گیا۔ اس "مفصل" پروگرام کی وجہ سے بڑی لعنتیں ارسال ہوئی تھیں ہم پر......"

اس سے پہلے کہ عمران کی یہ عالمانہ گفتگو طول پکڑتی اور وہ آٹے دال کا بھاؤ اقوام متحدہ اور پینٹا گون سے ملا دیتا، میرے سیل فون پر پھر نصرت کا میسج آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "کیا آپ کو میری صحت کا بھی خیال نہیں بھائی جان؟ آپ کیوں جواب نہیں دے رہے؟ میں بہت پریشان ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا، لاہور میں پتا کرائیں کہ یوسف بھائی جان کس چکر میں ہیں، ان کا رویہ بہت بدلا بدلا ہے۔ آپ نے اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔"

میں نے اسی وقت نصرت کو جواب دیا اور لکھا۔ "میں اور عمران فی الوقت ایک بہت ضروری کام میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس مصروفیت کی وجہ سے تم سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ تمہارے کہنے پر میں یوسف صاحب کے بارے میں ٹوہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کوئی اہم بات معلوم ہوئی تو تمہیں آگاہ کروں گا۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی صحت پر توجہ دو۔"

عمران نے میرے کندھے پر گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جگر! چند ہفتے پہلے تم دیوداس بننے جا رہے تھے۔ دلیپ کماری لہجے میں کہہ رہے تھے...... میں پشپا کے جیون سے

کالی بھیڑوں کی طرح گھسے ہوئے ہوئے تم لوگ ہر جگہ۔ اس میڈیا کو بھی بدنام کر رہے ہو۔ یہ کیمرا ''پستول'' کی طرح اٹھائے پھرتے ہو اور اس سے لوگوں کو ہینڈز اپ کرواتے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں ڈر جاؤں گا؟ میں جاوا جیسے حرامی ڈان سے نہیں ڈرا، تم کس باغ کی مولی ہو......''

نمائندے کا ٹمپریچر بھی شاید بڑھ گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ دھیما لہجہ اختیار کرتا، اس نے مزید سخت سوال کیا۔ ''جناب کل ایک چینل پر ایک پروگرام چلا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آپ خود بھی آرا کوئے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں فارم ہاؤس کے ماحول کے بارے میں بھی کچھ ''باتیں'' کہی گئی ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

جلالی صاحب آتشیں لہجے میں بولے۔ ''یہاں کے ماحول سے کس کی ماں بہن کو نقصان پہنچا ہے؟ کس کو پہنچا ہے؟ میں نے کہا تھا نا تم بلیک میلر ہو۔ میں تمہیں...... میں تمہیں......''

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی موٹی چھڑی اٹھائی اور پورے زور سے گھمائی۔ یہ وار غالباً کیمرا مین کی طرف تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیمرے کا زاویہ تبدیل ہونے سے ڈاکٹر مہناز بھی فریم میں آ گئی۔ ''پلیز سر...... پلیز!'' وہ پکاری اور جلالی صاحب کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین تاریک ہوگئی۔ چند لمحے بعد نیوز کاسٹر خجل انداز میں دیگر خبریں نشر کرنے لگی۔

''بڑا گرم بڈھا ہے بھئی۔'' راجا نے تبصرہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، عمران اندر آ گیا۔ ''یہ کیا چل رہا تھا یار ٹی وی پر؟ مجھے تو جلالی کی آواز لگ رہی تھی۔''

''وہی حضرت تھے۔ لائیو ڈراما شروع ہونے لگا تھا۔ بچ بچا ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

عمران کے پوچھنے پر میں نے اسے تفصیل بتائی۔ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

''جگر! یہ معاملہ تیزی سے بگڑتا جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اب ریان اور جاوا کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اس تماشے میں کود پڑیں۔ جلالی کی جان کو شدید خطرہ ہے لیکن وہ سمجھ نہیں رہا اور نہ کسی کی بات مان رہا ہے۔''

''تو پھر کیا ارادے ہیں؟''

''اب کوئی راست قدم اٹھانا پڑے گا۔'' عمران نے کش لگایا۔

''یار! مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ یہ کیا اسٹوری چل رہی ہے؟'' راجا نے مداخلت کی۔

''پہلے ہمیں تو ٹھیک سے پتا چل جائے، پھر تمہیں بھی بتا دیں گے۔'' عمران نے اسے ٹالا۔

راجا کی اکلوتی صحت مند آنکھ میں ''جستجو'' چمک رہی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نگاہ دوسری طرف پھیر لی۔

O......❖......O

اگلے روز شام کے فوراً بعد میں اور عمران جلالی صاحب کی طرف روانہ ہوگئے۔ راجا کو عمران نے فی الحال ہوٹل میں رہنے پر رضامند کر لیا تھا۔ اسے ابھی ہم نے کچھ بتایا نہیں تھا پھر بھی وہ موجودہ حالات کے بارے میں کافی سارے اندازے قائم کر چکا تھا۔ بڑا کائیاں شخص تھا وہ اور عیار بھی۔ راستے میں اس نے جس طرح لینڈ روور کو خراب کر کے مجھے اُلو بنایا تھا اور اپنا اُلو سیدھا کیا تھا۔ وہ مجھے بھولا نہیں تھا...... میری ٹانگ اب پہلے سے کافی بہتر تھی...... پھر بھی واکنگ اسٹک کے سہارے چلنا پڑ رہا تھا۔ جسم پر جابجا چوٹوں کے نیلے پیلے نشان موجود تھے لیکن ان میں سے زیادہ تر لباس میں چھپ گئے تھے۔ مجھے اپنے خاص الخاص چاقو کی گمشدگی کا افسوس تھا۔ جارج گورا کو جہنم واصل کرنے والا یہ خنجر نما چاقو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہی رہ گیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کہاں اور کس کے پاس تھا۔

عمران ایک تاریک شیشوں والی کرولا گاڑی میں یہاں پہنچا تھا پتا نہیں یہ کس کی گاڑی تھی۔ میں نے پوچھا لیکن اس نے بتایا نہیں۔ جب وہ کچھ چھپانے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر اس سے بحث فضول ہوتی تھی۔ راستے میں وہ شاہین سے فون پر خوب لڑتا جھگڑتا رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوب سنائیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے لئے رتی بھر جگہ بھی نہیں ہے۔ اور خدا نہ کرے...... خدا نہ کرے وہ ایک ہو جائیں تو زندگی برباد ہو جائے اور دنیا جہنم کا نمونہ بن جائے۔ حسبِ معمول فون پہلے شاہین نے ہی بند کیا تھا اور عمران کے خوبرو چہرے پر شرارت ناچ گئی تھی۔

عمران کے بعد میں نے فرح اور عاطف سے بات کی اور انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ وہ بھی اس بات پر بہت پریشان تھے کہ میرا فون چار دن تک مسلسل بند رہا تھا۔ فون ہی پر میں نے اپنے اور سلطانہ کے لختِ جگر بالو کی زندگی بخش آواز بھی سنی۔

ہم رات نو بجے کے لگ بھگ ''جلالی فارم ہاؤس'' پہنچے۔ عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا...... فارم ہاؤس کے اردگرد کا نقشہ اب بدلا ہوا تھا۔ دو تین جگہ ہمیں پولیس ناکوں پر سے گزرنا پڑا۔ یہاں عمران نے باقاعدہ اپنی اور میری شناخت کروائی۔ آخری ناکے پر بذریعہ فون جلالی

صاحب سے اجازت حاصل کی گئی۔

فارم کے مین گیٹ پر پولیس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کے لوگ بھی موجود تھے۔ یہاں گیٹ سے باہر میڈیا کے کچھ افراد بھی موجود تھے۔ انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اور وہ باہر بیٹھے بس گھول رہے تھے۔ مجھے اور عمران کو دیکھ کر وہ ہماری طرف لپکے۔ دو تین افراد نے کار کی کھڑکی سے اپنے مائیک اندر گھسا دیئے۔ ایک رپورٹر نے کہا۔

''عمران صاحب! جاوا ایک بہت طاقتور شخص کا نام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو انڈین فلم انڈسٹری پر راج کرتے ہیں۔ آپ نے اسے للکارا ہے...... آپ کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟''

''مادھوری ڈکشٹ کا بلکہ وہ پوری کی پوری میرے پیچھے ہے۔ اور عورت آگے ہو یا پیچھے، اس کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے۔'' عمران نے ایک آنکھ میچی۔

''کون مادھوری جناب؟ شاید آپ مذاق کر رہے ہیں؟'' رپورٹر نے کہا۔

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ مادھوری ایک بہت ذہین اور چارہ گر خاتون ہے۔ اس کی یادداشت بھی غضب کی ہے۔ چند سال پہلے جب وہ فلموں میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی، جاوا نے اس کے ساتھ ہرول بھرشاٹ کیا تھا۔ اب وہ اس کا بدلہ چکانا چاہتی ہے۔''

''ہرول بھرشاٹ......؟ یہ کیا لفظ ہے جناب؟ پہلی بار سنا ہے۔''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم نے سنا ہے یا نہیں لیکن ہرول بھرشاٹ تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔ اور انڈیا میں تو یہ بہت زیادہ ہے۔ ہر جگہ اس کا دور دورہ ہے۔ امیر طبقے کے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو غریبوں کے ساتھ ہرول بھرشاٹ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔''

''لیکن اس کا مطلب......''

رپورٹر کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ عمران نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

ہم کوٹھی کے پورچ میں پہنچے...... اور پھر اندر چلے گئے۔ دور سے دیکھا، جلالی صاحب چھوٹے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں عمران نے مائیکروفون چھپایا تھا اور اس ننھے سے آلے کے ذریعے ہم نے اس کوٹھی کے کئی سربستہ راز معلوم کئے تھے۔ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ ہم نے شیشے میں سے دیکھا، جلالی صاحب کمر کے پیچھے دو تین کشن رکھے صوفے پر نیم دراز تھے۔ ڈاکٹر مہناز ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ بابے طفیل کی بہو رضیہ بھی قریب ہی موجود تھی۔ دوسروں کے سامنے جلالی صاحب، مہناز سے بالکل لئے دیئے رہتے تھے بلکہ کسی وقت ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ مہناز بھی جناب اور سر کے سوا بات نہیں کرتی

تھی۔ ابھی تک کوٹھی میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ یہاں ایک نہایت خفیہ شادی کی صورت میں کتنی بڑی تبدیلی آ چکی ہے۔ کم از کم ابھی تک تو یہ بات ایک ''ٹاپ سیکرٹ'' ہی تھی۔

اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں نے اسے اشارے سے باہر بلایا۔ اس نے ہاتھ کی حرکت سے بتایا کہ تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ جلالی صاحب کے وائٹل سائنز چیک کرنے کے بعد اس نے جلالی صاحب کے بازو پر لگے ہوئے ''کینولا'' میں دو انجکشن دیے اور باہر آ گئی۔ نایاب ایرانی بلی کا ایک گول مٹول بلونگڑا جلالی صاحب کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔

کل شام ہی عمران نے ڈاکٹر مہناز کو فون پر ساری صورتِ حال بتا دی تھی۔ میری خیریت اور فتح محمد کی ہلاکت سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ سیکرٹری ندیم کے دہرے روپ کی اہم ترین اطلاع بھی مہناز تک پہنچا دی تھی۔ اس کے بعد اسے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو یہ معلومات جلالی صاحب کو دے دے۔

مہناز میری بخیریت واپس پر خوش تھی، تاہم جلالی صاحب کی ابتر طبیعت نے اسے پریشان بھی کر رکھا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں نے ابھی سر کو کچھ نہیں بتایا۔ صرف تمہاری خیریت سے آگاہ کیا ہے۔'' مہناز کا اشارہ میری طرف تھا۔

''ندیم کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی تک تو نہیں۔ فتح محمد کی موت کی خبر کی طرح اس خبر سے بھی سر کو بہت صدمہ پہنچنا ہے اور ان کی حالت ایسی نہیں کہ فی الحال انہیں ایسے شاک پہنچائے جائیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سب کچھ بگڑ رہا ہے۔ بلڈ پریشر، ہارٹ بیٹ، شوگر لیول۔ ایک تو حالات ایسے ہیں، اوپر سے یہ میڈیا والے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کل ایک چینل کے رپورٹر پر بہت بگڑے ہیں سر۔ طبیعت تو اسی وقت خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں سی آئی اے والے آ گئے۔ ہر ایک کی ڈیمانڈ یہی ہے کہ سر ''آراکوئے'' والا باکس حوالے کر دیں اور اپنی جان چھڑائیں۔ لیکن یہ بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ بس ضد پکڑ لی ہے۔ کہ نہیں۔ جتنا زور دیا جا رہا ہے، اتنا ہی اپنے مؤقف پر سخت ہو رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر مہناز! تم بھی کچھ نہیں کر سکتی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے اس طرح دیکھنے سے وہ گڑبڑا گئی اور بولی۔ ''کیا مطلب؟''

''تم سر کے اتنے قریب ہو۔ وہ تمہاری بات تحمل سے سنتے ہیں، اس پر غور کرتے ہیں۔''

''لیکن ایسا تو بس کسی وقت ہی ہوتا ہے، جب موڈ اچھا ہو۔''

''تو تم موڈ اچھا کرلوتا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ ذرا چونک سی گئی۔ روشن پیشانی پر ایک شکن سی ابھری اور غائب ہوگئی۔ ''وہ آپ دونوں کو بھی تو بڑے غور سے سنتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں بات کرتے؟'' وہ بولی۔

اسی دوران میں جلالی صاحب کو شدید کھانسی ہونے لگی۔ ہماری طرح ڈاکٹر مہناز نے بھی کھڑکی میں سے انہیں کھانستے دیکھا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر بڑی تن دہی سے ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئی۔ رضیہ بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کررہی تھی۔ مہناز نے جلالی صاحب کو ایک ''ان ہیلر'' دیا۔ پھر ان کا سر اونچا کرنے کے لئے اپنے زانو پر رکھا اور ان کے بوڑھے سینے پر ہولے ہولے ہاتھ چلانے لگی..... ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اب ہم اس انداز میں مہناز کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

ہاں..... اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر مہناز کو کہیں نہیں دیکھا۔ وہ کہاں گئی؟ کب اور کیوں گئی؟ کچھ پتا نہیں چلا۔ اگلے قریباً دو ماہ تک ہم ڈاکٹر مہناز کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ یہ اس روداد میں ایک عجیب موڑ تھا۔

لیکن فی الحال تو اس رات کی بات ہورہی ہے جب اس نے جلالی صاحب کا سر اپنے زانو پر رکھا ہوا تھا اور اپنا ہاتھ ہولے ہولے سے ان کے سینے پر چلا رہی تھی۔ ان کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آگیا، عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ بات تو ہم اچھی طرح جان چکے تھے کہ اگر جلالی صاحب پر کسی طریقے سے دباؤ ڈالا جاسکتا ہے تو وہ طریقہ صرف ''مہناز'' ہی ہے۔ اگر جلالی صاحب کو یقین ہو جاتا کہ ان کے چپ رہنے سے مہناز کسی بڑی مصیبت میں پھنس رہی ہے یا اس کی زندگی کو خطرہ ہے تو وہ اپنی ضد کے خول سے نکل سکتے تھے۔ ڈاکٹر مہناز کو دباؤ کے لئے استعمال کرنا یقیناً ہمارے لئے ایک ناخوشگوار عمل تھا۔ لیکن جس قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے، ان میں اب کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ اب بھی کچھ نہ کچھ کرنے میں بہت سے خطرے پوشیدہ تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خدانخواستہ جلالی صاحب کو کچھ ہو جاتا اور تراکوٹ ہمیشہ کے لئے کہیں اوجھل ہو جاتا۔

ہمارے پاس دو تین پلان تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اپنی شناخت ظاہر کئے بغیر ڈاکٹر مہناز کو جلالی کے سامنے گن پوائنٹ پر رکھا جائے۔ اگر ناگزیر ہو تو کچھ تشدد بھی کیا

جائے اور جلالی کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا جائے۔

رات بارہ بجے کے قریب عمران Zoo کی طرف اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ ٹانگ سمیت جسم کے مختلف حصوں سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کمرے کی الماری میں پین کلرز موجود تھیں لیکن مجھے درد کو مارنے کے بجائے درد کو سہنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ درد برداشت کرنے کے لمحوں میں، میں خود کو باروندا جیکی کے بہت قریب محسوس کرنے لگ تھا۔ وہ جیسے میرے قریب آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ مجھ سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

نہ جانے کس وقت درد...... دوا ہو گیا اور میں سو گیا۔

کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بابا طفیل میرے سامنے تھا...... سفید داڑھی کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ دل دوز آواز میں بولا۔ ''اٹھو، دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ جلالی ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا، وہ زندہ ہے...... مجھے نہیں لگتا......''

میں اٹھا اور ننگے پاؤں جلالی صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔ بابا طفیل بھی روتا ہوا میرے ساتھ تھا۔ کوٹھی میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ جلالی صاحب بالکل ساکت و جامد پڑے تھے۔ چہرے پر زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ میں نے ان کی نبض ٹٹولی۔ نبض کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ جسم ٹھنڈا تھا۔ غور کرنے پر سینے میں ہلکی سی حرکت محسوس ہوئی۔ شاید یہ سانس کی حرکت تھی۔

''ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''وہ چلی گئی۔ بھاگ گئی حرام خور۔ اس کا کمرا خالی ہے۔ سارا سامان بھی غائب ہے'' بابے طفیل نے کراہتے ہوئے کہا۔

''یہ...... کیسے ہو سکتا ہے؟''

اسی دوران میں عمران بھی پہنچ گیا۔ لگتا تھا کہ بابے طفیل کے آخری الفاظ اس نے بھی سن لئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''عمران! جلالی صاحب کو اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی ان کی تھوڑی بہت سانس چل رہی ہے۔''

ایک ایمبولینس بیڈروم کے عقبی دروازے کے پاس بالکل تیار حالت میں رہتی تھی۔ دو تین منٹ کے اندر ایمبولینس دروازے پر پہنچ گئی۔ میں نے بابے طفیل اور رضیہ وغیرہ کو ہدایت کی کہ ابھی کمرے کی کسی شے کو اس کی جگہ سے ہلایا نہ جائے۔ کمرے میں کچھ چیزیں اپنی جگہوں سے ہٹی ہوئی تھیں۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی دوا کی دو شیشیاں نیچے گری ہوئی تھیں۔

ایک چھوٹا ٹائم پیس شاید ان شیشیوں کے اوپر گرا تھا اور ٹوٹ گیا تھا۔ جلالی صاحب کی بیڈ شیٹ پر بہت سی سلوٹیں تھیں۔

ہم جلالی صاحب کے ہلکے پھلکے جسم کو اٹھا کر ایمبولینس تک لائے۔ عمران نے کہا۔ ''ہم دونوں کا جانا ٹھیک نہیں۔ تم یہیں رہو اور فون پر مجھ سے رابطہ رکھو۔ ڈاکٹر مہناز کو ڈھونڈو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوٹھی کے اندر ہی کہیں موجود ہو۔ نرس بشریٰ کا بھی پتا کرو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وحید...... عمران اور ویٹرنری ڈاکٹر عدیل بے سُدھ جلالی صاحب کو ایمبولینس میں ڈال کر نکل گئے۔

ملازم آبدیدہ تھے۔ کئی باقاعدہ رو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے تئیں جلالی صاحب کو مردہ قرار دے دیا تھا۔

انچارج پولیس افسر ایس پی تیمور خاں بھی فوراً ہی اندر آ گیا۔ اس کو بیان دیتے ہوئے بابے طفیل نے کہا۔ ''جلالی کی طبیعت شام سے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ دس بجے تک طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ میرے کہنے پر مہناز نے اپنے کسی بڑے ڈاکٹر کو فون کیا۔ یہ ڈاکٹر خود تو نہیں آیا، اس نے ایک چھوٹے ڈاکٹر کو بھیج دیا۔ اب پتا نہیں وہ ڈاکٹر تھا بھی یا نہیں۔ شکل سے تو کوئی بوچڑ ہی لگتا تھا۔ یہ بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ مہناز نے کسی بڑے ڈاکٹر کو فون کیا بھی تھا یا نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ یہ ساری پلاننگ پہلے سے ہی تھی۔ اس کمینی نے جب یہ دیکھا کہ جلالی کا آخری وقت آ گیا ہے تو صفایا کر کے یہاں سے نکل گئی۔'' بابا طفیل پھر ہچکیوں سے رونے لگا۔

ایس پی تیمور نے پوچھا۔ ''صفایا کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا کچھ چیزیں بھی گئی ہیں؟''

''ہاں جی...... یہ دیکھیں، یہ ساری الماری الٹ پلٹ ہے۔ پتا نہیں کیا کچھ نکالا گیا ہے یہاں سے۔'' بابے طفیل نے الماری کے پٹ کھول کر دکھائے۔ واقعی ہر شے درہم برہم دکھائی دیتی تھی۔ ایک دراز ادھ کھلی تھی۔ وہاں سے افراتفری میں کیش نکالا گیا تھا۔ پانچ پانچ سو کے دو نوٹ دراز سے نکل کر الماری کے نچلے حصے میں پڑے تھے۔ دراز میں سونے کی ایک زنجیر بھی اٹکی ہوئی تھی۔ یہ غالباً کسی قیمتی ہار کا حصہ تھی۔ بابا طفیل ہمیں ساتھ والے کمرے میں لایا۔ یہاں آبنوس کی بنی ہوئی ایک مضبوط دیوار گیر الماری تھی۔ اس الماری کا ایک تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ بابے طفیل نے پٹ کھولا۔ اندر لکڑی کا ایک باکس تھا۔ باکس کی لمبائی ڈھائی فٹ کے قریب رہی ہو گی۔ اس کی چوڑائی ایک فٹ اور اونچائی ایک فٹ سے تھوڑی کم محسوس ہوتی تھی۔

باکس کے اطراف میں سرخی مائل مٹی لگی ہوئی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ باکس کہیں زمین میں دبا رہا ہے۔ باکس کا ایک کونا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ ذہن میں فوراً یہ آیا کہ یہی وہ باکس ہے جس کے لئے یہاں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ یہ وہی آرا کوئے والا نادر باکس تھا...... لیکن یہ خالی تھا۔ ایس پی تیمور نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ باکس میں اخباری کاغذوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ کاغذ غالباً مجسمے کو خراش وغیرہ سے بچانے کے لئے تہ در تہ باکس میں رکھے گئے تھے۔

''مجسمہ کہاں ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''آپ خود اندازہ لگا لیں جی کہ کہاں ہے۔ مہناز اور اس کا ساتھی لے گئے ہیں۔''

رات کو گیٹ پر موجود رہنے والا سب انسپکٹر بھی کمرے میں موجود تھا۔ ایس پی تیمور نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر مہناز کتنے بجے نکلی تھی کوٹھی سے؟''

''یہی کوئی ایک بجے کا وقت ہو گا۔''

''اور کون تھا؟''

''وہی سانولے سے رنگ والا ڈاکٹر جو رات دس بجے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کی مہران گاڑی تھی۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس وقت وہ دونوں کہاں جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز نے کہا تھا کہ جلالی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ فوری طور پر کچھ دواؤں کی ضرورت ہے جو لاہور سے ملیں گی۔ بس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جاتے ہیں۔''

ایس پی تیمور نے کہا۔ ''تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر جلالی صاحب کی طبیعت خراب ہے تو پھر وہ دونوں کیوں جا رہے ہیں؟ ان میں سے ایک کو یہاں موجود رہنا چاہئے تھا۔''

''جی، اس وقت یہ بات دماغ میں نہیں آئی۔ ویسے بھی میرا خیال تھا کہ شاید بڑے صاحب کو کوئی انجکشن وغیرہ لگایا گیا ہے اور فی الحال وہ سو رہے ہیں۔''

''گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا ہے؟''

''بالکل جناب! گاڑی کی یہاں سے روانگی کا بالکل ٹھیک ٹائم بھی لکھا ہو گا رجسٹر میں۔''

ایس پی تیمور اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس کے حکم پر کوٹھی کے تینوں بیرونی دروازے بند کر دیئے گئے اور گارڈز کو ہائی الرٹ کر دیا گیا۔ سنسنی کی کیفیت شدید ہوتی جا رہی تھی۔

میں مبہوت سا لکڑی کے اس باکس کے سامنے کھڑا تھا جو اب تک ایک معما بنا رہا تھا۔ وہ اب بھی ایک معما ہی تھا کیونکہ اس کے اندر اصل چیز موجود نہیں تھی۔

بابا طفیل مسلسل اپنی سفید داڑھی کو آنسوؤں سے بھگو رہا تھا۔ اسے جیسے یقین ہو چکا تھا

کہ وہ اب جلالی صاحب کو زندہ نہیں دیکھ پائے گا۔

میں نے باکس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ یہ یہاں موجود نہیں تھا۔ ورنہ تلاش کے وقت جاوا کے ہتھے چڑھ گیا ہوتا، یا ریان کے لوگ اسے لے اڑے ہوتے۔ لگتا ہے کہ یہ دو چار دن پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' بابے طفیل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں شام کے وقت جلالی کی طبیعت کافی اچھی تھی۔ بالکل ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ شام سے کچھ دیر پہلے ہی جیپ پر بیٹھ کر سیر کے لئے نکل گئے تھے۔ ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ مغرب سے کوئی ایک گھنٹا بعد واپس آئے تھے۔ جیپ سامنے کی طرف کھڑی کرنے کے بجائے انہوں نے یہاں پچھلے صحن میں کھڑی کی تھی۔ اپنے کمرے کے پچھلے دروازے کے بالکل سامنے۔ مجھے اس وقت بھی خیال آیا تھا کہ یہ جیپ ادھر کیوں لے آئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اسی شام جلالی یہ لکڑی کا صندوق کہیں سے نکال کر لائے تھے...... ہاں، ایک بات اور یاد آئی......'' بولتے بولتے بابا طفیل ایک دم چونک سا گیا۔

وہ بولا۔ ''مجھے یاد آ رہا ہے کہ اسی رات گیارہ بارہ کے قریب مجھے فرش پر کچھ گھسیٹے جانے کی آواز بھی آئی تھی۔ ہاں، گیارہ بارہ کا ٹائم ہی ہو گا۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ جلالی جی اپنے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا بھی لیکن کچھ کہا نہیں پھر دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت انہوں نے یہ صندوق ہی گھسیٹا ہو۔''

میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے ذریعے صندوق کو احتیاط سے پلٹ کر دیکھا۔ کافی حد تک بابے طفیل کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ صندوق نما باکس کی نچلی سطح پر گھسیٹے جانے کے نشان موجود تھے۔ خشک لکڑی کا یہ باکس زیادہ وزنی نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن سات آٹھ کلو سے زیادہ نہیں تھا اور اگر آرا کوئے کا وزن دس کلو بھی تھا تو پھر ٹوٹل وزن 18 کلو کے قریب بنتا تھا...... بے شک جلالی صاحب بیماریوں کے نرغے میں آ کر بہت کمزور ہو چکے تھے پھر بھی ان میں بلا کی مزاحمت تھی۔ جب ان کی حالت بہتر ہوتی تھی تو وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر توانا دکھائی دیتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس شام انہوں نے اکیلے ہی اس باکس کو زمین سے نکالا ہو اور جیپ پر رکھ کر یہاں لے آئے ہوں۔

میں نے کہا۔ ''بابا! یہ بات تو اب تقریباً صاف ہے کہ یہ وہی باکس ہے جس کے لئے یہ ساری کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جلالی صاحب اسے اس کی محفوظ جگہ

سے نکال کر یہاں کیوں لے آئے؟''

''میں تو ایک مسکین نوکر ہوں اس گھر کا۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے بابا طفیل! تم اتنے بھی بے خبر نہیں ہو۔ جلالی صاحب بہت بھروسا کرتے تھے تم پر۔''

میرے لہجے نے بابے طفیل کو ذرا چونکایا لیکن اس نے اس بارے میں کچھ کہا نہیں۔ میں بابے طفیل کو جلالی صاحب اور مہناز کی خفیہ شادی کے حوالے سے کرید سکتا تھا لیکن ابھی یہ موضوع چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اپنی توجہ موجودہ صورت حال پر ہی مرکوز رکھی۔ میں نے کہا۔ ''بابا! میرا خیال ہے کہ تم جلالی صاحب کے مزاج کو جتنا سمجھتے ہو شاید ہی کوئی اور سمجھتا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جلالی صاحب نے یہ باکس ڈاکٹر مہناز کے سپرد کرنے کے لئے ہی اس کی خفیہ جگہ سے نکالا ہو اور یہاں پہنچایا ہو؟''

''لیکن پتر جی! اگر ایسی بات ہوتی تو پھر تالے کیوں توڑے جاتے اور چیزیں کیوں اٹھائی جاتیں؟ وہ بڑی غلط زنانی نکلی ہے۔ وہ ہر وقت جلالی کے قریب رہ کر ہر اونچ نیچ کی خبر رکھتی رہی ہے۔ اسے ٹوہ لگ چکی ہو گی کہ جلالی جی صندوق کہیں سے نکال کر کوٹھی میں لے آئے ہیں۔ اس نے موقع دیکھا۔ اپنے ساتھی کو بلایا اور مورتی لے اڑی۔ اس کے لئے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ...... اس نے خود ہی جلالی جی کو بے ہوشی کا ٹیکا شیکا لگا دیا ہو۔''

میں نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا۔ باکس کا ایک کونا ٹوٹا ہوا تھا جیسے اسے کہیں سے پھینکا گیا ہو۔ یہ ٹوٹا کونا یقیناً اس واقعے کی نشانی تھا جب اس باکس کو کسی نامعلوم شخص نے چلتی گاڑی میں سے جھاڑیوں میں پھینکا تھا اور یہ جلالی صاحب تک پہنچا تھا۔ باکس پھینکنے والا ابرار صدیقی ہی تھا یا کوئی اور...... یہ بات بھی ابھی تک ایک معما تھی۔ ابرار صدیقی کے بارے میں ابھی تک کوئی اچھی بری خبر ہم تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔

اسی دوران میں میرے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اسکرین پر دیکھا، عمران کا نمبر تھا۔ دل دھڑک اٹھا۔ جلالی صاحب کی طرف سے کوئی بری خبر آ سکتی تھی۔ خبر آئی لیکن وہ اچھی نہ بری۔ جلالی صاحب کی حالت نازک تھی۔ وہ اسپتال پہنچ چکے تھے اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ کومے میں جا چکے ہیں۔ یعنی ابھی وہ سانس لے رہے تھے۔ زندوں میں شامل تھے۔

ڈاکٹر مہناز کے بارے میں میری سوچ ہمیشہ مثبت رہی تھی۔ وہ جس جانفشانی سے ہمہ وقت جلالی صاحب کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی، وہ متاثر کن بات تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے مریض کے علاج میں آخری حد سے بھی آگے چلی گئی ہے۔ یہ ایک انوکھی مثال تھی۔ اس نے اپنے اور جلالی صاحب کے درمیان ہر فاصلہ مٹا دیا تھا۔ اس فاصلے کو مٹانے کے لئے وہ مذہبی اور معاشرتی تقاضا بھی پورا کر دیا تھا جسے ہم شادی کہتے ہیں۔ لیکن...... اس سب کے باوجود جو کچھ اب سامنے آ رہا تھا، وہ بھی تحیر انگیز تھا۔ مکمل تحقیق تو ظاہر ہے کہ پولیس کو...... ہی کرنا تھی لیکن جو شواہد یہاں موقع پر نظر آ رہے تھے، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے یا انہیں بے ہوش کرنے کے بعد ڈاکٹر مہناز اور اس کے ساتھی نے دونوں کمروں کی تلاشی لی۔ تالے توڑے اور بہت سی دوسری چیزوں کے علاوہ نایاب مجسمہ آرا کوئے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

انسان ایک پہیلی ہے اور دلوں کے راز اللہ...... ہی جانتا ہے۔ چند دن پہلے تک ہم فتح محمد کو اس کوٹھی کی کالی بھیڑ سمجھتے تھے اور سیکرٹری ندیم کو نمک حلال ملازم...... لیکن جو حقیقت سامنے آئی، وہ برعکس تھی۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہم نے ''شریف صورت'' ندیم کا جو روپ دیکھا، وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ اب یہاں ڈاکٹر مہناز کے بارے میں ایک مختلف صورتِ حال سامنے آ رہی تھی۔ میں نے اب تک کئی بار اس کے سیل فون پر رابطے کی کوشش کی تھی مگر فون بند تھا۔

اسی دوران میں ایس پی تیمور اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ پھر آن موجود ہوتا۔ وہ موقع پر موجود ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور سوالات کر رہا تھا۔ پولیس فوٹو گرافر اور فنگر پرنٹس اٹھانے والے اہلکار بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ہم سب کو باہر نکال دیا اور تیزی سے کام میں مصروف ہو گیا۔

اسی دوران میں عمران کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے۔ جلالی صاحب کے لئے ہم جو کر سکتے تھے، کر چکے ہیں۔ اب تمہاری ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تم ڈاکٹر مہناز کی والدہ کو شکل سے پہچانتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ پہچان لوں گا۔ لیکن کیا معاملہ ہے؟''

''مہناز غائب ہو چکی ہے۔ اس کا واحد کھوج اس کی والدہ ہے۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ مہناز یہاں سے غائب ہوئی ہے تو آرا کوئے سمیت خراماں خراماں اپنی اماں جان کے پاس پہنچ جائے گی؟''

''تم ابھی کچے جاسوس ہو۔ تمہارے عقل کے دانت ابھی نکلنے ہیں۔ مہناز اپنی اماں جی کے پاس تو نہیں جائے گی لیکن وہ جلد یا بدیر ان سے رابطہ ضرور فرمائے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی والدہ خطرے میں ہے۔ ہمیں اسے اس جگہ سے ہٹانا ہو گا جہاں وہ موجود ہے۔''

''تو کیا میرا ابھی آنا ضروری ہے؟''

''نہیں، اگلی جمعرات تک آ جانا۔ یار! تم بندے ہو کہ چغد۔ یہ سوچنے کا نہیں، کچھ کرنے کا وقت ہے۔ نپولین بونا پارٹ میرے دادا جی کا یار بیلی تھا۔ دونوں نے اکٹھے ہی جڑانوالہ سے میٹرک پاس کیا تھا۔ دادا جی نپولین کو پیار سے نوپی نوپی کہتے تھے۔ دادا جی نے مجھے بتایا تھا کہ نوپی نے اپنے دشمنوں پر ہمیشہ اس لئے فتح پائی کہ وہ ان کی توقع سے پہلے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ تو میرے پیارے شہزادے! مال گاڑی مت بنو، ایکسپریس بنو۔ شٹاشٹ...... شٹاشٹ...... جتنی جلدی ہو سکتا ہے، مینار پاکستان کے سامنے پہنچ جاؤ، راوی روڈ والے گیٹ پر۔''

میرے اور عمران کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں روانہ ہو گیا۔

ایس پی تیمور نے سارے دروازے بند کروا رکھے تھے لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ یہاں میری اور عمران کی ایک خاص اتھارٹی ہے۔ اس نے مجھے نہ صرف جانے کی اجازت دی بلکہ ایک اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ وہ میرے ساتھ جائے اور پولیس موبائل میں مجھے مطلوبہ جگہ تک پہنچائے۔ ہم مین گیٹ سے نکلے۔ یہاں میڈیا والوں کا ہجوم تھا۔ ان کی رنگ برنگی اسٹیشن ویز نظر آ رہی تھیں۔ یہ رات کا آخری پہر تھا مگر ٹیوب لائٹس اور سرچ لائٹس کی وجہ سے گیٹ کے آس پاس دن کا سماں تھا۔ ہماری گاڑی دیکھ کر کچھ رپورٹرز ہماری طرف لپکے لیکن اے ایس آئی گل احمد تیزی سے آگے نکل گیا۔ وہ اپنے نام ہی کی طرح ذرا کھلا کھلا اور خوش باش شخص تھا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی عام پولیس والوں سے قدرے مختلف نظر آتا تھا۔

وہ بولا۔ ''تابش صاحب! آپ کے دوست عمران صاحب کا تو بڑا چرچا ہو گیا ہے جی۔ ہر اخبار میں خبر آئی ہے اور ٹی وی پر بھی بتایا گیا ہے کہ انہوں نے جاوا جیسے انڈین بدمعاش کو للکارا ہے اور اسے سرحد پار جانے پر مجبور کر دیا ہے......'' پھر وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ ''کیا

واقعی جاوا انڈیا واپس چلا گیا ہے یا یہیں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ لوگ یہ سوال عمران سے کرو تو شاید کوئی جواب مل جائے۔"

میں خاموشی سے سفر کرنا چاہ رہا تھا لیکن گل احمد باتونی شخص تھا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتا تھا۔ مثلاً جلالی صاحب کا انتقال ہو گیا تو آگے کیا ہوگا؟ کیا ڈاکٹر مہناز واقعی خود یہاں سے گئی ہے، کہیں اسے کسی نے اغوا تو نہیں کیا؟ آراکوئے کا مجسمہ واقعی غائب ہے یا کوٹھی کے اندر ہی کہیں چھپایا گیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس کے ان سوالوں کے مختصر ترین جواب دیئے۔ اس حوصلہ شکنی کے باوجود وہ گاہے بگاہے بات چھیڑتا رہا۔ پانچ دس منٹ چپ رہنے کے بعد وہ اچانک بولا۔ "تابش بھائی! یہ جو عمران صاحب نے بتایا تھا کہ جاوا نے کچھ عرصہ پہلے انڈین اداکارہ مادھوری سے ہرول بھرشاٹ کیا تھا...... تو کیا واقعی کوئی اس قسم کا کام ہوا تھا؟"

"تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی دماغ میں سوال آ رہا ہے۔ ویسے یہ ہے تو زیادتی نا کہ ایک لڑکی جو کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کے پاس کام مانگنے آتی ہے، اس کے ساتھ ایسا کیا جائے۔"

"کیا کیا جائے؟"

"یہی ہرول بھرشاٹ وغیرہ۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ہرول بھرشاٹ کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ وہ یونہی چھوڑی تھی عمران صاحب نے۔ ان کی یہ عادت ہے۔"

"واقعی؟" گل احمد نے دیدے گھمائے۔

"میں عدالت میں جا کر حلفیہ بیان دینے کو تیار ہوں۔" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"حیرت ہے۔ وہاں گیٹ پر تو ایک اخباری نمائندہ بڑے دعوے سے کہہ رہا تھا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے اور اس کا مطلب بڑا غلط قسم کا ہے...... چلو شکر ہے، آپ نے میرا ذہن صاف کر دیا۔ ورنہ بڑے گندے گندے خیال آ رہے تھے۔" اس نے بظاہر سکون کی سانس لی۔ لیکن لگتا تھا کہ دل ہی دل میں وہ جاوا کی طرف سے خاصا "مایوس" ہوا ہے۔

......آدھ گھنٹے بعد جب اے ایس آئی گل احمد نے مجھے مینار پاکستان کے مطلوبہ گیٹ پر اتارا تو رات کے ساڑھے تین چار کا وقت تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس بھی جیسے اونگھ رہی تھیں۔ میری ہدایت کے مطابق مجھے اتارنے کے بعد بھی گل احمد وہیں کھڑا رہا۔

ایک طرف سے عمران برآمد ہوا۔ بالکل ایسے لگا کہ زمین سے نکل آیا ہے۔ "یہ ساتھ کس کو لائے ہو؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ایک اے ایس آئی ہے۔ گل احمد نام ہے۔"

"چلو اچھی بات ہے۔ ہم ابھی اسے اپنے ساتھ رکھیں گے بلکہ اسی کی گاڑی پر جائیں گے۔ ذرا آسانی رہے گی۔ میں اپنے والی گاڑی یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم اے ایس آئی گل احمد کے ساتھ تیز رفتاری سے لوئر مال روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم ایک رہائشی آبادی میں داخل ہوئے پھر ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے جا کر رک گئے۔ یہ صاف ستھرا اسپتال ایک بڑی کوٹھی کے اندر واقع تھا۔ ہم نے گل احمد کو گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا اور خود اس اسپتال نما کلینک میں داخل ہو گئے۔ رات کے اس پہر اسپتال کے اندر باہر خاموشی تھی۔ یہاں دس پندرہ کمرے اور تین درمیانے سائز کے وارڈز تھے۔ زیادہ تر مریض سو رہے تھے۔ ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی مریض کے اٹینڈنٹ ہیں۔ عمران کے ہاتھ میں دواؤں والا ایک چھوٹا سا شاپر بھی تھا۔ کسی نے ہم سے روک ٹوک نہیں کی۔ ایک وارڈ کے سامنے جا کر عمران رک گیا۔ یہ فیمیل وارڈ تھا۔ دروازے کے شیشے میں سے دس بارہ مریض خواتین نظر آ رہی تھیں۔ اِکا دُکا تیماردار بھی تھے۔ وارڈ کے اندر ایک نرس کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی غالباً سسپنس ڈائجسٹ کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کی۔ "مہناز کی والدہ کو پہچان سکتے ہو؟"

میں نے دھیان سے دیکھا۔ "ہاں...... دائیں طرف پانچواں بیڈ ہے۔"

"آر یو شیور؟"

"یس۔"

ہم اندر داخل ہوئے اور سیدھے مطلوبہ بیڈ پر پہنچے۔ وارڈ کی مدھم روشنی میں خاتون نیم دراز تھیں اور ہولے ہولے کھانس رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونکیں اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد عمران سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "آنٹی! ہم جلالی فارم ہاؤس سے آئے ہیں۔ آپ کو ایک خاص اطلاع دینی ہے۔"

خاتون کا چہرہ ہلدی ہو گیا۔ "مم...... مہناز تو خیریت سے ہے نا؟"

"وہ خیریت سے ہے لیکن اطلاع اسی کے بارے میں ہے۔"

خاتون نے گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ساتھ والے بستر کی خاتون بھی ہماری طرف دیکھنے لگی۔

عمران نے مہناز کی والدہ سے کہا۔ ''اگر آپ کو چلنے میں زیادہ دشواری نہ ہو تو سامنے لابی میں آ جائیے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

مہناز کی والدہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کوشش کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عمران بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بے چینی تھی۔ ہم مہناز کی والدہ کو سہارا دے کر لابی تک لائے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عمران نے اپنے مخصوص ہمدرد انداز میں کہا۔ ''آنٹی! وہاں فارم میں پھر گڑبڑ ہوئی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ ڈاکٹر مہناز خطرہ محسوس کر کے کہیں نکل گئی ہے۔ کچھ لوگوں کی طرف سے آپ کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ......''

ابھی عمران کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دو گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے آئیں اور اس پرائیویٹ اسپتال کے عین سامنے آ کر رکیں۔ پہیوں کے چرچرانے کی آواز دور تک گونجی۔ چند ہیولے برآمد ہوئے اور لپکتے ہوئے اسپتال کے دروازے کی طرف آئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مین دروازے تک پہنچتے، رات کا سناٹا فائرنگ کی خوفناک آواز سے چکنا چور ہو گیا۔ میں نے ایک ہیولے کو گولی کھا کر اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ دوسرے آڑ لینے کے لئے مختلف اطراف میں بھاگے۔

یہی وقت تھا جب دو تین اور گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک اسٹیشن ویگن نے بڑے سنگین انداز میں ایک ٹویوٹا کار کو سائیڈ ماری اور ٹویوٹا کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک شوکیس سے جا ٹکرائی۔ عمران چلایا۔ ''آنٹی! ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

آنٹی ہکا بکا تھیں۔ وہ جیسے یکسر مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہم نے انہیں اٹھایا اور اپنے ہاتھوں کی کرسی پر بٹھا لیا۔ اسپتال میں افراتفری مچ گئی تھی۔ جن مریضوں کے لئے ہلنا جلنا بھی محال تھا، وہ جان بچانے کے لئے بستروں سے اتر آئے تھے۔ ہم دونوں آنٹی کو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ میری ٹانگ ایک بار پھر درد سے سنسنانے لگی۔

ایک ڈیوٹی ڈاکٹر ہمارے راستے میں آئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کہاں لے جا رہے ہو انہیں؟''

عمران نے دھکا دے کر ڈاکٹر کو ایک طرف گرایا۔ ہم آنٹی سمیت سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے۔ بلندی سے اردگرد کا منظر زیادہ وضاحت سے ہمارے سامنے آیا۔ یہ لرزہ خیز تھا۔ اسپتال کے اردگرد کم از کم ایک درجن مشکوک گاڑیاں آڑی ترچھی کھڑی تھیں۔ اسپتال کے عین سامنے اور بائیں جانب اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ شیشے چھناکوں سے ٹوٹ

رہے تھے۔ ٹائر برسٹ ہو رہے تھے۔ لوگ چلا رہے تھے اور اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اور کانپ گیا۔ پولیس موبائل میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس کے قریب ہی اے ایس آئی گل احمد سڑک پر اوندھے منہ بے سُدھ پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں کو باہمی عداوت نے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا ہے اور وہ ہر جگہ وحشی جانوروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ تصادم کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے چار فٹ اونچی منڈیر پھاندی اور ساتھ والی چھت پر آ گیا۔ آنٹی سکتہ زدہ تھیں۔ ان کا وزن بہت زیادہ نہیں تھا۔ عمران نے انہیں بازوؤں میں اٹھایا اور منڈیر کے اوپر سے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے آنٹی کو گود میں اٹھایا۔ عمران بھی منڈیر پھاند کر دوسری چھت پر آ گیا۔ یہ بھی کسی کمرشل بلڈنگ کی چھت تھی۔ برساتی کی طرف بس ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس بلڈنگ کی چھت ایک تیسری بلڈنگ سے ملی ہوئی تھی۔ ہم بہ آسانی اس تیسری چھت پر پہنچ گئے۔ یہ تیسری عمارت ابھی زیرِ تعمیر تھی۔ غالباً تازہ لینٹر ڈالا گیا تھا۔ لینٹر پر تھوڑا بہت پانی کھڑا تھا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ مکمل تاریکی تھی۔ یہاں ہر طرف اینٹیں اور ریت وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔

اسپتال کے اردگرد ہونے والی فائرنگ مسلسل جاری تھی۔ پسٹل، ماؤزر اور آٹومیٹک رائفلیں استعمال ہو رہی تھیں۔ گاہے بگاہے ایک ''ری پیٹر'' کی زوردار آواز بھی ابھرتی تھی۔ اسی دوران میں ہم نے پولیس موبائلز کے سائرن بھی سنے۔ پولیس موقع پر پہنچ رہی تھی۔ مجھے اے ایس آئی گل احمد کا خیال آیا۔ اسپتال کی ایک کھڑکی میں سے ہم نے اسے سڑک پر بے سُدھ پڑے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ''کام'' آ گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ صرف زخمی ہو اور اسے طبّی امداد کی ضرورت ہو۔ اب پولیس کے آ جانے سے کم از کم اسے تو طبّی امداد مل ہی سکتی تھی۔

ہمیں زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے ہی ایک سوزوکی ڈبا کھڑا نظر آیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ڈرائیور غالباً اندھا دھند فائرنگ دیکھ کر یہاں گلی کے موڑ پر ہی رک گیا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''ڈبے کی طرف چلو۔''

ہم ڈبے کی طرف بڑھے۔ عمران اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عقبی دروازہ بھی کھول دیا۔ میں آنٹی سمیت پچھلی نشست پر چلا گیا۔ ڈرائیور ایک درمیانی عمر کا شخص تھا۔ موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں کھلی رہ

گئیں۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا،عمران نے کہا۔''بڑے بھائی!ہم ایمرجنسی میں ہیں۔ آنٹی جی کو اسپتال لے جانا ہے۔تم گاڑی ریورس کرواور بائیں طرف موڑلو۔''

ڈرائیور یقیناً پہلے ہی اندھا دھند فائرنگ کی وجہ سے خوف زدہ تھا،مزید ڈر گیا۔اس نے کچھ کہنا چاہا مگر عمران کی تیز آواز نے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔عمران بولا۔''گاڑی آگے بڑھاؤ۔ورنہ مسئلہ ہو جائے گا تمہارے لئے۔''

ڈرائیور نے ڈری ہوئی نظروں سے نیچے دیکھا۔یقیناً اسے عمران کے ہاتھوں میں پستول نظر آیا تھا۔ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر جب عمران نے اسے بازو سے پکڑا تو ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق اس نے گاڑی ریورس کی اور بائیں طرف موڑلی۔

میں نے سکتہ زدہ آنٹی کو نشست پر بٹھا دیا تھا۔وہ سرتا پا لرز رہی تھیں۔عمران نے کہا۔

''آنٹی!میں نے ٹھیک کہا تھا نا کہ آپ کو خطرہ ہے۔یہ اسپتال سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے،آپ کے لئے ہو رہا ہے۔''

''مم......میرے لئے؟لیکن میں نے کیا کیا ہے؟''

''آپ نے کچھ نہیں کیا مگر جو لوگ مہناز کو ڈھونڈ رہے ہیں،وہ آپ کو بھی ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''مم......مہناز ٹھیک تو ہے نا؟'' آنٹی نے پھر لرزاں آواز میں پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ہو سکتا ہے کہ ہم جلد اس سے آپ کی ملاقات بھی کرا دیں۔''عمران نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ آخری الفاظ اس نے صرف تسلی دینے کے لئے کہے ہیں...... مہناز کہاں ہے؟اس کے بارے میں ابھی ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا۔

آنٹی موقع محل کی پروا کئے بغیر جلالی کو کوسنے دینے لگیں۔''اس بڈھے نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے اور کام دیکھو۔اللہ کرے اس کی اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔اللہ کرے اس کا بھی ایسے یہ تماشا لگے......'' وہ باقاعدہ رونے لگیں پھر روتے روتے ہی پوچھا۔''اب مجھے کہاں لے جا رہے ہو بیٹا؟''

عمران نے آنٹی کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی ایک طرف روک لے۔اس نے فوراً عمران کی ہدایت پر عمل کیا۔اسے صرف اور صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔اب ہم نہر کے کنارے شاہ جمال والے موڑ کے پاس تھے۔سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔عمران نے تحکم آمیز لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔''بڑے بھائی!نیچے اتر جاؤ۔اگر پولیس وغیرہ کے چکر میں پڑے تو سخت مصیبت میں پھنسو گے۔اگر خاموش رہے تو گاڑی تمہیں شہر میں ہی کہیں کھڑی مل جائے گی۔ اپنا موبائل نمبر دو مجھے۔''

ڈرائیور نے ہکلاتے ہوئے عمران کو اپنا فون نمبر بتایا جسے عمران نے کاغذ پر لکھ لیا۔اس کے بعد ڈرائیور گاڑی سے اترا اور دور کھڑا ہو گیا۔عمران نے ڈرائیونگ نشست سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت سب سے پہلا کام تو آنٹی جی کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانا ہے۔''عمران نے کہا اور گاڑی پل کے پاس سے اندرونی سڑک پر موڑلی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ڈیفنس والے گھر کی طرف جا رہا ہے۔شاید فی الوقت یہی قریب ترین ٹھکانا اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

قریباً دس منٹ کی برق رفتار ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں تھے۔یہ وہی جگہ تھی جہاں فرح اور عاطف بڑی حفاظت کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔عمران کی ساتھی شاہین اور ننھا بالو بھی اپنی آپا صفیہ سمیت یہاں موجود تھا۔جیلانی کے سوا سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔جیلانی کو بھی ہماری اچانک آمد نے حیران کر دیا۔ہمارے ساتھ دہشت زدہ آنٹی کو دیکھ کر وہ مزید حیران ہوا۔ہم نے سب سے پہلے آنٹی کو ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچایا اور ان کا بلڈ پریشر کم کرنے کے لئے انہیں ڈسپرین وغیرہ کھلائی۔میرے اور عمران کے ہمدردانہ رویے نے آنٹی کا خوف کافی کم کر دیا اور انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ یہاں محفوظ ہیں۔

عمران نے اس کوٹھی تک پہنچتے ہوئے گاڑی کو کافی گھمایا پھرایا تھا۔اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ آنٹی کو یہاں کے محل وقوع کا اندازہ ہوا ہو گا۔عمران نے جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ سوزوکی ڈبے کی نمبر پلیٹ بدلے اور اسے ڈیفنس سے باہر نہر کنارے کسی جگہ کھڑا کر کے آئے۔جیلانی اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا۔عمران نے ڈسپرین کے ساتھ ہی ایک سکون بخش دوا بھی آنٹی کے معدے میں پہنچا دی تھی۔وہ جلد ہی اپنے سوالات ترک کر کے اونگھنے لگیں۔

ہم کامن روم میں آ بیٹھے۔اب دن کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔میں نے کہا۔

"تمہارا یہ اندازہ بالکل درست نکلا کہ ریان اور جاوا گروپ کے لوگ اب ایک دم مہناز کی والدہ کی طرف جھپٹیں گے۔"

وہ ادا سے مسکرایا۔ "میرے اندازے ہمیشہ درست ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو فساد پلس چینل دن رات ترقی کر رہا ہے...... اب تم بتا سکتے ہو کہ کل کیا ہوگا؟ لیکن میں بتا سکتا ہوں۔"

"کیا ہوگا؟"

"آج سوموار ہ، کل یقیناً منگل ہوگا۔ نہ ہوا تو میرا نام بدل دینا۔"

"یہ خبر تو نہ ہوئی۔" میں نے دلیل دی۔

"خبر ہوئی نا، کیوں نہ ہوئی۔ تم نے بحث چھیڑ دی ہے نا۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ تمہاری اس لمبی ناک پر مکا مار کر تمہارا بانسا کڑک کر دوں گا اور اپنا کوئی خراب کیمرا بھی خود ہی توڑ ڈالوں گا پھر چینل پر خبر چلے گی۔ نیوز چینل کے اہل کاروں پر فرائض کی انجام دہی کے دوران میں بہیمانہ نہ نہ تشدد۔"

"بہیمانہ نہ نہ کیا ہوتا ہے؟"

"جب تشدد زیادہ برا ہو تو اس بہیمانہ نہ نہ کہتے ہیں۔ کسی بھی لفظ یا ڈیو کلپ کو ری پیٹ کرنے سے اس کا امپیکٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔ تم مجھے باتوں میں مت الجھاؤ۔ پوری خبر سنو...... بہیمانہ نہ نہ تشدد کیا۔ کیمرا توڑ ڈالا...... بلکہ "توڑ ڈالا" بھی ذرا کمزور لفظ ہے...... چکنا چور کر ڈالا۔ چینل کے ملازمین کو عبرت ناک انجام کی دھمکیاں دیں۔ پتا چلا ہے کہ یہ تابش نامی شخص، ڈیفنس کی کوٹھی میں جوا کراتا ہے اور دو اشتہاری ملزموں کی پشت پناہی بھی کر رہا ہے۔ یہ تابش دراصل اس سابق ناظم کا بھتیجا ہے جس کے بڑے چچا کا چھوٹا داماد، صوبائی حکومت کے اہم وزیر کے پھوپھا صاحب کا کاروباری پارٹنر ہے۔ اس طرح سے یہ معاملہ صاف طور پر سیاسی اور حکومتی غنڈا گردی کا بنتا ہے۔ روز افزوں مہنگائی، بیڈ گورننس اور ملکی سلامتی کی مخدوش صورتِ حال ہی کیا کم تھی کہ اب یہ کیمرا ٹوٹنے والا زبردست بحران بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی عظیم تبدیلی آنے والی ہے۔ دانشور پہلے ہی، دو سال سے کہہ رہے ہیں کہ آنے والے چند دن بہت زیادہ اہم ہیں اور اب تو دنوں کی نہیں گھڑیوں کی بات ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جب ہم بریک پر جائیں تو ہمارے واپس آنے تک ملک میں بہت کچھ بریک ہو چکا ہو اور اس تبدیلی کی وجہ سے پوری دنیا میں طاقت کا توازن خراب بلکہ چکنا چور...... بلکہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو۔ اقوامِ متحدہ بیٹھی سر پکڑ کر رو رہی ہو اور نیٹو چلا چلا کر......"

"خدا کے لئے...... خدا کے لئے...... تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اس کے سامنے عاجزی سے ہاتھ جوڑے۔

وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔ ایک دم میں چونک گیا۔ مجھے آنٹی کے موبائل فون کا خیال آیا۔ جب ہم آنٹی کو لینے اسپتال جا رہے تھے تو ہمارے ذہن میں تھا کہ ان کا موبائل فون ضرور ساتھ لانا ہے لیکن وہاں ایک دم ہی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ ہمیں مہلت ہی نہیں ملی کہ ہم آنٹی کا شولڈر بیگ یا کوئی اور چیز ساتھ لے سکیں۔ عمران نے میرے چہرے سے میرے خیالات کا اندازہ لگا لیا اور بولا۔ "آنٹی کے موبائل فون کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون میرے سامنے رکھ دیا۔

"آنٹی کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... میں نے جاتے ساتھ ہی آنٹی کے تکیے کے نیچے سے نکال لیا تھا۔"

"ایک نمبر کے کھوچل ہو تم۔" میں نے کہا۔

"اور تم دو نمبر کے۔ یعنی کھوچل بھی ہو اور دو نمبر بھی۔"

"مہناز کو ٹرائی مار کر دیکھو اس کے نمبر پر۔"

عمران نے نمبر پریس کیا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ تیسری چوتھی کوشش بھی ناکام ہوئی تو اس نے آنٹی کی طرف سے مہناز کو "کال می" کا میسج بھیجا۔

"تمہارا دماغ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میسج بھیجنا اور پڑھنا کوئی اچھا کام نہیں یار لوگوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہے اس میں۔"

"یار! میں مہناز کے بارے میں بکواس کر رہا ہوں۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے کے بعد اس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ مل کر الماریوں کے تالے توڑے ہیں اور آرا کوئے سمیت دوسری چیزیں لے کر نکل گئی ہے۔"

وہ خلافِ توقع سنجیدہ ہو گیا۔ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "لیکن پتا نہیں مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ ڈاکٹر مہناز فارم ہاؤس سے پہلے نکلی ہے، جلالی صاحب کی طبیعت بعد میں خراب ہوئی ہے۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر الماریوں کے تالے

توڑے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جلالی صاحب بھی وہیں پر موجود تھے، ڈاکٹر مہناز ان سے چابیاں لے سکتی تھی۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ چابیاں کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں اور ان کی اجازت سے ہی مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر نے تالے توڑے ہوں۔"

"لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ ڈاکٹر مہناز پہلے نکلی ہے اور جلالی کی طبیعت بعد میں بگڑی ہے؟"

"جگر! میں نے کہا ہے نا کہ یہ میرا اندازہ ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر جلالی صاحب، مہناز کے جانے سے پہلے بے ہوش ہوئے ہیں تو بھی ہم یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مہناز نے ان سے دغا ہی کیا ہے۔ تالے توڑنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جلالی صاحب نے مہناز کو ہدایت کی ہو کہ وہ آرا کوئے لے کر یہاں سے نکل جائے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مہناز کو چابیاں وغیرہ سونپتے، وہ اچانک بے ہوش ہو گئے۔ افراتفری میں مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر نے قفل شکنی کی اور جلالی صاحب کی ہدایت کے مطابق چیزیں نکال کر لے گئے۔"

"یعنی تم دونوں صورتوں میں ڈاکٹر مہناز کو رعایتی نمبر ہی دینا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں۔ ہمیں ہر پہلو پر غور کرنا چاہئے۔" عمران نے کہا۔ "اور بہتر تو یہی ہے جگر کہ ہم ایک بار پھر موقعہ واردات کا جائزہ لیں۔"

"لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ کچھ لوگ ہمارا جائزہ بھی لے رہے ہیں اور انہوں نے باقاعدہ قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک تمہیں لمبا نہیں لٹا دیں گے، چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ کیا نام لے رہا تھا خبیث ندیم..... بھرت وچن، بھرت وچن رکھا ہوا ہے مہاشے جاوانے۔"

"اس کا انتظام بھی کر لیتے ہیں۔ آخر سرکس کمپنی میں کام کیا ہے یار! کوئی بھٹیارے تو نہیں ہیں ہم۔" عمران نے کہا۔

اسی دوران میں، میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ صبح کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ پہلی خبر ہی چونکا دینے والی تھی۔ یہ کچھ دیر پہلے لوئر مال روڈ کے علاقے میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی خبر تھی۔ پرائیویٹ اسپتال کے سامنے ہونے والی اس فائرنگ میں تین افراد موقع پر جاں بحق ہوئے تھے۔ کئی افراد زخمی تھے۔ پولیس کی گاڑی کو آگ لگنے کی خبر بھی نیوز میں موجود تھی۔ اے ایس آئی گل احمد کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ پیٹ میں گولی لگنے سے زخمی ہوا ہے۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ "ہمارے نمائندے نے اطلاع دی ہے کہ ہنگامہ شروع ہونے

سے تھوڑی دیر پہلے دو افراد تیمارداروں کی حیثیت سے ارباب کلینک میں داخل ہوئے اور انہوں نے ایک مریضہ کو اس کے بستر سے اٹھا کر لابی میں پہنچایا۔ اسی دوران میں کلینک کے سامنے اور اطراف میں کئی گاڑیاں آ کر رکیں اور ان میں موجود مسلح افراد نے ایک دوسرے پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ جب یہ خوفناک ہنگامہ برپا تھا، دونوں افراد مسز جمیلہ نامی اس خاتون کو لے کر اسپتال کی چھت پر پہنچے اور وہاں سے کہیں نکل گئے۔ بتایا جا رہا ہے کہ جمیلہ نامی یہ خاتون ایک لیڈی ڈاکٹر کی والدہ ہیں اور صرف تین دن پہلے کلینک میں داخل ہوئی تھیں...... ہمارے نمائندے نوید شیروانی اس وقت موقع پر موجود ہیں۔ ہم ان سے ارباب کلینک کی تازہ ترین صورت حال معلوم کرتے ہیں۔"

نوید نے پُرجوش لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "جیسا کہ آپ میرے عقب میں دیکھ رہے ہیں، جگہ جگہ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور نظر آتے ہیں۔ یہ میری بائیں طرف جو گاڑیاں کھڑی ہیں ان پر بھی جابجا گولیوں کے نشانات ہیں۔ اور یہ دیکھئے ناظرین! یہ دیکھئے یہ وہ جگہ ہے جہاں گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے۔ کم از کم دو لاشیں اور پانچ زخمی افراد اسی جگہ سے اٹھائے گئے ہیں۔ یہاں آپ کو ہر طرف گولیوں کے نشانات نظر آ رہے ہیں اور خول بھی بکھرے ہوئے ہیں ابھی تک...... اب میں آپ کو اس اسپتال کے ایم ایس ڈاکٹر ظفر چوہدری سے ملواتا ہوں اور اس واقعے کے حوالے سے ان کی رائے معلوم کرتے ہیں۔"

ایم ایس چوہدری صاحب غالباً منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ابھی ابھی اسپتال پہنچے تھے اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "محترمہ جمیلہ نامی وہ مریضہ جو اسپتال کے وارڈ سے غائب پائی گئی ہیں، تین دن پہلے ہائی بلڈ پریشر اور ہائی شوگر لیول کی شکایات کے ساتھ یہاں داخل ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ محترمہ جمیلہ، لیڈی ڈاکٹر مہناز کی والدہ ہیں۔ یہ لیڈی ڈاکٹر مہناز وہی ہیں جن کا ذکر جلالی فارم ہاؤس والے واقعات کے سلسلے میں آ رہا ہے۔ اس سلسلے میں مکمل تحقیق کرنا تو پولیس کا کام ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسپتال کے باہر جو خونی تصادم ہوا ہے، وہ ان دو گروپوں کے درمیان ہی ہوا ہے جو اس سے پہلے فارم ہاؤس کے باہر اور پھر لاہور شیخوپورہ روڈ کے قریب بھی ایک دوسرے پر حملہ کر چکے ہیں۔"

نیوز کاسٹر نے اسکرین پر نمودار ہو کر کہا۔ "ہم نے اس سلسلے میں ایس ایس پی صاحب سے رابطہ کیا ہے۔ ان کی رائے معلوم کرتے ہیں۔"

باوردی پراچہ صاحب اسکرین پر نمودار ہوئے۔ تین چار لاشیں گر چکی تھیں۔ ایک

خاتون غائب تھی اور بہت سا مالی نقصان بھی ہوا تھا۔صورتِ حال کی سنجیدگی ٹوٹ کر پراچہ صاحب کے چہرے پر برس رہی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو وہی ''ملک گیر شہرت کا حامل'' گھسا پٹا فقرہ دہرایا کہ ہم پوری تن دہی سے کوشش کر رہے ہیں، کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے اور مجرموں کو جلد قانون کے کٹہرے میں کھڑا کریں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی چھاپا مار پارٹیوں کی تفصیل بتانے لگے تھے جب نیوز کاسٹر نے پھرتی سے انہیں ٹوکا اور پوچھا۔''جناب! ان دو افراد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو سب سے پہلے اسپتال میں داخل ہوئے اور جنہوں نے لیڈی ڈاکٹر مہناز کی والدہ کو وہاں سے غائب کیا؟ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک شخص بری طرح لنگڑا بھی رہا تھا؟''

پراچہ صاحب بولے۔''ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اسپتال کا عملہ جو حلیہ بتا رہا ہے، اس سے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی عمران نامی شخص ہے جو اس سے پہلے جاوا کے خاص کارندے قادرے کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے اور جلالی صاحب کا جاں نثار محافظ ہونے کا دعویٰ بھی کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی تابش ہوسکتا ہے لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ اس مرحلے میں یقین کے ساتھ......''

نیوز کاسٹر نے پیشہ ورانہ چابکدستی سے پولیس آفیسر کی بات کاٹی۔''پراچہ صاحب! خاتون کی گمشدگی کو اب چار گھنٹوں سے اوپر ہو چکے ہیں۔ شہر میں ہر طرف ناکے لگے ہیں، اس کے باوجود اس جرم کا راستہ روکا نہیں جاسکا۔ آپ کا کیا خیال ہے، مریضہ خاتون کے اغوا کا تعلق ڈاکٹر مہناز والے واقعے سے ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مریضہ خاتون کو اغوا کرنے والے لوگ ان کے ذریعے ان کی بیٹی ڈاکٹر مہناز تک پہنچنا چاہتا ہوں؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن......''

''اگر ایسا ہو بھی سکتا تھا اور خدشہ تھا کہ ایسا ہوگا کیونکہ مریضہ خاتون ڈاکٹر مہناز کی واحد قریبی عزیز ہیں، تو کیا ضروری نہیں تھا کہ حالات کو بھانپ کر خاتون کی حفاظت کا انتظام کیا جاتا؟''

اس سے پہلے کہ بوکھلایا ہوا پولیس آفیسر کوئی جواب دیتا، عمران نے ٹی وی کی آواز بند کی اور بولا۔''یار! کہیں یہ آنٹی جمیلہ اپنے کمرے میں ٹی وی کھول کر نہ بیٹھ جائیں......انہیں پتا چل گیا کہ مہناز، فارم ہاؤس سے غائب ہے اور اس پر الزامات لگ رہے ہیں تو وہ ضرور خود کو ہارٹ اٹیک کروا بیٹھیں گی۔''

میں آنٹی جمیلہ والے کمرے میں گیا۔ عمران نے انہیں سکون بخش دوا دی تھی۔ وہ سو رہی

تھیں۔ میں بہ آہستگی ٹی وی ٹرالی دھکیل کر ان کے کمرے سے باہر لے آیا......

عمران گہری سوچ میں کھویا ہوا لگتا تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے۔ میں نے کہا۔''ابھی کچھ دیر پہلے سرکس کمپنی والی بات تم کیا کہہ رہے تھے؟ کیا کوئی ناٹک رچانے یا سوانگ بھرنے کا ارادہ ہے؟''

''وقت آیا تو سوانگ بھی بھر لیں گے لیکن فی الحال ہم جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ صاحب کے ساتھ پولیس گاڑی میں فارم ہاؤس تک جائیں گے اور اب تک ہونے والی تفتیش کے بارے میں جانیں گے۔''

عمران غالباً حمزہ صاحب سے پہلے ہی بات کر چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہم قریباً ایک گھنٹے بعد یہاں سے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچیں گے۔ وہاں سے ایک گاڑی جلالی فارم ہاؤس جا رہی ہے۔

اب دن چڑھ آیا تھا۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ یکے بعد دیگرے اس کوٹھی کے سارے مکین بیدار ہوگئے۔ میری من موہنی بہن فرح، بھائی عاطف، ننھا بالو اور شاہین وغیرہ۔

فرح آبدیدہ ہو کر میرے گلے لگ گئی۔ میں آج کئی ہفتے بعد اسے اپنی صورت دکھا رہا تھا۔ وہ اور عاطف یہ بھی جانتے تھے کہ میں کچھ خطرناک کاموں میں الجھا ہوا ہوں بلکہ میں اور عمران دونوں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔''بھائی جان! آپ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔''

میں نے اس کا سر چوما۔''میں نہیں بدلا۔ وقت بدل گیا ہے۔''

عاطف بھی میرے کندھے سے لگ گیا۔ میں نے اسے بھی اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ اسی دوران میں صفیہ بھی بالو کو اٹھائے نمودار ہوگئی۔ بالو کے سرخ و سپید رخسار قندھاری اناروں کی طرح دہک رہے تھے اور مجھے ایک بھولے بسرے چہرے کی یاد دلا رہے تھے۔ بالو اسی گم گشتہ چہرے کی نشانی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور خوب چوما۔

وہ مجھے ذرا حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔''ایسے بٹر بٹر کیا دیکھتے ہو؟''

فرح نے کہا۔''آپ اس طرح ہفتوں کے بعد آئیں گے تو ہم بھی ایسے ہی دیکھنے لگیں گے۔'' صفیہ اور عاطف ہنسنے لگے۔

اسی دوران ساتھ والے کمرے سے تیز آواز میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ

شاہین اور عمران تھے۔ عاطف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لو جی پھر چونچ لڑ گئی۔ ٹیلی فون پر بھی یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔"

عمران کی آواز سنائی دی۔ "اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ کب کر رہی ہو شادی؟"

وہ جل کر بولی۔ "میں شادی کر نہیں رہی ہوں...... کر چکی ہوں۔"

"کس سے؟" وہ خوش ہو کر بولا۔

"ایک ایسے شخص سے جو تم سے زیادہ عقل مند اور تم سے کہیں زیادہ اسمارٹ ہے۔"

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "مجھ سے زیادہ اسمارٹ تو ٹام کروز ہی ہو سکتا ہے...... اور زیادہ عقل مند بل گیٹ کے سوا اور کون ہوگا۔"

"بس یہی سمجھ لو۔" شاہین پھنکاری۔

"تو...... اس کا مطلب ہے کہ تم نے بیک وقت دو افراد سے شادی کی ہے؟" عمران کی آواز میں حیرت تھی۔

اس نے غالباً کوئی شے اٹھا کر عمران کو ماری۔ "یہ رواج تمہارے خاندان میں ہوگا، ہمارے میں نہیں۔"

"گویا...... تمہارا کوئی خاندان بھی ہے؟" عمران نے مزید حیرت ظاہر کی۔

اٹھا پٹخ کی آوازیں آئیں۔ اس مرتبہ غالباً شاہین، عمران پر چڑھ دوڑی تھی۔ عمران کراہا۔

"دیکھو، اب تم ثابت کر رہی ہو کہ تم واقعی خاندان کے بغیر ہو۔"

کوئی برتن ٹوٹا۔ دھینگا مشتی کی دبی دبی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ مداخلت ضروری ہو گئی تھی۔ میں کھنکھارتا ہوا کمرے میں پہنچا تو عمران قالین پر چت پڑا تھا۔ شاہین اس پر سوار تھی۔ اس کا ایک گھٹنا عمران کی گردن پر تھا اور دائیں مٹھی میں عمران کے سر کے بال تھے۔

میرے قدموں کی آواز سن کر وہ دونوں ٹھٹک کر اُٹھ بیٹھے۔ شاہین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ عمران کھسیانے انداز میں بولا۔ "میں اسے بتا رہا تھا کہ اگر عورت گھر میں اکیلی ہو اور کوئی غیر مرد تمہاری طرح اچانک کمرے میں گھس آئے تو کس طرح اپنا دفاع کرتے ہیں۔"

شاہین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ شاہین کے بجائے تمہیں سیلف ڈیفنس کی تربیت کی ضرورت ہے۔"

وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے بولا۔ "ویسے یار! زور بڑا ہے اس میں۔ ایک دم ببر شیرنی ہے۔"

"تم نے اسے جان بوجھ کر اس طرح کا کر دیا ہے۔ ورنہ کافی معقول لڑکی ہے۔ ہمدرد اور محبت کرنے والی۔"

وہ آواز دبا کر بولا۔ "کسی کو پتا تو نہیں چلا کیا ہوا ہے؟"

"نہیں نہیں...... بس اتنا معلوم ہوا کہ اس نے کوئی شے تمہارے سر پر مار کر توڑی ہے اور پھر تمہیں نیچے گرا کر بڑی عزت سے تمہاری شان میں دو تین قصیدے پڑھے ہیں۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "بس یار! میں تو ریما، نرگس اور اس شاہین کے درمیان یوں پس گیا ہوں جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گندم۔"

"ریما، نرگس اور شاہین...... یہ تو تین پاٹ ہو گئے نا۔"

"چھوڑو جگر! جب بندہ اس بری طرح پس رہا ہو تو پاٹوں کا حساب کسے یاد رہتا ہے۔" وہ مغموم شکل بنا کر بولا۔

اسی دوران میں عاطف اور فرح وغیرہ بھی کھانستے ہوئے اندر آ گئے اور ہماری گفتگو یہاں ختم ہو گئی۔

○......❖......○

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں